

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو

حصہ دوم

مکتبہ جامعہ دہلی

ایجنٹ برائے پنجاب: مکتبہ پنجاب لاہور

قیمت حصہ دوم ۶؏

فہرست مضامین

باب		صفحہ
(۳۸)	گول میز کانفرنس	۹
(۳۹)	صوبہ متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں	۲۷
(۴۰)	عارضی صلح کا خاتمہ	۴۰
(۴۱)	گرفتاریاں۔ تعزیری قوانین اور ضبطیاں	۶۶
(۴۲)	بازاری پروپگنڈا	۷۴
(۴۳)	بریلی اور دہرہ دون کے جیلوں میں	۹۴
(۴۴)	ایک قیدی کی نفسی کیفیتیں	۱۱۱
(۴۵)	قیدخانے کے جانور	۱۲۳
(۴۶)	جدوجہد	۱۳۶
(۴۷)	مذہب کیا ہے؟	۱۵۳
(۴۸)	برطانوی حکومت کی دورخی پالیسی	۱۷۳
(۴۹)	طویل سزا کا خاتمہ	۱۹۴
(۵۰)	گاندھی جی سے ملاقات	۲۰۱
(۵۱)	لبرل ذہنیت	۲۱۷
(۵۲)	درجہ نوآبادی اور کامل آزادی	۲۳۱
(۵۳)	پرانا اور نیا ہندوستان	۲۴۹
(۵۴)	انگریزی حکومت کی کارگذاری	۲۶۱

(۵۵)	سول میرج اور رسم الخط کا مسئلہ	۲۹۲
(۵۶)	فرقہ پرستی اور رجعت پسندی	۳۰۷
(۵۷)	تعطل	۳۳۸
(۵۸)	زلزلہ	۳۵۳
(۵۹)	علی پور جیل	۳۷۰
(۶۰)	مشرقی اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ	۳۷۹
(۶۱)	اُداسی	۳۸۸
(۶۲)	متضاد باتیں	۴۰۵
(۶۳)	خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا	۴۴۵
(۶۴)	پھر دہرہ جیل میں	۴۷۲
(۶۵)	گیارہ دن	۴۸۴
(۶۶)	پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر	۴۹۱
(۶۷)	حال کے چند واقعات	۵۰۰
(۶۸)	خاتمہ	۵۳۲
	تتمہ	۵۳۷
	ضمیمہ الف	۵۳۹
	ضمیمہ ب	۵۴۲
	ضمیمہ ج	۵۴۷

فہرست تصاویر

۱ - جواہر لال نہرو (عمل ادیا با)	سرورق
۲ - جواہر لال نہرو - تصدق احمد خاں شیروانی - کملا نہرو	۵۰
۳ - سروپ رانی نہرو	۹۲
۴ - اندرا پریہ درشنی	۳۰۵
۵ - کملا نہرو - جواہر لال نہرو - اندرا نہرو	۴۸۶

٦)

١٧)

١٨)

١٩)

٢٠)

٢١)

٢٢)

٢٣) ٣

٢٤)

٢٥)

٢٦)

٢٧)

٢٨)

گول میز کانفرنس

حال ہی میں ایک انگریز اخبار نویس نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بھی، اور لندن میں گول میز کانفرنس کے وقت بھی، انھیں گاندھی جی سے خوب ملنے جُلنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں یہ لکھتے ہیں: "ملتان جہاز پر جو لیڈر سفر کر رہے تھے وہ سب جانتے تھے کہ خود کانگریس کی مجلس عاملہ میں مسٹر گاندھی کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہ جانتے تھے کہ جب وقت آئے گا تو کانگریس مسٹر گاندھی کو نکال باہر کریگی۔ لیکن کانگریس نے انھیں نکالا تو ساتھ ہی غالباً اپنے آدھے ممبروں کو بھی نکالنا ہوگا۔ اور یہی وہ نصف تھا جسے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر اپنے لبرل مسلک کا ساتھی بنانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ اس بات کو کبھی نہیں چھپاتے کہ مسٹر گاندھی (خود ان کے الفاظ میں) ذرا اُلجھے دماغ کے آدمی ہیں۔ لیکن جو اُلجھی کھوپڑی والا لیڈر اپنے ساتھ کوئی دس لاکھ اُلجھی کھوپڑی کے پیرو بھی لا سکے اس کو اپنی طرف ملانے کی کوشش تو بہر حال کرنے کی چیز ہے[1]"۔

---

[1] گلورنی بولٹن کی کتاب *The tragedy of Gandhi* سے مقتبس۔ میں نے یہ اقتباس اس کتاب کی ایک تنقید سے لیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس اقتباس کو پیش کرکے میں مصنف کے ساتھ اور ان اصحاب کے ساتھ جن کا نام اس میں آیا ہے کوئی ناانصافی نہ کرتا ہوں گا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس اقتباس سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کے خیالات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے یا نہیں یا گول میز کانفرنس کے ان اراکین کے خیالات کی جو ۱۹۳۱ء میں لندن تشریف لیے جا رہے تھے۔ البتہ مجھے اس پر حیرت ضرور ہے کہ کوئی شخص بھی اخبار نویس ہو کہ "لیڈر" جو ہندوستانی سیاست سے ذرا بھی واقف

(صفحہ ۹ کا بقیہ نوٹ) یہ لکھ چکنے کے بعد میں نے اصل کتاب بھی پڑھ لی۔ بہت سی باتیں جو مسٹر بولٹن نے لکھی ہیں اور بہت سے نتیجے جو انھوں نے نکالے ہیں، میری رائے میں نادرست ہیں بیانِ واقعات میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں، خصوصاً اس سلسلہ میں کہ دہلی کے معاہدہ کی بات چیت کے زمانہ میں، اور اس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا ان کا ایک عجیب سا مفروضہ یہ بھی ہے کہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی صدارت اور یوں اس کی قیادت جو ملی تو وہ گاندھی جی کے مدمقابل کی حیثیت سے! حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں گاندھی جی کی حیثیت کانگریس میں اور ظاہر ہے کہ ملک میں بھی اس سے کہیں بلند رہی ہے جتنی کانگریس کے کسی صدر کی ہوتی ممکن ہے۔ وہ صدر گزرے ہیں اور ان کا کہنا ہمیشہ مانا گیا ہے۔ بارہا انھوں نے خود صدارت کرنے سے انکار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے کہ ان کا کوئی دوسرا ساتھی یا چیلا صدر ہو جائے۔ میں جو کانگریس کا صدر ہوا تو تمامتر ان کی ہی وجہ سے دراصل انتخاب گاندھی جی کا ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور میرے انتخاب پر لوگوں کو مجبور کیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کا انتخاب ذرا خلاف معمول تھا۔ اس لیے کہ ہم لوگ اس وقت قید سے چھوٹے تھے اور کانگریس کمیٹیاں اس وقت تک خلاف قانون جماعتیں تھیں اور معمولی طور پر کام نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وجہ سے مجلس عاملہ نے کراچی کانگریس کے صدر کا انتخاب اپنے ذمہ لے لیا۔ ساری مجلس نے جس میں ولبھ بھائی پٹیل بھی تھے (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہو وہ اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ میں تو اسے پڑھ کر ششدر رہ گیا۔ پہلے کبھی اس کا ذکر بھی میں نے نہ سنا تھا۔ مگر اس لاعلمی کا سمجھنا تو یوں مشکل نہیں کہ اس وقت کے بعد سے میں زیادہ تر قید میں رہا ہوں۔

یہ سازش کرنے والے آخر تھے کون اور ان کا ارادہ کیا تھا؟ کبھی کبھی یہ بھی

گاندھی جی سے التجا کی کہ وہ صدارت قبول فرمالیں۔ کہ واقعی طور پر تو وہ سردار تھے ہی، اس مشکل کے سال میں نام کے لحاظ سے بھی کانگریس کے سردار وہی ہوں۔ لیکن وہ نہ مانے، اور اصرار کیا کہ ولبھ بھائی پٹیل صدارت قبول کریں۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقع پر کسی نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ آپ خود ہمیشہ مسولینی کی طرح رہنما رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو عارضی طور پر بادشاہ اور دکھاوے کا سردار بناتے رہتے ہیں!

یوں تو مسٹر بولٹن کی بُہتیری اور غلط فہمیوں سے اس حاشیہ میں بحث کرنی ممکن نہیں لیکن ایک ذرا شخصی سا معاملہ ہے اس کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ میرے والد صاحب کی سیاسی زندگی میں جو تغیر ہوا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک یوروپین کلب میں ان کا انتخاب نہ ہو سکا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ سیاست ہی میں انتہا پسند نہیں ہو گئے تھے بلکہ انگریزوں کی صحبت سے بھی پرہیز کرنے لگے تھے۔ یہ قصہ بارہا بیان ہو چکا ہے، مگر ہے سراسر غلط۔ اصلی واقعات کی چنداں اہمیت نہیں لیکن میں یہاں ان کا ذکر اس لیے کیے دیتا ہوں کہ بات صاف ہو جائے۔ بیرسٹری کے ابتدائی زمانہ میں سر جان اج، جو اس وقت الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے والد صاحب کو بہت چاہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ سر جان نے والد سے کہا کہ الہ آباد (یوروپین) کلب میں شریک ہو جاؤ، میں خود تمہارا نام رکنیت کے لیے پیش کر دوں گا۔ والد صاحب نے ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ (بقیہ صفحہ دیگر)

کہا گیا ہے کہ صدر ولبھ بھائی پٹیل اور میں مجلس عاملہ کے انتہاپسندوں میں تھے۔ اسلیے
میں سمجھتا ہوں کہ ہو نہ ہو ضرور ہم ہی کو اس سازش کے سرغنوں میں گنا گیا ہوگا حالانکہ
شاید ہی سارے ہندوستان بھر میں گاندھی جی کا کوئی اور ساتھی ولبھ بھائی جیسا وفادار
ہو۔ ولبھ بھائی اپنے کام میں ضرور مضبوط اور نہ دبنے والے آدمی ہیں۔ گمر نخعی الوبر

لیکن یہ جتلا دیا کہ اس میں لازمی طور پر بڑی دقت ہوگی۔ بہت سے انگریز ان کے ہندوستانی
ہونے کی وجہ سے اعتراض کریں گے اور ممکن ہے مخالفت میں رائے دیں فوج کا کوئی بھی
چھوٹا موٹا افسر رائے دینے کے وقت ان کی مخالفت کرسکتا ہے۔ ان حالات میں بہتر یہی ہوگا
کہ وہ اپنا نام انتخاب کے لیے پیش نہ کرائیں۔ سرجان نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ والد کے نام کی
تائید الہ آباد کے فوجی حلقہ کے برگیڈیر جنرل سے کرائیں گے۔ مگر آخر میں یہ معاملہ یوں ہی
چھوڑ دیا گیا اور نام اس لیے پیش نہیں ہوا کہ والد نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سلسلہ میں
اپنی کوئی ہتک کرانے کو تیار نہیں ہوں۔ اس واقعہ سے ان کے دل میں انگریزوں کی طرف
سے تلخی تو کیا پیدا ہوتی۔ ہوا یہ کہ سرجان سے ان کے تعلقات اور گہرے ہوگئے اور اس کے
بعد کے زمانہ ہی میں اکثر انگریزوں سے ان کی دوستی ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ کوئی سنہ ۹
کے قریب کی بات تھی اور وہ انتہاپسند سیاسی اور تارک موالات ہوئے کوئی چوتھائی صدی
گزرنے کے بعد جاکر۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تبدیلی یکایک پیدا نہیں ہوئی تھی البتہ پنجاب کے
مارشل لا نے اس میں ذرا جلدی کرادی اور ٹھیک وقت پر گاندھی جی کے اثر نے بھی فرق پیدا
کیا۔ مگر پھر بھی ان کا یہ ارادہ کبھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ البتہ
جہاں انگریز زیادہ تر سرکاری عہدہ دار ہی ہوں وہاں ترک موالات اور سول نافرمانی
سے لازمی طور پر ان تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔

وہ گاندھی جی کے اور ان کے خیالات اور طریقہ کار کے دلدادہ بھی ہیں۔ میں اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے بھی گاندھی جی کے خیالات کو انھیں کی طرح قبول کیا ہے لیکن گاندھی جی کے ساتھ نہایت قریبی طور پر مل جل کر کام کرنے کا شرف مجھے بھی حاصل رہا ہے اور ان کے خلاف سازش کرنے کا خیال بھی میرے لیے ہر حال میں ناممکن اور لغو ہے۔ اور میں کیا ساری مجلس عاملہ کا یہی حال ہے۔ یہ مجلس عملاً انھیں کی بنائی ہوئی ہے انھیں نے چند ساتھیوں کے مشورہ سے اسے نامزد کیا تھا، انتخاب تو بس ایک ضابطہ کی کارروائی تھی۔ اس مجلس کا بڑا اور با اثر حصہ تو ان اراکین پر مشتمل تھا جو اس میں برسوں سے کام کر رہے تھے۔ اور اب مستقل سے ممبر سمجھے جانے لگے تھے۔ بے شک ان میں بھی سیاسی اختلافات تھے، نقطہ نظر کے اختلاف تھے، طبیعتوں کے اختلاف تھے، لیکن انھوں نے برسوں ایک ساتھ کام کیا تھا، مل کر بوجھ اٹھائے تھے، مل کر خطروں کو انگیز کیا تھا اور ان باتوں نے انھیں باہم جوڑ سا دیا تھا۔ ان میں دوستی، رفاقت، اور ایک دوسرے کی عزت کے رشتے پیدا ہو گئے تھے۔ اور اب یہ مجلس مختلف الخیال لوگوں کا محض ایک مجموعہ نہ تھی بلکہ ایک نامی وحدت بن گئی تھی۔ اور یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کے خلاف سازش کرے گا۔ گاندھی جی اس مجلس پر پوری طرح حاوی تھے اور ہر شخص ہدایت کے لیے بس انھیں کی طرف دیکھتا تھا یہ صورت حال کئی سال سے یونہی تھی اور ۱۹۳۰ء کی عظیم الشان کامیابی کے بعد ۱۹۳۱ء میں تو یہ بات اور بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اچھا، "گاندھی جی کو نکال باہر کرنے" کی کوشش سے مجلس عاملہ کے ان انتہا پسندوں کی غرض کیا ہو سکتی تھی؟ شاید یہ سمجھا جاتا ہو کہ گاندھی جی چونکہ سمجھوتہ کرنے والے آدمی ہیں اس لیے یہ لوگ انھیں راہ میں حائل جانتے ہوں گے۔ لیکن گاندھی جی کے بغیر یہ تحریک ہی کہاں ہوتی، سول نافرمانی کا پتہ کہاں ہوتا، اور ستیاگرہ کا

نشان کہاں ملتا؟ وہ تو خود اس زندہ تحریک کا ایک جزو تھے۔ نہیں، سچ تو یہ ہے کہ تحریک ہی وہ تھے۔ جہاں تک اس تحریک کا تعلق تھا سب کچھ ان پر منحصر تھا۔ یہ ضرور ہے کہ قومی تحریک ان کی آفریدہ نہیں تھی، نہ وہ کسی ایک شخص پر منحصر ہو سکتی ہے۔ اس کی جڑیں تو اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ مگر تحریک کی یہ خاص شکل جس کا علم سول نافرمانی ہی، خصوصیت کے ساتھ ان سے وابستہ تھی۔ ان سے جدا ہونے کے معنی یہ تھے کہ اس تحریک کی ساری بساط ہی تہ کر دی جائے اور نئے سرے سے نئی بنیادوں پر کوئی نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ تجویز کسی وقت بھی کی جائے تو خاصی دشوار ہے، ۱۹۳۱ء میں تو اس کا خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا۔

یہ خیال کرکے بھی ہنسی آتی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہم میں سے چند ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کو کانگریس سے نکال باہر کرنے کی سازش کر رہے تھے! بھلا ہمیں اس سازش کی ضرورت ہی کیا تھی جب ایک ذرا سا اشارہ ہی کافی ہوتا؟۔ گاندھی جی کی طرف سے جب بھی ذرا یہ ظاہر ہوا ہے کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں تو مجلس عاملہ اور سارے ملک میں تہلکہ سا مچ گیا ہے۔ وہ تو ہمارے جہاد آزادی کا ایسا جزو بن گئے ہیں کہ یہ خیال تک برداشت نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے الگ ہو جائیں گے۔ ہم تو انھیں لندن بھیجتے بھی جھجکتے تھے کہ ان کی غیر حاضری میں سارا بوجھ ہم پر آن پڑے گا اور اس کا خیال بھی ہمیں بھلا نہ لگتا تھا۔ ہم لوگ تو اپنے بوجھ کو ان کے کندھوں پر منتقل کر دینے کے ایسے عادی ہو گئے تھے۔ ہم میں سے بہتوں کیلئے مجلس عاملہ کے اندر اور اس کے باہر، گاندھی جی سے وابستگی کے رشتے کچھ ایسے تھے کہ ہم اسے ترجیح دیتے تھے کہ ان کے ساتھ رہکر ہار جائیں بہ نسبت اس کے کہ ان سے الگ ہو کر کوئی عارضی کامیابی حاصل کر لیں۔

اس بات کا فیصلہ کہ گاندھی جی الجھے دماغ کے آدمی ہیں یا نہیں ہم اپنے لبرل

دوستوں ہی پر چھوڑتے ہیں۔ بے شک یہ سچ ہے کہ ان کی سیاست کبھی کبھی بہت ہی فلسفیانہ اور حقائق سے دور ہو جاتی ہے اور اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر انھوں نے اپنے کو ایک نہایت ہی عملی آدمی ثابت کیا ہے، غیر معمولی ہمت اور جرأت کا آدمی اور ایسا آدمی کہ جو کچھ کہتا ہے اسے کر بھی دکھاتا ہے۔ پھر اگر الجھے ہوئے دماغ کے ایسے عملی نتائج نکل سکتے ہوں تو یہ الجھاؤ اس 'عمل سیاست' سے کیا برا ہے جو مطالعہ کے کمروں اور خواص کے حلقوں میں شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے لاکھوں پیرو بھی الجھے دماغ کے لوگ ہیں وہ نہ سیاست کو سمجھتے ہیں، نہ قانون دستوری سے آشنا ہیں، وہ سوچتے ہیں تو بس اپنی انسانی ضرورتوں کے اعتبار سے یعنی کھانے پینے، گھر در، کپڑے لتے، اور زمین کی اعتبار سے۔

مجھے ہمیشہ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ممتاز پردیسی اخبار نویس، جنھیں فطرت انسانی کے مشاہدہ کی خوب مشق ہوتی ہے، یہاں ہندوستان میں آکر کیوں غلطی کر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کہیں ان کے بچپن کا یہ اسٹے خیال تو نہیں کہ مشرق میں دنیا ہی نرالی ہے اسے معمولی معیاروں سے جانچا ہی نہیں جا سکتا۔ یا انگریزوں کے معاملہ میں کہیں یہ بات تو نہیں ہے کہ سامراج سے ان کی نظر میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے اور نظارہ کو مسخ کر دیتی ہے۔ کوئی بات ہو کیسی ہی بعید از قیاس، وہ اسے بلا تعجب کے یقین کر لیتے ہیں اس لیے کہ مشرق کے اسرارستان میں ہر چیز ممکن ہے۔ وہ کتابیں شائع کرتے ہیں جن میں نہایت اچھے تبصرے اور نہایت گہرے مشاہدے بھی ملتے ہیں لیکن بیچ بیچ میں ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں کہ بس حیرت ہو جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی یورپ جا رہے تھے تو میں نے لندن کے ایک اخبار میں اس کے پیرس کے نامہ نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ یہ مضمون ہندوستان کے متعلق تھا۔ اس میں نامہ نگار نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا جو

اس کے نزدیک ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کے زمانہ میں پیش آیا تھا، اس وقت جب شہزادہ ویلز ہندوستان آئے تھے۔ لکھا تھا کہ کسی مقام پر (غالباً دہلی میں) مہاتما گاندھی ایک مرتبہ بلا اطلاع شہزادے کے سامنے جا پہنچے، گھٹنوں پر گر پڑے، شہزادے کے پیر پکڑ لیے، دہاڑیں مار مار کر رونے لگے اور ان سے التجا کی کہ اس ناشاد ملک کو امن وسکون ارزانی فرمائیں! ہم میں سے کسی نے، خود غریب گاندھی جی نے، یہ قصہ نہ سُنا تھا میں نے ان نامہ نگار صاحب کو خط لکھا اور انھیں یہ بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ انھیں یہ قصہ ایک معتبر ذریعہ سے پہنچا تھا! مجھے جس بات پر تعجب ہوا وہ یہ کہ اس نامہ نگار نے ایسے قصہ کو باور کر لیا اور حقیقت دریافت کرنے کی ذرا کوشش نہ کی۔ حالانکہ قصہ بادی النظر میں ہی اس قدر بعید از قیاس ہے کہ کوئی شخص جو گاندھی جی کو، یا کانگریس کو، یا ہندوستان کو ذرا بھی جانتا ہو اسے یقین نہ کرتا۔ بدنصیبی سے بہت سے انگریز جو ہندوستان ہی میں عرصہ سے رہتے ہیں وہ بھی اس ملک کے متعلق یا کانگریس کے متعلق یا گاندھی جی کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ قصہ بالکل ہی ناقابل یقین اور مضحکہ خیز تھا جس کے مقابلہ میں بس اس فرضی واقعہ کی روداد پیش کی جا سکتی ہے جب کہ کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب یکایک مسولینی کے سامنے جا پہنچے، سر نیچے کیا اور ٹانگیں اوپر، اور سلام اور دعا کی جگہ لگے فضا میں اپنی دونوں ٹانگوں کو حرکت دینے!

حال ہی میں ایک اور اخبار میں ایک اطلاع شایع ہوئی جس میں ایک اور ہی قسم کا قصہ پیش کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ گاندھی جی کے پاس بے حساب رقمیں ہیں جن کا شمار لاکھوں پونڈ تک پہنچتا ہے۔ یہ رقمیں خفیہ طور پر دوستوں کے یہاں رکھی ہیں اور کانگریس کی نظر اس روپیہ پر ہے۔ اگر گاندھی جی کانگریس سے ہٹتے تو ڈر ہے کہ یہ خزانہ ہاتھ سے جائیگا۔ یہ افسانہ بھی سرتاپا لغو ہے، اس لئے کہ گاندھی جی کبھی

کسی قسم کا فنڈ اپنی تحویل میں نہیں رکھتے، نہ خود اپنے پاس نہ چھپاکر کسی دوسرے کے پاس جو کچھ جمع کرتے ہیں کسی پبلک ادارہ کے سپرد کردیتے ہیں حساب کتاب ٹھیک رکھنے کے باب میں ان کی جبلت بنیے کی ہے اور ان کی جمع کی ہوئی رقموں کے حسابات کی ہمیشہ باضابطہ جانچ ہوتی رہتی ہے۔

یہ افواہ غالباً اس مشہور ایک کروڑ روپیہ والے قصہ پر مبنی ہے جو کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں جمع کیے تھے۔ یہ رقم، جو یوں خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے مگر سارے ہندوستان پر پھیلائی جائے تو کچھ ایسی بڑی نہیں، قومی یونیورسٹیوں، مدرسوں کیلئے استعمال ہوئی اور دیہی صنعتوں خصوصاً کھدر کو فروغ دینے میں یا اچھوتوں کے کام اور دوسری تعمیری تجاویز کے سلسلہ میں۔ اس میں سے بہت تو پہلے سے مختلف کاموں کے لیے مخصوص تھی اور یہ فنڈ اب تک موجود ہیں اور ان مخصوص اغراض میں کام آرہے ہیں۔ باقی حصہ مقامی کمیٹیوں کے سپرد کردیا گیا تھا اور کانگریس کے تنظیمی اور سیاسی کام میں صرف ہوا۔ ترک موالات کی تحریک کے مصارف اس سے پہلے اور چند سال بعد تک کانگریس کا کام بھی اسی روپیہ سے چلا۔ گاندھی جی نے اور پبلک کے افلاس نے ہمیں یہ سکھا دیا ہے کہ اپنی سیاسی تحریک کو بہت ہی محدود وسائل سے چلائیں۔ ہمارے کام کا بڑا حصہ تو بلا معاوضہ رہا ہے، اور جب کبھی کوئی رقم بقدر معاوضہ دی گئی تو بس مشکل سے پیٹ بھرنے کے قابل۔ ہمارے بہترین کام کرنے والوں کو، یونیورسٹی کے فارغ التحصیل لوگوں کو جن کے ذمہ پورے خاندان کے مصارف بھی تھے، ہم نے اس سے کم دیا ہے جتنا کہ انگلستان میں ایک بے روزگار مزدور کو بطور الاؤنس دیا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی سیاسی یا مزدوروں کی تحریک بڑے پیمانہ پر کہیں بھی اس قدر کم خرچ میں چلی ہے جیسے کہ پچھلے ۱۵ برس میں کانگریس کی تحریک سال بہ سال کانگریس کے تمام حسابات کی باضابطہ علی الاعلان جانچ ہوتی ہے، ان کا

کوئی حصہ خفیہ نہیں رہا ہے سوائے سول نافرمانی کے زمانہ میں جب کہ کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا تھا۔

گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگریس کے تنہا نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے۔ بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوئی اور نمائندہ نہ بھیجا جائے۔ کچھ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اپنے بہترین آدمیوں کو اس کٹھن زمانہ میں ہندوستان ہی میں رکھنا چاہتے تھے، کہ اس زمانہ میں نہایت ہوشیاری سے ساری تحریک کو ہاتھ میں رکھنا تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے کہ گول میز کانفرنس کے باوجود اصل مرکز ثقل ہندوستان ہی میں ہے اور ہندوستان میں جو صورت حال پیدا ہوگی اس کا اثر لازمی طور پر لندن میں پڑے گا۔ ہم چاہتے تھے کہ ناموافق حالات کو پیدا ہونے سے روکیں اور اپنی تنظیم کو درست حالت میں برقرار رکھیں۔ لیکن صرف ایک نمائندہ بھیجنے کی اصل وجہ یہ نہ تھی۔ اگر ہم ضرورت سمجھتے اور رعایت جانتے تو ضرور اور نمائندے بھی بھیجتے مگر ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا۔

ہم گول میز کانفرنس میں کچھ اس لئے تو شرکت کر نہیں رہے تھے کہ جا کر دستور ملکی کی ضمنی تفصیلات سے متعلق وہ بحثیں چھیڑیں جو کبھی ختم ہی ہونے میں نہ آئیں۔ اس وقت ان تفصیلات میں ہمیں ذرا دلچسپی نہ تھی، ان پر تو غور اسی وقت ہو سکتا تھا کہ برطانوی حکومت سے بنیادی معاملات پر کوئی سمجھوتا ہو جاتا۔ اصل سوال یہ تھا کہ جمہوری ہند کو کتنی طاقت منتقل کرنی ہے۔ تفصیلات کو طے کرنے اور انھیں قلمبند کرنے کا کام تو کوئی بھی قانون داں بعد کو کر سکتا تھا۔ ان بنیادی امور میں کانگریس کا مسلک صاف اور سیدھا تھا اور اس میں بحث اور دلیل کی زیادہ گنجایش نہ تھی۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے لیے باوقار طریقہ یہی ہے کہ ہمارا بس ایک نمائندہ، اور وہ خود ہمارا قائد، جائے اور ہمارے مسلک کو پیش کر کے بتا دے کہ وہ کس قدر معقول ہے اور کس قدر

اٹل - اور ہو سکے تو اس مسلک کے لیئے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل کرے - کام مشکل تھا، یہ ہم خوب جانتے تھے : اور معاملات کی جو صورت اس وقت تھی اس میں مشکل ہی سے اس کے کرنے کا امکان تھا - مگر کیا کرتے، کوئی دوسری صورت بھی ہمارے سامنے نہ تھی - ہم اپنے مسلک کو، اپنے اصول کو، اپنے مطمح نظر کو تو چھوڑ نہیں سکتے تھے، ہم ان کے پابند تھے اور ان پر پکا یقین رکھتے تھے - اگر حسن اتفاق سے ان بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ کی صورت نکل آتی تو پھر باقی کام بہت سہل تھا بلکہ ہم میں یہ طے ہی ہو چکا تھا کہ اگر سمجھوتہ ہو گیا تو گاندھی جی فوراً مجلس عاملہ کے چند یا سب ارا کین کو لندن بلالیں گے تاکہ تفصیلات پر بات چیت میں سب شریک ہو سکیں ہمیں ہدایت تھی کہ ہم تیار رہیں اور ضرورت ہو تو ہوائی جہاز سے سفر کریں - یوں گویا بلاوے کے دس دن کے اندر ہم لوگ گاندھی جی کے پاس پہنچ سکتے تھے -

لیکن اگر بنیادی باتوں پر سمجھوتہ نہ ہو تو پھر مزید گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ کانگریس کو ضرورت ہوتی کہ گول میز کانفرنس میں اور نمائندے بھیجے - لہذا فیصلہ یہی ہوا کہ اکیلے گاندھی جی کو بھیجیں - مجلس عاملہ کے ایک اور رکن، یعنی مسز سروجنی نائیڈو، نے بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی، مگر کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں - انھیں ہندوستانی عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی اور مجلس عاملہ نے انھیں جانے کی اجازت دیدی تھی -

مگر برطانوی حکومت اس معاملہ میں ہماری خواہشوں کو پورا کرنا نہیں چاہتی تھی - ان کی تدبیر یہ تھی کہ بنیادی امور پر غور و بحث کو برابر ٹالیں تاکہ کانفرنس کم و بیش ضمنی اور غیر اہم باتوں پر بحث کر کر کے تھک جائے - کہیں کوئی اہم معاملہ سامنے آ ہی گیا تو حکومت رکی رکی رہی، اپنے کو کسی بات پر قطعی طور سے پابند نہ کیا، اور بس یہی وعدہ کر دیا کہ مزید غور و خوض کرکے بعد کو اپنی رائے ظاہر کرے گی -

ان کا ترُپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انھوں نے خوب کھیلا۔ ساری کانفرنس پر ایک یہی مسئلہ حاوی رہا۔

کانفرنس کے ہندوستانی ممبروں میں سے بڑی اکثریت، زیادہ تر ارادۃً کچھ بے ارادہ، اس سرکاری چال کا ساتھ دے رہی تھی۔ اور یہ مجمع تھا بھی نرالا ان میں کون تھا جو اپنی ذات کے سوا اور کسی کا نمائندہ ہو۔ بعض ان میں سے ضرور قابل اور معزز لوگ تھے، اور بہت سے ایسے تھے جن کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے یہ لوگ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی دشمن عناصر کے نمائندے تھے، اور ایسے رجعت پسند اور تغیر دشمن کہ ہمارے ہندوستانی لبرل تک، جو یہاں اس درجہ محتاط اور معتدل لوگ سمجھے جاتے ہیں، وہاں ان کے مقابلہ میں ترقی خواہ کی حیثیت سے چمکتے رہے! یہ لوگ ہمارے ملک کے ان اہل غرض گروہوں کی نمائندگی کر رہے تھے جن کا مفاد برطانوی سامراج سے وابستہ ہے اور اپنی غرضوں کی تکمیل اور تحفظ کے لیے یہ اسی سامراج کا منہ تکتے ہیں۔ سب سے ممتاز نمائندگی مختلف 'اقلیتوں' اور 'اکثریتوں' کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق تھی، ان میں اونچے طبقہ کے کچھ لوگ تھے جو کسی کی بات نہیں مانتے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ آپس میں بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاسی لحاظ سے یہ سب کٹر ترقی دشمن تھے اور ان کا مقصد بس یہ تھا کہ کچھ فرقہ داری فائدہ حاصل کر لیں، چاہے اس میں ملک کی سیاسی ترقی کو یکسر ہاتھ سے دینا ہی کیوں نہ پڑے۔ چنانچہ انھوں نے صاف اعلان ہی کر دیا تھا کہ کسی ایسی کارروائی پر جس سے ملک کو کچھ اور سیاسی آزادی ملے یہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ان کے فرقہ وارانہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں۔ کیسا نرالا نظارہ تھا! اور کیسی تکلیف دہ وضاحت سے یہ بات روشن ہوتی تھی

کہ ایک محکوم قوم کس قدر نیچے جا سکتی ہے اور کس طرح اسے سامراجی بساط کا مہرا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ راجوں مہاراجوں، لاٹ صاحبوں، سروں اور بالقابہم کا یہ انبوہ ہندوستانی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اراکین کو برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا اور اپنے نقطۂ نظر سے واقعی خوب انتخاب کیا تھا۔ یہ سب صحیح، مگر پھر بھی اس بات سے کہ برطانوی حکام ہمیں یوں برت سکتے اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں، ہماری قوم کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ اور پتہ چلتا تھا کہ ہمیں کس آسانی سے بہکایا جا سکتا ہے اور ایک سے دوسرے کی کوششوں کا کیسے کاٹ کرایا جا سکتا ہے۔ ہمارے اونچے طبقہ کے لوگ ابھی تک سامراجی حکمرانوں کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انھیں کا کام کرتے ہیں۔ کیا انھیں اس کی حقیقت نہیں دکھائی دیتی؟ یا یہ بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر اس لیے اسے قبول کرتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت اور آزادی کے قیام سے انھیں ڈر لگتا ہے۔؟

بہت ہی ٹھیک بات تھی کہ اغراض کے اس ہجوم میں، سامراجی، منصب داری مالیاتی، صنعتی، مذہبی، فرقہ داری اغراض کے اس جمگھٹ میں، برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصہ میں آئی تھی۔ اس لیے کہ اغراض کچھ نہ کچھ سب ہی ان کی ذات میں یکجا جمع ہیں ایک نسل سے زیادہ عرصہ سے یہ برطانوی سامراج اور برطانوی حکمراں طبقہ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں، رہتے سہتے بھی زیادہ تر انگلستان ہی میں ہیں۔ یہ ہمارے حکمرانوں کے مفاد اور ان کے نقطہ نظر کو واقعی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اگر گول میز کانفرنس میں سامراجی انگلستان کی طرف سے یہ آتے تو اس کے نہایت ہی قابل نمائندہ ثابت ہوتے۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ ہندوستان کی نمائندگی فرما رہے تھے۔!

کانفرنس میں ہمارا مقابل پلہ بہت بھاری تھا، اور ہمیں اس سے کوئی زیادہ توقع بھی نہ تھی۔ پھر بھی اس کی کارروائی کو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور گھن آتی تھی۔ ہم قومی اور معاشی مسائل کی بھی سطح کو کھرچنے کی لغو اور جھوٹ موٹ کی کوششوں کو دیکھتے تھے، معاہدوں اور سازشوں اور چالوں کو دیکھتے تھے، برطانوی کنزرویٹو پارٹی کے ترقی دشمن حصہ سے اپنے بعض اہل وطن کا سازباز دیکھتے تھے، چھوٹے چھوٹے معاملات پر لامتناہی بک بک سنتے تھے، دیکھتے تھے کہ اصلی معاملات کو کیسے جان بوجھ کر ٹالا جا رہا ہے اور ہمارے ہی آدمی برابر کس طرح اہل غرض اور خصوصاً برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، آپس کی جھک جھک دیکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ جشن اور دعوتیں اور باہمی مدح وثنا کا طوفان! شروع سے آخر تک خدمتوں کی تلاش تھی، بڑی ہوں کہ چھوٹی، ہندوؤں کے لیے خدمتیں اور نشستیں، مسلمانوں کے لیے خدمتیں ہوں اور نشستیں، سکھوں کے لیے بھی ہوں، اینگلو انڈین جماعت کے لیے بھی اور یورپین گروہ کے لیے بھی۔ مگر ہوں خدمتیں سب اعلیٰ طبقہ کے لیے بیچارے عوام کو ان میں ذرا دخل نہ ہو۔ ابن الوقتی کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شکار کی گھات میں تھے، بس یہی فکر تھی کہ نئے دستور سیاسی میں کچھ لے مریں۔ خود آزادی کے تصور نے بڑے پیمانہ پر خدمت طلبی کی شکل اختیار کر لی تھی، جیسے Indianisation یا 'ہندیانا' کہتے تھے، یعنی فوج میں ہندوستانیوں کو زیادہ خدمتیں ملیں، سول سروس میں بھی زیادہ ملیں، وغیرہ وغیرہ۔ خود مختاری حقیقی آزادی، جمہوری ہند کو طاقت اور اختیار کی منتقلی، یا ہندوستانی قوم کے کسی اہم اور ضروری معاشی مسئلہ کے حل کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ کیا اسی کے لیے ہندوستان نے یوں مردانہ وار جدوجہد کی تھی؟ اور کیا ایثار و قربانی کی اس لطیف فضا کو کانفرنس کی کثیف ہوا سے بدلنا ضروری تھا؟

اُس سنہرے اور بھرے ہوئے ہال میں گاندھی جی بیٹھتے تھے، یکہ و تنہا ان کا لباس، یا بے لباسی، انھیں اوروں سے ممتاز کرتی تھی مگر ان میں اور ان کے خوش لباس ہم نشینوں میں افکار اور نقطہ نظر کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا۔ اس کانفرنس میں ان کی حیثیت بڑی ہی مشکل کی تھی۔ اور ہم یہاں دور سے بیٹھے حیرت کرتے تھے کہ یہ اسے کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ حیرت انگیز صبر کے ساتھ اپنا کام کئے گئے اور پیہم کوشش کرتے رہے کہ سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا ہو انھوں نے ایک خاص بات کی جس نے ایک مرتبہ یہ راز فاش کر دیا کہ فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔ کانفرنس کے مسلمان نمائندوں نے جو فرقہ دارانہ مطالبات پیش کئے تھے گاندھی جی ان میں سے بہتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور ان کے مسلمان قوم پرور ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ان مطالبات میں سے بعض آزادی اور جمہوریت کی راہ میں حائل ہوں گے۔ پھر بھی انھوں نے کہہ دیا کہ میں بلا پوچھے گچھے اور بے دلیل و بحث ان سب مطالبوں کو مان لونگا اگر مسلمان نمائندے سیاسی مطالبہ یعنی خود مختاری کے مطالبہ میں میرے ساتھ اور کانگریس کے ساتھ مل جائیں۔

یہ بات انھوں نے بالکل شخصی طور پر کہی تھی اس لیے کہ وہ اس وقت تو کانگریس کو اس کا پابند نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں کانگریس کو اس کے تسلیم کرنے پر آمادہ کرونگا اور کوئی شخص جو کانگریس میں ان کی حیثیت کو جانتا ہو شبہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کانگریس سے اس بات کو منوانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور سچ بھی ہے، آغا خاں کو آزادی ہند کی حمایت میں کمربستہ تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ غرض اس سے ظاہر ہو گیا کہ چاہے فرقہ دارانہ مسائل ہی کانفرنس پر چھائے

ہوئے معلوم ہوں مگر اصل دقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کرتی تھی۔ کانفرنس کے اراکین کو نہایت احتیاط سے نامزد کر کے برطانوی حکومت نے یہ سارے ترقی دشمن عناصر ایک جگہ جمع کر دیئے تھے۔ اور ضابطہ کار روائی چونکہ خود ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے اس فرقہ وارانہ مسئلہ کو کانفرنس کا اہم مسئلہ بنا دیا تھا اور ایسا مسئلہ کہ جس پر وہ لوگ جو وہاں جمع تھے کبھی متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

برطانوی حکومت کو اپنی اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ اس کے پاس اپنی سلطنت کے قایم رکھنے کے لیئے صرف قوت ہی نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ تک سامراجی روایات کے برقرار رکھنے کے لیے ابھی کافی چالاکی اور تدبر بھی باقی ہے۔ ہندوستانی قوم ناکام ہوئی، ہرچند کہ گول میز کانفرنس نہ ان کی نمائندہ تھی نہ اس سے ان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ مگر قوم ناکام ہوئی اس لیے کہ اپنی کوشش کے مقصود کو متعین کرنے کے لیے جس ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہ تھا اس لیے انہیں بہکا کر غلط راستہ پر ڈال دینا آسان تھا۔ قوم ناکام ہوئی اس لیے کہ اس نے اپنے میں اتنی قوت نہیں پائی کہ جو اہل غرض اس کی ترقی میں حائل ہیں انہیں راہ سے ہٹا پھینکے۔ وہ ناکام ہوئی اس لیے کہ اس میں غلط مذہبیت کی زیادتی ہے اور اس میں فرقہ وارانہ جذبات کو نہایت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ قوم ناکام ہوئی اس لیے کہ وہ ابھی اتنی آگے نہ بڑھی تھی اور ابھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ کامیاب ہوتی۔

خود اس گول میز کانفرنس میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی سوال نہ تھا اس سے ایسی زیادہ امید ہی کسے تھی۔ مگر پھر بھی اس سے ایک فرق ضرور پیدا ہوا۔ اس سے پہلے جو کانفرنس ہوئی تھی، اپنی قسم کی پہلی کانفرنس، اس کی طرف

نہ ہندستان میں زیادہ توجہ کی گئی نہ اور کہیں۔ اس لیے کہ اس وقت سب کا دھیان سول نافرمانی کی تحریک میں لگا تھا۔ برطانوی حکومت کے نامزد کیے ہوئے لوگ جب ۱۹۳۱ء کی کانفرنس کو جا رہے تھے تو کالی جھنڈیوں کے جلوسوں اور مذمت کی آوازوں کے ساتھ انھیں رخصت کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں بات ہی کچھ اور تھی اور یہ فرق اس لیے تھا کہ اس مرتبہ گاندھی جی کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے، ایک قائد کی حیثیت سے جن کی پیروی لاکھوں آدمی کر رہے تھے۔ اس وجہ سے کانفرنس کا رتبہ بڑھا اور ہندوستان کے لوگوں کو اس کی کارروائی سے بہت زیادہ دلچسپی ہو گئی۔ اس کی ناکامی، چاہے اس کا سبب کچھ ہی ہو، ہندوستان کے مخالف پڑتی تھی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ برطانوی حکومت کو گاندھی جی کی شرکت پر اتنا اصرار کیوں تھا۔

کانفرنس خود تو، اپنے سارے ساز باز، ابن الوقتی اور بے سود بے راہ روی کے باوجود، ہندوستان کے لیے ناکامی نہ تھی۔ یہ تو بنائی ہی اس طرح گئی تھی کہ ناکام ہو اور اس کی ناکامی کی ذمہ داری ہندوستانی قوم پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہاں اسے یہ کامیابی ضرور ہوئی کہ اس نے ہندوستان کے اصل مسائل کی طرف سے دنیا کی توجہ ہٹا دی، اور خود ہندوستان کے اندر اس سے مایوسی ہراس، اور ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ اس سے ترقی دشمن قوتوں کو ایک سہارا ملا اور وہ اس قابل ہوئیں کہ پھر ذرا سر اٹھائیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو کامیابی یا ناکامی تو ہندوستان کے واقعات سے حاصل ہو سکتی تھی۔ دور دراز لندن کے ساز باز سے قومی تحریک کچھ پھولا تو سکتی نہ تھی۔ ہندوستانی قومی تحریک یہاں کے متوسط طبقے اور یہاں کے کسانوں کی ایک حقیقی اور فوری ضرورت ہے اور یہ اس کے ذریعہ اپنے مسائل

کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ اس لیے یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہو کر اپنا مقصد پورا کر دے اور اس کی جگہ کوئی دوسری ایسی تحریک لے لے جو قوم کو ترقی اور آزادی کی شاہراہ پر اور آگے لے جا سکے، یا پھر اسے کچھ دنوں کے لیے دبایا جا سکتا ہے۔ یہ کشمکش ہندوستان میں فوراً ہی شروع ہونے کو تھی اور اس کا نتیجہ عارضی طور پر ہماری شکست ہونے کو تھا۔ مگر دوسری گول میز کانفرنس کا اس کشمکش کے نتیجہ پر چنداں اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے ہمارے ناموافق ایک فضا پیدا کر دی۔

(۳۹)

صوبجات متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں

کانگریس کے جنرل سکرٹری اور مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے مجھے عام ہندوستانی سیاست سے تعلق تھا۔ کبھی کبھی دورے بھی کرنے پڑتے تھے، مگر جہاں تک بن پڑتا میں ان سے بچتا تھا۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو مجلس عاملہ کے جلسے بھی بڑے لمبے لمبے ہونے لگے، اور آخر میں تو باضابطہ دو دو ہفتے کے اجلاس کی نوبت آگئی۔ بات یہ تھی کہ اب محض تنقیدی قرار دادیں منظور کرنے کا معاملہ تو تھا نہیں ایک وسیع اور متنوع نظام کے مختلف تعمیری کاموں کو چلانا تھا، اور روز ایسے مشکل مسائل سے سابقہ تھا جن پر یہ بات منحصر تھی کہ قومی پیمانہ پر کشمکش شروع ہو کہ نہ ہو۔

مگر میرا خاص کام صوبہ متحدہ میں تھا۔ یہاں کسانوں کی پریشانیوں نے کانگریس کی تمام تر توجہ کو جذب کر رکھا تھا۔ صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں کوئی ۱۵۰ سے اوپر رکن تھے اور ہر دوسرے تیسرے مہینہ ان کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی مجلس انتظامیہ میں کوئی ۱۵ رکن تھے، ان کے جلسے بھی جلد جلد ہوتے تھے اور کانگریس کا دیہی شعبہ انھیں کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں اس مجلس نے ایک خاص دیہی کمیٹی مقرر کردی تھی۔ اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس مجلس انتظامیہ اور اس دیہاتی کمیٹی سے برابر بہت سے زمیندار خاص طور پر وابستہ تھے، چنانچہ جو کچھ کیا گیا ان کی منظوری سے کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس سال ہماری صوبہ کانگریس کمیٹی کے صدر

(اور اس عہدہ کی وجہ سے اس کی مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے صدر) مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی تھے، جو ایک مشہور زمینداری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ہمارے جنرل سکریٹری، سری پرکاش جی، اور مجلس انتظامیہ کے بہت سے ممتاز رکن خود زمیندار تھے، یا زمینداری خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی ممبر متوسط طبقہ کے پیشہ ور لوگ تھے۔ صوبہ کی مجلس انتظامیہ میں ایک بھی اسامی یا غریب کسان نمائندہ نہ تھا۔ کسان ہماری ضلع کی کمیٹیوں میں ضرور ہوتے تھے، لیکن صوبہ کی مجلس انتظامیہ تک پہنچنے کے لئے جو کئی انتخابات ہوتے ہیں یہ غریب ان سے نکل کر آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔ چنانچہ ہماری مجلس انتظامیہ میں تمام تر متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا غلبہ تھا اور اس میں زمینداروں کی بھی خاصی آمیزش تھی۔ اس لئے کسی معنی میں بھی یہ انتہا پسند جماعت نہ تھی، اور کسانوں کے مسئلہ پر تو ہرگز نہیں۔

صوبہ میں میری حیثیت بس مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے رکن کی تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باہمی مشوروں اور مجلس کے دوسرے کاموں میں میں خوب حصہ لیتا تھا، مگر میرے کام کو رہنمائی کا کام کسی طرح نہیں کہہ سکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے صوبہ میں تو کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رہنمائی کی، اس لئے کہ ہم لوگوں نے عرصہ سے اپنے کو مل جل کر کام کرنے کا خوگر بنا لیا تھا، اور ہمارے یہاں زور ہمیشہ نظام پر دیا جاتا ہے فرد پر نہیں۔ سال بھر کے لئے جو صدر ہوتا وہ عارضی طور پر ہمارا سردار ہوتا اور ہماری نمائندگی کرتا تھا مگر خود اس کو بھی کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔

میں مقامی طور پر الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی کا رکن بھی تھا۔ دیہی مسئلہ کے نشوونما میں اس کمیٹی نے اپنے صدر پرشوتم داس ٹنڈن کی قیادت میں بڑا اہم

حصہ لیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اسی نے ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع کی تھی۔ وجہ یہ نہ تھی کہ الہ آباد کے ضلع میں زرعی کساد بازاری کا اثر کچھ اور جگہ سے زیادہ تھا یوں تو اودھ کے تعلقداری اضلاع کی حالت کہیں ابتر تھی۔ بات اصل یہ تھی کہ الہ آباد کا ضلع زیادہ منظم تھا اور یہاں سیاسی احساس زیادہ تھا اس لئے کہ الہ آباد شہر سیاسی کاموں کا مرکز تھا اور ممتاز کام کرنے والے اکثر آس پاس کے گانوؤں میں جاتے رہتے تھے۔

مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میں، دہلی کے سمجھوتہ کے فوراً ہی بعد، ہم نے دیہات میں چھپے ہوئے اعلان بھیجے اور اپنے کام کرنے والے بھی کہ کسانوں کو بتا دیں کہ سول نافرمانی اور سیاسی تحریک روک دی گئی ہے لہذا سیاسی وجہ سے لگان ادا کرنے میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہے، اور انھیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لگان ادا کر دیں ہاں، یہ ضرور ساتھ کہہ دیا تھا کہ چونکہ قیمتوں میں بے حساب کمی ہو گئی ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انھیں بہت کچھ چھوٹ ملنی چاہیئے، اور یہ تجویز کی تھی کہ ہم سب مل کر اس چھوٹ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ معمولی زمانہ میں بھی لگان کا بوجھ اکثر ناقابل برداشت ہوتا تھا لیکن اب تو قیمتوں کے یوں گرنے سے بالکل ناممکن ہو گیا تھا کہ پورا لگان یا اس کے کچھ بھی لگ بھگ ادا کیا جا سکے۔ ہم نے کسانوں کے نمائندوں سے ملکر مشورے کیے اور آزمائشی طور پر یہ تجویز کی کہ ۵۰ فیصدی اور اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ کی چھوٹ لگان میں دی جائے۔

ہماری کوشش تھی کہ کسانوں کے مسئلہ کو عام سول نافرمانی کے مسئلہ سے بالکل الگ کر دیں۔ کم سے کم سنہ ۱۹۳۱ء میں ہماری خواہش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو سیاست سے جدا کر کے خالص معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ یہ بات تھی مشکل، اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور پہلے بھی یہ دونوں پہلو باہم وابستہ رہ چکے تھے۔ ہم لوگ خود، بہ حیثیت کانگریس کے

بالکل سیاسی جماعت تھے - وقتی طور پر ہم ضرور یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسانوں کی یونین کا کام کریں (جس پر قابو غیر کسانوں بلکہ زمینداروں تک کا تھا) مگر ہم نہ اپنے سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے - اُدھر حکومت تھی کہ ہمارے سب کاموں کو سیاسی کام گردانتی تھی - آنے والی سول نافرمانی کا سایہ آگے آگے چلتا دکھائی دیتا تھا، اور اگر نوبت آتی تو اس میں کیا شک تھا کہ سیاست اور معشیت دست در دست آگے بڑھیں -

ان تمام کھلے ہوئے موانع کے باوجود دہلی کے سمجھوتہ کے بعد سے برابر ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم کسانوں کے مسئلہ کو سیاسی کشمکش سے الگ رکھیں - اس کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی کے سمجھوتہ نے اس مسئلہ کو طے نہیں کیا تھا، اور ہم اس بات کو حکومت اور قوم دونوں پر پوری طرح واضح کر دینا چاہتے تھے. میں سمجھتا ہوں کہ دہلی کی بات چیت کے وقت گاندھی جی نے لارڈ ارون کو یقین دلایا تھا اگر میں گول میز کانفرنس میں نہ بھی گیا تو بھی کانفرنس کے دوران میں سول نافرمانی شروع نہ کرونگا اور کانگریس سے درخواست کرونگا کہ کانفرنس کو پورا پورا موقع دے اور اس کے نتیجہ کا انتظار کرے - لیکن اس وقت بھی گاندھی جی نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ اس وعدہ کا اطلاق کسی ایسی مقامی کشمکش پر نہ ہوگا جس پر کہ ہم بعد کو مجبور ہوں - صوبجات متحدہ کے کسانوں کا مسئلہ تو اُس وقت ہم سب کے سامنے ہی تھا، اس لئے کہ یہاں منظم کارروائی ہو چکی تھی - ورنہ واقعہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کسانوں کی حالت یہی تھی. شملہ کی گفتگو میں گاندھی جی نے اس بات کو پھر دُہرایا تھا اور اس کا ذکر شائع شدہ خط و کتابت میں بھی آچکا ہے[1] عین اس وقت کہ وہ یورپ

---

[1] - ذیل کے خطوط ۲۷ اگست والے شملہ کے مفاہمت نامہ کا جزو تھے - (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۱)

جا رہے تھے، گاندھی جی نے یہ بات کہ گول میز کانفرنس سے اور سیاسی مسائل سے قطع نظر، کانگریس کو اس بات کی ضرورت ہو سکتی ہے کہ معاشی کشاکش میں وہ قوم کے اور خصوصاً کسانوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ انھیں اس کشاکش میں پڑنے کی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ تو اس سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر یہ ناگزیر ہو جائے تو پھر تو کرنا ہی چاہئے کہ ہم قوم کے عوام کو نہیں چھوڑ سکتے ان کا کہنا تھا کہ دہلی

مسٹر گاندھی بنام مسٹر ایمرسن، سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ، حکومت ہند

شملہ،

۲۷؍اگست ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر ایمرسن،

آپ کا آج والا خط ملا، جس کے ساتھ آپ نے ایک نیا مسودہ بھیجا ہے اس کا شکریہ۔ سر کاوس جی نے بھی مجھے ان ترمیموں کی اطلاع دی تھی جو آپ نے تجویز کی ہیں۔ میرے ساتھیوں نے اور میں نے اس ترمیم کئے ہوئے مسودہ پر غور کر لیا ہے اور مندرجہ ذیل ملاحظات کے ساتھ ہم اسے قبول کرنے کو تیار ہیں!

پیراگراف ۱۱ میں میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کانگریس کی طرف سے اس بات کو قبول کر لوں جو حکومت نے پیش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں اگر سمجھوتہ پر کاربند ہونے کے سلسلہ میں کانگریس کی رائے میں کوئی شکایت پیدا ہو تو اس کی تحقیقات تو لازم ہی ہے، اس لئے کہ جب تک دہلی کا سمجھوتہ نافذ ہے سول نافرمانی بند رہے گی لیکن اگر حکومت ہند یا صوبجاتی حکومتیں تحقیقات کو منظور نہ کریں تو میرے ساتھی اور میں اس دفعہ کے رکھنے پر اعتراض نہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس ان دوسرے معاملات کے متعلق جو اس کی طرف سے اب تک اٹھائے جا چکے ہیں، تحقیقات پر تو اصرار نہ کرے گی لیکن اگر بدقسمتی سے کوئی شکایت اس قدر شدت سے پیدا ہوئی کہ تحقیقات نہ ہونے کی صورت میں

کا سمجھوتہ جو عام اور سول نافرمانی سے متعلق ہے ہمیں اس سے نہیں روک سکتا۔
میں اس بات کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی اور اس کے رہنماؤں کے خلاف برابر یہ الزام لگایا گیا کہ ٹکس روکنے کی مہم شروع کر کے انھوں نے دہلی کے سمجھوتہ کو توڑ دیا۔ الزام لگانے والوں کو الزام لگانے میں یہ

کانگریس نے اپنا فرض جانا کہ تلافی کی کوئی فوری تدبیر براہ راست مدافعانہ عمل کی قسم سے تلاش کرے تو اس وقت کانگریس اس تدبیر کے اختیار کرنے کے لیئے آزاد سمجھی جائے گی، ہرچند سول نافرمانی بند کی جا چکی ہے۔
میں حکومت کو اس بات کا یقین دلانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ کانگریس برابر یہ کوشش کرے گی کہ براہ راست کارروائی سے بچے اور باہمی بحث و گفتگو، ترغیب وغیرہ سے کام نکالے۔ یہاں جو کانگریس کے نقطۂ نظر کا اظہار کر دیا گیا وہ اس لئے کہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو اور کانگریس پر عہد شکنی کا الزام نہ لگایا جائے۔ اگر اس وقت کی گفتگوئیں کامیابی کے ساتھ ختم ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری بیان، یہ خط اور آپ کا جواب سب ایک ساتھ شائع کر دیئے جائیں گے۔ آپ کا مخلص،
م۔ک۔ گاندھی

مسٹر ایمرسن بنام مسٹر گاندھی

شملہ۔

۲۷ اگست ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر گاندھی۔ آپ کے آج والے خط کا سلسلہ ہے، جس میں آپ سرکاری بیان کے مسودوں کو قبول فرمالیا ہے ان ملاحظات کے ساتھ جو آپ کے خط میں درج ہیں، گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل نے نوٹ فرمالیا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ان معاملات کی تحقیقات پر اصرار کرنے کا نہیں ہے جواب تک (بقیہ صفحہ دیگر پر ملاحظہ)

سہولت تھی کہ جس کے خلاف الزام تھا اور جو اس کا جواب دے سکتے تھے وہ سب قید خانوں میں بند پڑے تھے اور ہر اخبار اور ہر مطبع پر سخت سرکاری نگرانی تھی اس واقع سے بالکل قطع نظر کر ۱۹۳۱ء میں صوبہ متحدہ کی کانگریس نے ٹکس نہ دینے کی کوئی مہم سرے سے شروع ہی نہیں کی، میں جس بات کو صاف کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر معاشی غرض کے لئے سول نافرمانی سے الگ ایسی کوئی تحریک شروع بھی کی جاتی تو اس سے دہلی کے سمجھوتہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی. خود حالات کی بنا پر ایسا کرنا حق بجانب ہوتا یا نہ ہوتا، یہ دوسری بات ہے، مگر کسانوں کو اس تحریک کے شروع کرنے کا ایسا ہی حق تھا جیسا کہ اپنی معاشی شکایات رفع کرنے کے لئے کسی کارخانہ کے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا ہوتا ہے۔ دہلی سے لے کر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲) اس کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں. جہاں آپ یہ یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس برابر اس بات کی کوشش کریگی کہ براہ راست کارروائی سے احتراز کرے اور باہمی بحث و مباحثہ ترغیب اور اسی قسم کی تدابیر سے مداوا چاہے اسی کے ساتھ آپ ان آئندہ کارروائیوں کے متعلق کانگریس کی حیثیت کو واضح کردینا چاہتے ہیں جن کے اختیار کرنے کی کبھی آگے جاکر ضرورت ہوسکتی ہے مجھے عرض کرنا ہے کہ گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل اس امید میں آپ کے ہمنوا ہیں کہ کوئی براہ راست کارروائی نہ کی جائے گی. حکومت کے عام رویہ سے متعلق ہیں حضور وائسرائے بہادر کے اس خط کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ۱۹ اگست کو آپ کے نام ارقام فرمایا تھا. مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سرکاری بیان، آپ کا آج والا خط اور اس کا یہ جواب حکومت کی طرف سے سب ساتھ ساتھ شائع کردئے جائیں گے۔

آپ کا مخلص

ایمرسن - و - ہ

شملہ تک ہمارا کہنا یہی تھا اور حکومت اسے سمجھتی ہی نہ تھی ٹھیک بھی مانتی تھی۔

۱۹۲۹ء میں اور اس کے بعد زرعی قیمتوں میں جو سخت اُتار ہوا وہ دراصل بگڑتے ہوئے حالات کی آخری منزل تھی۔ پہلے کئی سال تک تو زرعی پیدا وار کی قیمت بڑھی اور ہندوستانی زراعت چونکہ دنیا کی منڈی سے وابستہ ہے اس لئے اس چڑھاؤ میں شریک رہی۔ ساری دنیا میں صنعت اور زراعت کے درمیان نشوونما کا جو تفاوت تھا اس نے ہر جگہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو چڑھا دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی جب قیمتیں چڑھیں تو سرکاری مالگذاری اور زمینداری لگان بھی بڑھا اور اصل بونے جوتنے والوں کو قیمتوں کے اس بڑھنے سے بمشکل ہی کوئی فائدہ پہنچا۔ بلکہ بعض خوش قسمت علاقوں کو چھوڑ کر عام طور سے تو کسانوں کی حالت کچھ ابتر ہی ہوئی صوبجات متحدہ میں لگان مالگذاری سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھا۔ ان دونوں میں اضافہ کی امتیازی نسبت اس صدی کے پہلے ۳۰ برس میں (میں حافظہ سے لکھتا ہوں) پانچ اور ایک کی نسبت ہے۔ یوں اگر زمین سے حکومت کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا تو زمیندار کی آمدنی میں اس سے بہت زیادہ ہوا، اور بے چارہ کسان ہمیشہ کی طرح، اسی مرجھکوں والی سطح پر رہا کہیں قیمتیں کم بھی ہوئیں یا مقامی قدرتی مصیبتوں کا سامنا رہا جیسے خشک سالی، طغیانی، ٹیڑھی، اُولے وغیرہ، تو بھی لگان اور مالگذاری وہی رہی، کہیں کچھ چھوٹ دی بھی گئی تو بہت رُک رُک کر اسی ایک فصل کے لئے۔ یوں تو اچھے سے اچھے زمانہ میں بھی لگان ضرورت سے زیادہ تھا۔ پھر وقت جو ذرا بگڑا تو مہاجن کی مدد کے بغیر یہ مطالبہ ناقابل برداشت ہو گیا، اور دیہاتی قرض خوب بڑھا۔

سارے زرعی طبقے، زمیندار، مالک آراضی کسان، اور اسامی سب کے سب مہاجن کا شکار بنے، اس لئے کہ مہاجن ان حالات میں گاؤں کی ابتدائی معیشت

میں ایک لازمی فرض انجام دے رہا تھا چنانچہ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے خوب خوب بیجا فائدے اٹھائے اور زمین اور زمین سے تعلق رکھنے والوں پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ روک ٹوک اس پر کچھ تھی نہیں، قانون تھا سو اس کا مددگار، یہ بس اپنے معاہدہ کے لفظوں پر اڑتا اور شائلاک یہودی کی طرح بس اپنے پونڈ بھر گوشت کا مطالبہ کرتا اور پاتا تھا۔ رفتہ رفتہ زمین بھی اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسانوں مالکان آراضی کی زمین۔ اور یہ مہاجن صاحب خود ایک بڑے مالک آراضی، زمیندار اور طبقہ اشراف کے رکن کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ کسان مالک آراضی جو اب تک خود اپنی زمین جوتتا بوتا تھا اب اس بنیے زمیندار یا ساہوکار کا غلام بن گیا۔ اسامیوں کا حال کچھ اس سے بھی برا تھا۔ یہ بھی یا تو ساہوکار کے غلام تھے یا بے زمین پرولی تاریات کی بڑھتی ہوئی فوج میں شامل تھے۔ اس مہاجن یا ساہوکار کو جو اب زمیندار بن بیٹھا تھا، زمین سے یا اسامیوں سے کوئی زندہ تعلق نہ تھا۔ یہ عموماً شہر کا رہنے والا ہوتا تھا، وہیں اپنا لین دین کا کاروبار کرتا، لگان جمع کرنے کا کام اپنے کارندوں پر چھوڑ دیتا اور یہ اس کام کو مشینوں کی سی بے دردی اور بے رحمی سے انجام دیتے۔

دیہی قرض کا اس طرح بڑھنا خود اپنی جگہ پر نظام زرعی کے غلط اور ناپائدار ہونے کا ثبوت ہے۔ آبادی کی بڑی اکثریت کے پاس کسی قسم کا پس انداز نہیں نہ جسمانی نہ مادی، نہ اس میں مقابلہ کی طاقت، بس فاقہ اور بھوک کے کنارے زندگی ہے۔ ناموافق قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا تو یہ اس کی تاب کیسے لائیں۔ کوئی وبا آجائے تو لاکھوں کو ختم کر جائے۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں خود سرکار کی مقرر کی ہوئی صوبجاتی ساہوکارہ کی تحقیقاتی کمیٹی نے تخمینہ کیا تھا کہ ہندوستان بھر کا (جس میں برما بھی شامل ہے) دیہی قرضہ ۹۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس میں

زمینداروں، کسان مالکان آراضی، اور اسامیوں سب کے قرضے شامل ہیں، مگر زیادہ تر قرض انہی پر ہے جو جوتتے بوتے ہیں۔ زر رائج سے متعلق حکومت کی جو سیاست ہے وہ تمام تر قرض خواہوں کے موافق ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرض کا بوجھ اور بڑھ گیا ہے۔ مثلاً سخت ہندوستانی مخالفت کے باوجود روپیہ کی قیمت ۱۶ پنس کی جگہ ۱۸ پنس مقرر کرنے کے معنی کیا تھے؟ یہی نا کہ ایک اشارہ سے دیہی قرض میں ½ ۱۲ فیصدی یا تقریباً ۱۰۷ کروڑ کا اضافہ ہو گیا۔[۵]
جنگ کے بعد پہلے تو قیمتیں بڑھی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ برابر گرتی گئیں اور دیہات کا حال بگڑتا گیا۔ مصیبت پر مصیبت ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کے حالات سے آئی۔

۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ کی بابت ہمارا کہنا یہ تھا کہ لگان قیمتوں کے مطابق ہونا چاہیئے یعنی لگان کو گھٹا کر اتنا کر دینا چاہیئے جتنا اس زمانہ میں تھا جب قیمتیں ۱۹۳۱ء کی سی کم تھیں۔ اور یہ صورت کوئی ۳۰ سال پہلے ۱۹۰۱ء میں

۵۔ سارے ہندوستان کے دیہی قرض کے لئے ۸۶۰ کروڑ کا تخمینہ غالباً بہت کم ہے اور بہر حال پچھلے ۴-۵ سال میں اس میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ اس قرض میں پنجاب کے حصہ کا تخمینہ پنجاب کی ساہوکارہ کمیٹی نے ۱۹۲۹ء میں ۱۳۰ کروڑ کیا تھا۔ پھر قرض کا بار ہلکا کرنے کے لئے پنجاب میں قانون کا جو مسودہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پیش ہوا تھا اس پر مجلس قانون ساز کی منتخبہ کمیٹی نے جو رپورٹ دی ہے اس میں لکھا ہے کہ اہل زراعت پر قرض کا بوجھ اتنا ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے، کم کم تخمینہ سے بھی کوئی ۲۰۰ کروڑ یہ تعداد ساہوکارہ کمیٹی کے تخمینہ سے کوئی ۵۰ فیصدی زیادہ ہے۔ اگر قرض میں اضافہ کی رفتار دوسرے صوبوں میں بھی یہی ہے تو اس وقت (۱۹۳۴ء) سارے ہندوستان کے دیہی قرض کا تخمینہ کوئی ۱۲۰۰ کروڑ روپیہ سے اوپر ہوگا۔

تھی - یہ ایک موٹا سا معیار تھا اور اس سے جانچنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ اسامیوں کی بہت سی قسمیں تھیں، موروثی، غیر موروثی، شکمی وغیرہ اور سب سے زیادہ مصیبت میں وہ تھے جو سب سے نیچے درجہ میں تھے - اس کے علاوہ بس ایک معیار اور تھا اور بلا شبہ وہی سب سے زیادہ منصفانہ معیار یعنی یہ کہ کسان کے مصارف پیدائش اور اس کی اجرت کو منہا کردینے کے بعد اس کی لگان ادا کرنے کی صلاحیت کو دیکھا جائے - لیکن اس دوسرے معیار سے تو ہندوستان کا بہت کچھ زرعی کاروبار بالکل غیر معاشی ہو جاتا ہے، چاہے آپ کسان کی زندگی گذارنے کے مصارف کو کتنا ہی کم کیوں نہ مانئے - اور جیسا کہ ہم نے ۱۹۳۰ء میں صوبجات متحدہ کی چند مثالوں سے ظاہر کیا تھا بہت سے کسان لگان ادا کرہی نہیں سکتے جب تک کہ اپنی املاک نہ بیچیں (اگر کچھ بیچنے کو ہو) یا بہت زیادہ شرح سود پر روپیہ اُدھار نہ لیں۔

ہمارے صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے پہلی اور گویا آزمائشی تجویز جو کی وہ یہ کہ موروثی اسامیوں کو عام طور پر ۵۰ فیصدی کی چھوٹ ملے اور دوسرے اسامیوں کے لیے جن کا حال ان سے بھی گیا گذرا تھا اس سے بھی زیادہ - جب گاندھی جی مئی ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ میں آئے اور گورنر، سر میلکم ہیلی، سے ملے تو اس وقت ان میں کچھ اختلاف رائے تھا اور وہ دونوں کسی ایک بات پر متفق نہ ہو پائے تھے - اس کے جلد ہی بعد گاندھی جی نے صوبہ کے زمینداروں اور اسامیوں کے نام اپلیں شائع کیں - اسامیوں والی اپیل میں انھوں نے کہا تھا کہ جس قدر ادا کر سکتے ہو ادا کردو، اور کچھ حساب بھی بتایا تھا جو اس عدد سے جو ہم پہلے پیش کر چکے تھے کچھ زیادہ ہوتا تھا - ہماری صوبہ کی کمیٹی نے گاندھی جی والے حساب کو منظور کرلیا - مگر اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہ چلا، اس لئے کہ

حکومت نے تو اسے بھی نہیں مانا۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ کی حکومت بڑی مشکل میں تھی۔ مالگذاری اس کی آمدنی کا خاص جزو تھا، اسے غائب ہو جانے دے یا بہت گھٹا دے تو دیوالے کا سامنا۔ دوسری طرف اسے دیہی بیچینی کا ڈر بھی تھا اور جہاں تک ہو سکتا تھا لگان میں چھوٹ دے کر یہ کسانوں کو مطمئن بھی کرنا چاہتی تھی۔ دونوں باتوں کا ایک ساتھ کرنا سہل نہ تھا۔ حکومت اور کسان کے بیچ میں تھا زمیندار، معاشی لحاظ سے بالکل بے سود اور غیر ضروری اضافہ۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس سے کچھ لیکر حکومت اور کسان دونوں کا کام چل جائے۔ لیکن برطانوی حکومت، جیسی کچھ کہ ہے، اس کے ساتھ ہیں ہی کتنے طبقے، وہ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر، ان کو کہ ابھی اس سے لپٹے ہوئے ہیں، کس طرح دھتکار سکتی تھی۔

آخر کار صوبہ کی حکومت نے زمینداروں اور اسامیوں دونوں کے لئے چھوٹ کا اعلان کیا۔ اس چھوٹ کا حساب ایک پیچیدہ سے قاعدہ پر مبنی تھا، اور پہلے پہل تو یہ سمجھنا بھی دشوار تھا کہ کتنی چھوٹ ملی۔ یہ بات البتہ صاف تھی کہ جتنی چھوٹ ملنی چاہیئے تھی اس سے بہت کم تھی۔ اس کے علاوہ اس چھوٹ کا تعلق بس اس وقت کے مطالبہ سے تھا، اور کسان پر جو بقایا تھا یا جو قرض تھا اس کا ذکر ہی نہ تھا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اگر اسامی اس ایک ششماہی کا لگان ادا نہیں کر سکتا تو پچھلے برسوں کا بقایا اور قرضہ تو اور بھی نہ دے پائے گا۔ اور زمینداروں کا طریقہ معمولاً یہی تھا کہ جو کچھ وصول ہوتا اسے پچھلے بقایا کی وصولی میں ڈال دیتے تھے۔ اسامی کے نقطہ نظر سے اس میں بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے کہ اس غریب پر ہر وقت مقدمہ چل سکتا تھا اور واجب الادا رقم کا کوئی حصہ بھی اگر ادا ہونے سے رہ گیا ہے تو اسے بے دخل کرایا جا سکتا تھا۔

صوبہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ سخت مشکل میں پڑگئی تھی ہمیں یقین تھا کہ اسامیوں سے جو سلوک ہو رہا ہے ناروا ہے، لیکن ہم بے بس تھے۔ اور اپنے اوپر یہ ذمہ داری نہ لینا چاہتے تھے کہ کسانوں سے کہہ دیں کہ جاؤ کچھ ادا نہ کرو۔ ہم تو بس یہی کہتے رہے کہ جس قدر بھی ادا کر سکتے ہو کر دو، ہاں ان کی مصیبت میں عام طور سے ہمدردی کرتے اور ان کی ڈھارس ضرور بندھاتے رہے۔ ہم ان کے اس خیال سے بالکل متفق تھے کہ چھوٹ کے بعد بھی مطالبہ بہت زیادہ ہے۔

اب وہ وقت آیا کہ جبر کی مشین نے، قانونی اور غیر قانونی شکل میں، اپنا کام شروع کیا۔ ہزاروں کے خلاف بے دخلی کے مقدمات دائر ہوئے، گائے بیل شخصی پونجی سب کی قرقی ہونے لگی، زمیندار کے آدمیوں نے ٹھکائی شروع کی۔ بہتیرے اسامیوں کے مطالبہ کا ایک حصہ ادا بھی کر دیا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جتنا دے سکتے تھے سب دے دیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سے زیادہ بھی ادا کر سکتے ہوں مگر یہ بات بالکل صاف تھی کہ بڑی اکثریت کے لئے یہ مطالبہ بہت زیادہ تھا۔ اور یوں تھوڑا تھوڑا لگان ادا کر کے بھی انھیں نجات نہ ملی۔ قانون کا بھاری بھرکم رولر تھا کہ بڑھا چلا جاتا تھا اور جو راہ میں آتا اسے بے رحمی سے کچلتا چلتا تھا۔ بے دخلی کے مقدمے ڈگری ہو رہے تھے، چاہے لگان کا ایک حصہ لیا بھی جا چکا ہو۔ شخصی املاک اور مویشی کی قرقیاں اور نیلام جاری تھے۔ اسامی اگر کچھ ادا نہ کرتے تو بھی اس سے برے حال میں تو نہ ہوتے، کچھ اچھے ہی رہتے، اس لئے کہ کم سے کم وہ روپیہ تو پاس بچ رہتا جو لگان میں ادا کر دیا۔

ہمارے پاس کسان جوق جوق آتے تھے، سخت شاکی کہ آپ کا کہا مانا جو دے سکتے تھے دے دیا، اور نتیجہ یہ ہوا۔ اکیلے الہ آباد کے ضلع میں ہزاروں

کسان بے دخل کیے گئے تھے اور ان کے علاوہ اور ہزاروں پر کسی نہ کسی قسم کی قانونی کارروائی کی گئی تھی۔ ضلع کی کانگریس کمیٹی کا دفتر دن بھر ایک پریشان حال انبوہ سے گھرا رہتا تھا۔ خود میرا گھر بھی گھرا رہتا اور اکثر یہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں اور جہاں بن پڑے اپنے کو چھپا لوں اور اس دردانگیز صورت حال سے بچ نکلوں۔ جو کسان ہمارے پاس آتے ان میں سے بہتوں کے جسم پر چوٹوں کے نشان ہوتے تھے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے کہ زمیندار کے آدمیوں نے مارا ہے۔ ہم ہسپتال میں ان کا علاج کراتے تھے۔ یہ غریب کیا کر سکتے تھے، ہم ہی کیا کر سکتے تھے؟ ہم صوبہ کی حکومت کو لمبے لمبے خط لکھتے تھے۔ ہماری کمیٹی نے گوند بلبھ پنتھ کو نینی تال اور لکھنؤ میں صوبہ کی حکومت سے تعلق قایم رکھنے کے لئے درمیانی افسر مقرر کر رکھا تھا۔ یہ بھی برابر حکومت کو لکھتے رہتے تھے، ہمارے صوبہ کے صدر تصدق احمد خاں شیروانی بھی وقتاً فوقتاً لکھتے تھے اور میں بھی۔

جون جولائی میں بارش شروع ہوئی تو ایک اور دشواری پیدا ہوئی۔ یہ جوتنے بونے کا زمانہ ہوتا ہے۔ جو کسان بے دخل کر دیئے گئے تھے وہ کیا کرتے؟ کیا بیٹھے منہ تکا کرتے اور اپنے کھیتوں کو بنجر پڑا رہنے دیتے؟ کسان کے لئے تو یہ بڑی مشکل بات تھی، اسے الٹی چھری سے کاٹنا تھا۔ اکثر صورتوں میں بے دخلی بس قانون اور ضابطہ کی بات تھی، یہ کچھ زمین سے واقعی طور پر تو ہٹ نہیں گئے تھے، بس عدالت کی ڈگری ہو گئی تھی، اس کے بعد اور کچھ نہ ہوا تھا۔ کیا یہ لوگ اپنی زمین جوت لیتے؟ اس میں مداخلت بیجا کا جرم سرزد ہو جاتا اور چھوٹے موٹے بلوہ کا ڈر تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے یہ دیکھنا بھی تو دشوار تھا کہ دوسرے اس کی پرانی زمین کو جوتیں۔ کسان بھلا اسے

کیسے برداشت کرے؟ بیچارے ہمارے پاس مشورہ کو دوڑے آتے تھے، ہم کیا مشورہ دیتے؟

گرمی میں جب میں گاندھی جی کے ساتھ شملہ گیا تو حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدہ دار سے میں نے یہ دشواری بیان کی اور ان سے پوچھا کہ آپ ہماری جگہ ہوتے تو ان کسانوں کو کیا مشورہ دیتے؟ ان کے جواب سے معاملہ پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی کسان جسے بے دخل کردیا گیا ہے مجھ سے یہ سوال کرے تو میں جواب دینے سے احتراز کروں گا۔ یعنی یہ اعلیٰ عہدہ دار صاحب تک اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسان سے بس یہ کہہ دیں کہ کھیت نہ جوتو، ہر چند کہ قانوناً کسان کھیت سے بے دخل کیا جا چکا ہے وہ شملہ کی بلندیوں پر تھے، ان کے لیے آسان تھا کہ مسلوں پر اس طرح احکام جاری کیا کریں گویا ریاضی کے کسی مجرد مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر فرمارہے ہیں۔ مسئلہ کے انسانی پہلو سے نہ انھیں واسطہ تھا نہ نینی تال کے اعلیٰ حکام کو۔ نہ ان کی آنکھوں کے سامنے انسانی تکلیف و فلاکت کی وہ تصویر آتی تھی جو اس معاملہ کے ساتھ وابستہ تھی۔

شملہ میں ہم سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم کسانوں کو بس ایک مشورہ دو، یعنی یہ کہ کل مطالبہ ادا کردو یا جتنا بھی ادا کرنا ممکن ہو۔ گویا ہمیں زمینداروں کے کارندوں کا کام کرنا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جب ان سے کہا تھا کہ جتنا دے سکتے ہو دے دو تو ہم تو اس فرمائش کی تعمیل پہلے ہی کر چکے تھے۔ ہاں، ہم نے ساتھ میں اتنا اور ضرور کہا تھا کہ اپنے مویشی نہ بیچنا اور قرض نہ لینا۔ اس کا نتیجہ جو ہوا تھا وہ ہم دیکھ چکے تھے۔

ہم سب کے لئے یہ گرمی کا موسم بڑا ہی سخت تھا۔ اور سر پر وہ بوجھ

تھا کہ الامان -

ہندوستانی کسان میں مصیبت جھیلنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے اور اس کے حصہ میں مصیبت آتی بھی بہت رہتی ہے - قحط، طغیانی، بیماری اور مسلسل افلاس اور فلاکت - اور جب یہ انھیں نہیں جھیل پاتا تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چپ چپاتے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر پڑا رہتا ہے اور مر جاتا ہے - اس کا مصیبت سے بچنے کا طریقہ بس یہ ہے - ان دستی مصیبتوں کے مقابلہ میں تو ۱۹۳۱ء میں گویا کچھ بات ہی نہ ہوئی تھی - لیکن پھر بھی اسے ۱۹۳۱ء کے یہ واقعات قدرت کے بن بوجھے ارادوں کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتے تھے کہ اس وجہ سے انھیں صبر کے ساتھ جھیل لیتا - وہ سوچتا تھا کہ یہ تو سب آدمیوں کی کارستانی ہے، اور اس وجہ سے ان پر بگڑتا تھا - اس کی نئی سیاسی تعلیم کا پودا پھل لا رہا تھا ۱۹۳۱ء کے یہ واقعات ہمارے لئے بھی خاص طور سے تکلیف دہ یوں تھے کہ ہم اپنے کو کچھ نہ کچھ ان کا ذمہ دار جانتے تھے - کیا یہ بات نہ تھی کہ کسانوں نے اکثر ہماری نصیحت مانی تھی؟ لیکن پھر بھی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہم برابر مدد نہ کرتے تو کسانوں کی حالت اور بھی ابتر ہوتی - ہم ان کا جتھا بنائے رہے اور اس لئے وہ ایک قوت بنے رہے جس کا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا - اور اس وجہ سے انھیں اس سے زیادہ چھوٹ مل گئی جتنی کہ دوسرے حالات میں ملتی - وہ جبر اور بدسلوکی جو ان غریبوں کے حصہ میں آئی، ہر چند کہ بہت بری تھی، پر ان ناشاد لوگوں کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی - فرق تھا تو کچھ تو درجہ کا کہ اس زمانہ میں بہت زیادہ سختی ہوئی اور کچھ اس بدسلوکی کی تشہیر کا - معمول تو یہ ہے کہ اگر زمیندار کے آدمی نے کسان سے بدسلوکی کی یا اسے ایذا بھی پہنچائی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہوتا

ہی ہے اور اگر اس مار توڑ میں وہ بیچارہ مر ہی نہ جائے تو اس علاقہ کے باہر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ لیکن اب ہمارے نظام کی وجہ سے معاملہ دِگر ہو گیا تھا، کسانوں میں ایک نیا احساس تھا جس کی وجہ سے یہ متحد بھی تھے اور ہر واردات کی خبر کانگریس کے دفتر کو دیتے رہتے تھے۔

گرمیوں کا موسم ذرا اور گذرا تو جبریہ تحصیل وصول میں کمی ہوئی اور ظالمانہ کارروائیاں بھی کچھ گھٹیں اب جو سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا وہ یہ کہ جو کسان بے دخل ہوئے ہیں ان کا کیا ہو؟ ان کے لئے کیا کیا جائے؟ ہم حکومت پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کے کھیت انھیں واپس مل جائیں کہ یہ کھیت اکثر یوں ہی خالی پڑے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم سوال مستقبل کا تھا۔ اب تک جو چھوٹ ملی تھی وہ بس پچھلی فصل کے لیے تھی، آئندہ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ اکتوبر سے اگلی تحصیل وصول کا زمانہ شروع ہونے کو تھا، اس وقت کیا ہوگا؟ اس پر غور کرنے کے لئے صوبہ کی حکومت نے ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کی جس میں کچھ تو خود اس کے عہدہ دار تھے اور کچھ سرکاری کونسل کے زمیندار ممبر۔ اس کمیٹی میں کسانوں کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ بالکل آخر وقت میں جب کہ کمیٹی اپنا کام بھی شروع کر چکی تھی حکومت نے گوند بلبھ پنتھ سے کہا کہ ہماری طرف سے کمیٹی میں شریک ہو جائیں۔ اتنی دیر کے بعد جبکہ اہم معاملات پر فیصلے بھی ہو چکے تھے انھوں نے شرکت کو بے سود سمجھا۔

صوبجات متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بھی ایک چھوٹی سی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ اس وقت کے اور پچھلے زمانہ کے دیہاتی امور پر معلومات جمع کرے اور موجودہ صورت حال پر رپورٹ دے۔ اس کمیٹی نے ایک لمبی رپورٹ پیش کی جس میں صوبہ کی زرعی حالت پر نہایت اچھا تبصرہ ہے اور

قیمتوں کے گرنے سے جو مصیبت نازل ہوئی تھی اسے نہایت خوبی سے کھول کر بتایا ہے۔ ان کی سفارشیں بھی بڑی دوررس تھیں۔ اس رپورٹ پر جو کتابی شکل میں شایع ہو چکی ہے، گوند بلبھ پنتھ، رفیع احمد قدوائی، اور دنکٹیش نرائن تواری کے دستخط ہیں۔

اس رپورٹ کے نکلنے سے بہت پہلے گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جا چکے تھے۔ وہ بہت ہی پس وپیش کے بعد گئے تھے اور اس پس وپیش کی ایک وجہ صوبجات متحدہ کے دیہاتی حالات بھی تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر گول میز کانفرنس کے لئے ولایت جانا نہ ہوتا تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ صوبجات متحدہ میں جاؤں گا اور اس پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے میں لگ جاؤنگا۔ شملہ میں حکومت سے جو آخری گفتگو ہوئی ان میں منجملہ اور امور کے صوبجات متحدہ کا معاملہ بھی بحث میں آیا تھا۔ ان کے تشریف لیجانے کے بعد ہم لوگ انھیں سب باتوں سے برابر مطلع کرتے رہے پہلے مہینہ دو مہینہ تک تو میں انھیں ہر ہفتہ خط لکھتا تھا، ہوائی ڈاک سے بھی اور معمولی ڈاک سے بھی۔ ان کے قیام لندن کے آخری زمانہ میں میں اتنا پابند نہ رہا تھا، اس لئے کہ ان کے جلد لوٹنے کی امید تھی۔ انھوں نے ہمیں توقع دلائی تھی کہ اگر بہت دیر بھی ہوئی تو بھی وہ تین مہینہ کے اندر اندر لوٹ آئیں گے یعنی نومبر کی کسی تاریخ کو اور ہمیں امید تھی کہ اس وقت تک ہندوستان میں کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہوگی۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم حکومت سے خاص طور پر کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی اور دیہات کے معاملات نے تیزی سے بڑھنا شروع کیا، تو ہم نے انھیں ایک لمبا تار بھیجا جس میں سب باتوں سے انھیں باخبر کر دیا اور یہ بتا دیا کہ ہمیں کس کس طرح

مجبور کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے تار ہی سے جواب دیا کہ میں اس معاملہ میں بے بس ہوں اور یہاں سے تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا تم اپنی سمجھ سے کام لے کر آگے بڑھو۔

صوبہ کی مجلس انتظامیہ بڑی مجلس عاملہ کو بھی برابر اطلاع دیتی رہی میں خود اس مجلس میں سب باتیں بتانے کے لئے موجود تھا۔ لیکن معاملہ چونکہ ذرا بڑھتا جاتا تھا اس لئے مجلس عاملہ نے ہمارے صوبہ کے صدر تصدق احمد خاں شیروانی اور الہ آباد ضلع کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے بھی مشورہ کیا۔

اسی اثنا میں حکومت کی دیہاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شایع کی۔ اس میں کمیٹی نے بہت سی سفارشیں کیں، جو پیچیدہ بھی تھیں اور مبہم بھی، اور جن سے معاملہ بہت کچھ مقامی حکام میں رہتا تھا۔ مجموعی طور پر جو چھوٹ تجویز کی گئی تھی وہ پچھلی فصل کے مقابلہ میں ضرور زیادہ تھی مگر ہمارے خیال میں اب بھی کافی نہ تھی ہمیں ان سفارشوں کے اصول پر بھی اعتراض تھا اور ان کے عمل پر بھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس رپورٹ میں صرف مستقبل کا ذکر تھا، پچھلے بقایا، قرض، اور بے دخل کئے ہوئے کسانوں کا نام نہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہم کیا کریں؟ بس یہی جیسے پچھلے موسم بہار اور گرمیوں میں کیا تھا، کہ کسان کو مشورہ دیا جائے کہ جتنا ادا کر سکتے ہو کر دو، اور پھر انھیں نتایج سے دوچار ہوں جن سے پہلے ہو چکے تھے؟ مگر ہم اب یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مشورہ تو سراسر حماقت کا مشورہ ہے اور اسے دہرانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اب تو صورت بس یہ تھی کہ یا تو کسان بڑی کوشش کر کے نئے مطالبہ کو پورا پورا چکا دے یا یہ نہ ہو سکے تو فی الحال کچھ ادا نہ کرے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔ مطالبہ میں سے کچھ تھوڑا سا ادا کر دینا تو کچھ بات نہ ہوئی، نہ ادھر نہ اُدھر۔ کسان بیچارہ کے ہاتھ

سے جو کچھ روپیہ تھا وہ بھی نکل گیا اور پھر زمین بھی چھن گئی۔

صوبہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ نے خوب اچھی طرح اور توجہ سے اس معاملہ پر غور کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ اگرچہ حکومت کی نئی تجویزیں پچھلی گرمی والی چھوٹ کے مقابلہ میں بہتر ہیں مگر پھر بھی ایسی نہیں کہ انھیں اسی صورت میں قبول کر لیا جائے۔ ان میں اب بھی ایسی تبدیلیوں کا امکان تھا جن سے کسانوں کو فائدہ ہوتا چنانچہ ہم نے حکومت کے یہاں اسی پر زور دیا۔ لیکن وہاں محسوس ہوا کہ اب امید نہیں رکھنی چاہیے اور ہم جس جھگڑے کو ٹالنے کی کوشش میں ہیں وہ تیزی سے سامنے بڑھا آ رہا ہے۔ صوبہ کی حکومت اور حکومت ہند دونوں کا رویہ کانگریس کی طرف سے برابر بدلتا جا رہا تھا۔ اور روز بروز اس میں سرد مہری ظاہر ہو رہی تھی ہم لمبے لمبے خط لکھتے تھے وہاں سے نہایت مختصر جواب آتے تھے جن میں مقامی عہدہ داروں سے رجوع کرنے کو کہہ دیا جاتا تھا۔ یہ بات صاف دکھائی دیتی تھی کہ حکومت کسی طرح ہماری ہمت بڑھانا نہیں چاہتی۔ حکومت کی ایک شکایت اور ایک مشکل یہ بھی کہ کسانوں کو چھوٹ ملنے سے کانگریس کا اقتدار بڑھ جائے گا۔ حکومت عادت سے مجبور، اقتدار اور اثر کے نقطۂ نظر ہی سے سوچ سکتی تھی اور اس خیال سے کہ عوام کو چھوٹ ملنے کی وجہ کانگریس کو قرار دیں گے اسے الجھن ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جہاں تک بن پڑے ایسا نہ ہو۔

اسی زمانہ میں دہلی سے اور دوسرے مقامات سے ہمیں خبریں مل رہی تھیں کہ حکومت ہند کل کانگریس کی تحریک کے خلاف بڑے پیمانہ پر یلغار شروع کرنے والی ہے۔ خبریں گرم تھیں کہ بی چھنگلیا اب ذرا زور دکھائیں گی اور بچھوؤں کے ڈنک ہمیں سزا دیں گے۔ نومبر کے مہینہ میں ڈاکٹر انصاری

سے نے مجھے (اور علیحدہ ولبھ بھائی پٹیل، صدر کانگریس کو بھی) ایک پیام بھیجا جس میں ان بہت سی خبروں کی تصدیق تھی جو ہمیں ملتی رہتی تھیں اور خاص کر کے ان آرڈیننسوں کی تفصیل دی تھی جو صوبہ سرحدی اور صوبجات متحدہ میں نافذ ہونے والے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کو تو اس وقت ایک نئے آرڈیننس کا تحفہ مل ہی چکا تھا یا شاید عنقریب ملنے والا تھا۔ کئی ہفتہ بعد جب اس شان سے کہ گویا کوئی نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے نئے آرڈیننس نکلے تو ڈاکٹر انصاری کے پیام کی پوری تصدیق تفصیلات تک میں ہو گئی۔ عام خیال یہ تھا کہ گول میز کانفرنس میں جو خلاف توقع طوالت ہوئی اس کی وجہ سے حکومت نے اپنی کارروائی شروع کرنے میں ذرا دیر کی۔ حکومت چاہتی تھی کہ جب تک گول میز کانفرنس کے لوگ میٹھی میٹھی مگر لایعنی کانا پھوسیوں میں مبتلا ہیں بس اس وقت تک ہندوستان میں کھلم کھلا تشدد کو ٹالے۔

چنانچہ کھینچ تان بڑھی، اور ہم سب کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہماری ننھی ننھی بے حقیقت ہستیوں کے باوجود واقعات اپنی راہ پر تیزی سے گامزن ہیں اور ان کی مقدر رفتار کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ ہمارے بس میں بس یہ تھا کہ ان سے دوچار ہونے کے لئے اپنے کو تیار کریں اور زندگی کے اس ڈراما میں، غالباً المناک ڈراما میں الگ الگ اور مل کر اپنا اپنا حصہ لیں۔ مگر ہمیں یہ امید ضرور تھی کہ قوتوں کے تصادم کے اس ڈراما کا پردہ اٹھنے سے پہلے گاندھی جی لوٹ آئیں گے اور اپنے کندھوں پر ذمہ داری لے لیں گے، چاہے امن کی ذمہ داری ہو، چاہے جنگ کی ان کی غیر حاضری میں اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔

صوبجات متحدہ میں حکومت نے ایک قدم اور اٹھایا جس سے سارے دیہات میں ہل چل مچ گئی۔ کسانوں میں چھوٹ کے متعلق پرچیاں بانٹی گئیں

جن میں لکھا تھا کہ کتنی چھوٹ دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اس چھوٹ کے بعد جو رقم واجب الادا ہے وہ اگر مہینہ بھر کے اندر (اور بعض حالتوں میں یہ مدت اس سے بھی کم رکھی گئی تھی) ادا نہ ہوگئی تو چھوٹ منسوخ! پھر پورا مطالبہ قانونی طور پر وصول کیا جائے گا۔ یعنی وہی بے دخلی قرقی وغیرہ۔ معمول یہ تھا کہ اسامی دو یا تین مہینہ میں تھوڑا تھوڑا کرکے لگان ادا کر دیتے تھے۔ اور اب تو اتنی مہلت بھی انھیں نہ دی گئی۔ سارے دیہات میں ایک سخت مصیبت کا سامنا تھا اور غریب اسامی ہاتھ میں پرچی لئے اِدھر سے اُدھر بھاگے بھاگے پھرتے تھے کہیں بگڑتے کہیں شکایت کرتے، کہیں صلاح مشورہ کرتے۔ حکومت اور مقامی افسروں کی طرف سے یہ دھمکی بڑی حماقت کی بات تھی اور بعد میں تو ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس پر عمل کرنا مقصود نہ تھا، بس یونہی دھمکی دیدی تھی! لیکن اس نے پرامن تصفیہ کے امکانات کو بہت دور کرکے رفتہ رفتہ مقابلہ اور کشمکش کو ناگزیر بنادیا۔

اب موقع وہ آگیا تھا کہ کسانوں کو اور کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا، یا اِدھر یا اُدھر اور گاندھی جی کی واپسی تک معاملہ کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ ہاں تو کرنا کیا چاہیے تھا؟ کیا مشورہ دینا چاہیے تھا؟ کیا ہم بجا طور پر کسانوں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ جو تھوڑا سا وقت تمھیں دیا گیا ہے اس میں مطلوبہ رقم ادا کردو، اور یہ ایسی حالت میں کہ ہم خوب جانتے تھے کہ ان میں سے بہتیروں کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں اور پھر جو بقایا ہے اس کا کیا کیا جاتا؟ کیا اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اگر رقم مطلوبہ کا بڑا حصہ بھی ادا کر دیا۔ یا اس ایک فصل کا پورا مطالبہ بھی ادا کر دیا تب بھی اسے بقایا کے حساب میں ڈال کر بے دخل نہ کرا دیا جائے گا۔

الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی نے جس میں کسان بھی خاصی تعداد شریک تھے مقابلہ کی ٹھانی۔ اس نے طے کیا کہ وہ کسی حال میں کسانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتی

کہ مطالبہ ادا کر دو۔ لیکن اسے بتایا گیا کہ صوبہ کی مجلس انتظامیہ اور کانگریس کی مجلس عاملہ کی باضابطہ اجازت کے بغیر اسے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ چنانچہ معاملہ مجلس عاملہ کے سامنے گیا تصدق شیروانی اور پرشوتم داس ٹنڈن دونوں صوبہ اور ضلع کی طرف سے معاملہ سمجھانے کے لئے وہاں موجود تھے۔ ہمارے سامنے سوال بس ایک الہ آباد ضلع کا تھا اور معاملہ تھا خالص معاشی۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اس وقت ملک میں جو عام سیاسی ہیجان ہے اس میں ہماری کارروائی کے نتائج بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں الہ آباد ضلع کی کمیٹی کو یہ اجازت دینے میں کچھ مضائقہ تھا کہ تم کسانوں کو مشورہ دو کہ فی الحال اُس وقت تک لگان اور مالگذاری روک دیں جب تک کہ بات چیت ہو کر بہتر شرائط طے نہ ہو جائیں۔ اصلی معاملہ بس اتنا ہی تھا اور ہم چاہتے بھی تھے کہ بس اسی تک رہیں آگے نہ بڑھیں۔ مگر ایسا ممکن بھی تھا؟ مجلس عاملہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی سے پہلے حکومت سے ان بن نہ ہو اور خاصکر ایک معاشی معاملہ پر وہ اس ان بن کو اس لئے اور بھی ٹالنا چاہتی تھی کہ یہ پھر مختلف طبقات معاشی کا معاملہ بن سکتا ہے۔ مجلس عاملہ سیاسی اعتبار سے بہت آگے ہو مگر معاشی اعتبار سے اتنی آگے نہ تھی اور اسے یہ پسند نہ تھا کہ اسامی اور زمیندار کا سوال اٹھا دیا جائے۔

میری طبیعت کا رجحان چونکہ اشتراکیت کی طرف ہے اس لئے معاشی اور معاشرتی امور پر صلاح مشورہ کے لئے مجھے کچھ بہت مناسب آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ادھر میں خود بھی چاہتا تھا کہ مجلس عاملہ سمجھے کہ صوبہ متحدہ کا معاملہ ایسا ہے کہ ہمارے معتدل مزاج اراکین خود باوجود مخالف میلان طبع کے واقعات کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور رہیں۔ چنانچہ میں بہت خوش تھا کہ مجلس عاملہ کے

جلسہ میں ہمارے صوبہ سے شیروانی (ہمارے صوبہ کے صدر) اور دوسرے لوگ موجود تھے، اس لئے کہ شیروانی کوئی شعلہ مزاج انتہا پسند نہ تھے۔ سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے وہ کانگریس کے اعتدال پسندوں میں تھے اور سال کے شروع شروع میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی دیہاتی سیاست کے خلاف رائے رکھتے تھے لیکن جب یہ خود کمیٹی کے صدر ہوئے اور ذمہ داری کا بوجھ خود ان پر پڑا تو انھوں نے سمجھا کہ ہمارے لئے تو کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد سے صوبہ کی کمیٹی نے جو کچھ بھی کیا اس میں ان کی پوری پوری مدد شامل تھی اور اکثر کارروائیاں تو بہ حیثیت صدر انھیں کی وساطت سے ہوئیں۔

چنانچہ تصدق شیروانی نے جب مجلس عاملہ کے سامنے ہماری وکالت کی تو اس کا ممبروں پر بڑا اثر ہوا، اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ میری وکالت سے ہوتا بہت کچھ رُک رُک کر لیکن یہ جان کر کہ انکار کیا نہیں جا سکتا، مجلس عاملہ نے صوبہ کی کمیٹی کو یہ اختیار دیدیا کہ جس علاقہ میں چاہے لگان اور مالگذاری کا ادا کرنا رُکوا دے۔ مگر ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا کہ صوبہ والے جہاں تک ہو سکے اس بات سے بچیں اور صوبہ کی حکومت سے بات چیت جاری رکھیں۔

یہ نامہ و پیام کچھ دنوں ہوا کیا، مگر بے نتیجہ۔ میرا خیال ہے کہ اس سے الہ آباد ضلع میں چھوٹ کی تعین کچھ بہتر ہو گئی۔ حالات معمولی ہوتے تو ممکن تھا کہ کوئی تصفیہ بھی ہو جاتا یا کم سے کم لڑائی تو ٹل ہی جاتی۔ اس لئے کہ اختلاف خیال کی خلیج تنگ ہو رہی تھی۔ لیکن حالات بہت غیر معمولی تھے اور دونوں طرف، حکومت کی طرف بھی اور کانگریس کی طرف بھی، یہ گمان تھا کہ جو مقابلہ سامنے آرہا ہے وہ ٹالے نہیں ٹل سکتا۔ اور یہ نامہ و پیام سب بے حقیقت ہے۔ جو قدم بھی اٹھتا تھا ادھر سے ہو یا اُدھر سے، تو سمجھا یہ جاتا تھا کہ فریق مخالف اپنے مورچہ کی مضبوطی کی



تدبیریں کررہا ہے۔ حکومت کی تیاریاں تو چھپے چھپے رازمیں پوری ہوسکتی تھیں اور چنانچہ ہوئیں بھی۔ ہماری ساری قوت عام لوگوں کے حوصلوں اور امنگوں کی بلندی پرمنحصر تھی اور اسے خفیہ کارروائیوں سے پیدا کرنا یا ابھارنا معلوم۔ ہم میں سے بعض (اور ان مجرموں میں میں بھی تھا!) اپنی تقریروں میں بار بار کہہ چکے تھے کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، جلد ہی بہت سی آزمائشوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہم اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ان مصیبتوں کے لئے تیار رہے اور اس وجہ سے لوگ ہمیں جنگ جو بتاتے تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ کے کانگریسی کام کرنے والے حقیقی واقعات کا سامنا کرنے سے بچتے ہیں اور امید رکھتے تھے کہ جیسے بھی ہو پھر مقابلہ کی نوبت نہ آئے گی۔ جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں ان کی توجہ گاندھی جی کے لندن میں ہونے کی وجہ سے اُدھر بٹ گئی تھی لیکن پھر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی اس بےعملی کے باوجود واقعات تھے کہ بڑھتے چلے آتے تھے، خصوصاً بنگال میں، صوبہ سرحدی میں اور صوبہ متحدہ میں۔ چنانچہ نومبر میں تو بہتوں کو دکھائی دینے لگا تھا کہ توڑ کا وقت آن پہنچا۔

صوبہ کی کانگریس کمیٹی نے اس ڈر سے کہ کہیں واقعات متوقع وقت سے پہلے سامنے نہ آجائیں اور جنگ شروع نہ ہوجائے اپنے کچھ کچے انتظامات بھی کرلئے تھے۔ الہ آباد کی کمیٹی نے ایک کسان سبھا کی جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اگر بہتر شرائط نہ حاصل ہو پائیں تو کسانوں کو یہ مشورہ دینا چاہیئے کہ لگان اور مالگذاری ادا کرنا بند کردو۔ اس قرارداد سے صوبہ کی حکومت بہت بگڑی اور اسے وجہ جنگ قرار دے کر انھوں نے کہہ دیا کہ بس اب ہم تم سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس طرز عمل کا اثر ادھر صوبہ کی کانگریس پر بھی ہوا۔ انھوں نے اسے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ جانا اور جلدی جلدی اپنی تیاریاں شروع کردیں۔ الہ آباد

میں ایک کسان سبھا اور منعقد ہوئی اور اس میں پہلے سے ذرا زیادہ سخت اور واضح قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں کسانوں سے کہا گیا تھا کہ مزید گفتگو کے ختم ہونے اور بہتر شرطوں کے طے پانے تک سب ادائیگیاں روک دو۔ اس وقت بھی ہم نے جو رویہ اختیار کیا، اور اس وقت کیا بالکل آخر تک، وہ یہ نہیں تھا کہ لگان ادا ہی نہ کیا جائے بلکہ یہ تھا کہ مناسب لگان ادا کیا جائے ہم برابر نامہ و پیام کی درخواست بھی کرتے رہے، ہر چند کہ دوسرا فریق تو نہایت طنطنہ کے ساتھ ہمیں چھوڑ کر الگ جا چکا تھا۔ الہ آباد والی قرارداد زمینداروں اور اسامیوں کے لیے یکساں تھی۔ مگر ہم جانتے تھے کہ دراصل اس کا اطلاق صرف اسامیوں اور کچھ چھوٹے چھوٹے زمینداروں ہی پر ہوگا۔

نومبر کے آخر اور دسمبر ۱۹۳۱ء کے شروع میں صوبجات متحدہ میں صورت حال یہ تھی۔ ادھر بنگال اور صوبہ سرحدی میں بھی معاملات دگرگوں تھے۔ بنگال میں تو ایک نیا اور سخت ہمہ گیر آرڈیننس نافذ ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ سب نشانیاں امن کی نہ تھیں، جنگ کی تھیں۔ اور سوال بس یہ تھا کہ گاندھی جی کب واپس آئیں گے؟ حکومت نے لتنے دنوں سے جس یلغار کی تیاری کی تھی کیا اس کے شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی ہندوستان پہنچ جائیں گے؟ یا اس وقت آئیں گے کہ ان کے ساتھی قید میں پہنچ چکے ہوں گے اور معرکہ چل رہا ہوگا؟ معلوم ہوا کہ وہ واپس آرہے ہیں اور سال کے آخری ہفتہ میں بمبئی پہنچ جائیں گے۔ ہم میں سے ایک ایک، کیا صدر مقام پر، کیا صوبوں میں، کانگریس کا ایک ایک کارکن چاہتا تھا کہ ان کی واپسی تک معرکہ کو ٹالے رکھو اس معرکہ کے خیال سے یہ بہتر تھا کہ ہم ان سے مل لیتے

ان سے ہدایت اور مشورہ لے لیتے۔ لیکن یہ ایک دور تھی جس میں ہم بے بس تھے کہ چال برطانوی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

(۴۰)

عارضی صلح کا خاتمہ

صوبجات متحدہ میں اپنی مشغولیت کے باوجود مجھے عرصہ سے یہ فکر تھی کہ طوفان کے جو دو مرکز اور ہیں، صوبہ سرحد اور بنگال کسی طرح وہاں پہنچوں۔ جی چاہتا تھا کہ موقع پر جاکر حالات کا مطالعہ کروں اور پرانے ساتھیوں سے بھی ملوں، کہ ان میں سے بہتوں سے تو اب کوئی دو سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سب سے زیادہ میری خواہش یہ تھی کہ ان صوبوں کے لوگوں نے جو ہمت اور شجاعت دکھائی ہے اور قومی جنگ میں جو قربانیاں کی ہیں ان پر خود جاکر اپنا خراج عقیدت پیش کروں۔ اس زمانہ میں صوبہ سرحد تو میری پہنچ سے باہر تھا، اس لئے کہ حکومت ہند اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی ممتاز کانگریسی وہاں جائے، اور حکومت کی اس ناپسندیدگی کے باوجود ہم جانا نہیں چاہتے تھے کہ کہیں خواہ مخواہ کوئی گتھی نہ پڑ جائے۔

بنگال میں معاملات بد سے بدتر ہوتے جاتے تھے اور اگرچہ دل اس صوبہ کی طرف بہت کھنچتا تھا مگر جانے سے پہلے میں بہت کچھ جھجکا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں بے بس ہوں گا اور کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔ اس صوبہ میں دو کانگریسی جماعتوں میں مدت سے ایک افسوسناک جھگڑا چلا آتا تھا۔ باہر کے کانگریس والے اس سے ڈرتے تھے اور الگ الگ رہتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں خود ایک طرف سے یا دوسری طرف سے اس جھگڑے میں الجھ نہ جائیں۔ یہ طریقہ تھا کمزوری کا اور وہی شتر مرغ کا سا۔ اس سے نہ بنگال میں سکون پیدا ہو سکتا تھا نہ وہاں کے

مسائل حل ہو سکتے تھے۔ گاندھی جی کے لندن جانے کے کچھ عرصہ بعد دو واقعات ایسے پیش آئے کہ ہمارے ہندوستان کی توجہ بنگال کے معاملات کی طرف ہوگئی۔ یہ حادثے ہجلی اور چاٹ گام میں ہوئے تھے۔

ہجلی میں نظر بندوں کے رکھنے کے لئے ایک خاص جیل تھا۔ سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ اس جیل میں بلوہ ہوا تھا، نظر بندوں نے جیل کے اسٹاف پر حملہ کیا، اور اسٹاف والے گولی چلانے پر مجبور ہوئے۔ ایک نظر بند گولی سے مارا گیا اور زخمی تو بہتیرے ہوئے۔ واقعہ کے فوراً ہی بعد مقامی طور پر ایک سرکاری تحقیقات ہوئی جس میں اسٹاف والوں کو گولی چلانے اور اس کے نتایج سے بالکل بری الذمہ کر دیا گیا لیکن اس واقعہ میں بہت سی نرالی باتیں تھیں، بعض واقعات جو رفتہ رفتہ ظاہر ہوئے تو وہ سرکاری بیان سے مطابقت نہ کھاتے تھے، لہذا تفصیلی تحقیقات کے لئے بڑا سخت مطالبہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں جو عام سرکاری رسم ہے اس کے بالکل خلاف حکومت بنگال نے اعلیٰ عدالتی عہدہ داروں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ یہ کمیٹی بالکل سرکاری تھی۔ مگر اس نے جو شہادتیں لیں اور معاملہ پر پوری طرح غور کیا تو معاملہ کو جیل کے اسٹاف کے خلاف پایا۔ انھوں نے قرار دیا کہ غلطی زیادہ تر اسٹاف کی تھی اور گولی کا چلانا ناواجب تھا۔ یوں گویا اس باب میں حکومت کے جملہ سابقہ بیانات سراسر جھوٹے پڑے۔

یوں تو ہجلی کے حادثہ میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہ تھی۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات یا حادثات ہندوستان میں کوئی نادر چیز نہیں ہیں۔ جیل کے بلووں کا ذکر اکثر پڑھنے میں آتا ہے جن میں نہتے اور بے بس قیدیوں کو مسلح نگراں اور دوسرے لوگ بہادری سے دبا دیتے ہیں۔ ہجلی میں جو غیر معمولی بات تھی وہ یہ کہ اس واقعہ نے اس قسم کے حادثات کے متعلق سرکاری بیانات کے یکطرفہ ہونے بلکہ جھوٹا ہونے کو

کھول کر ظاہر کر دیا اور لطف یہ کہ سرکاری طور پر ظاہر کر دیا۔ پہلے بھی لوگ ان سرکاری بیانات کو کچھ بہت باور نہ کرتے تھے لیکن اب تو بالکل پول ہی کھل گیا۔

ہجلی کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان بھر میں بہت سے ایسے جیل کے حادثات ہوئے ہیں، کبھی گولی چلی ہے، کبھی اور قسم کا تشدد کیا گیا ہے۔ اور کچھ عجیب بات ہے کہ ان بلووں میں ہمیشہ بس قیدی ہی ضرر اٹھاتے ہیں۔ تقریباً ہمیشہ ایک سرکاری بیان شایع ہوا ہے کہ قیدی طرح طرح کی بدکرداریوں کے مرتکب تھے اور اسٹاف سرتاسر بے قصور تھا۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ اسٹاف والوں کو محکمہ کی طرف سے کوئی سزا دی گئی ہو۔ تفصیلی تحقیقات کے سب مطالبوں کا جواب بس ٹکا سا نفی میں ملا صرف محکمہ کی طرف سے دریافت حال کو کافی سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہجلی کا سبق حکومت نے خوب اچھی طرح سیکھا تھا یعنی یہ کہ باضابطہ اور غیر جانبدار تحقیقاتیں کرانا ٹھیک نہیں اور یہ کہ الزام لگانے والا ہی بہترین فیصلہ کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ لوگ بھی ہجلی کے واقعہ سے یہ سبق سیکھیں کہ سرکاری بیانات میں بس وہ ہوتا ہے جو حکومت منوانا چاہتی ہے اصلی واقعات سے انھیں کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

چاٹ گام کا معاملہ اس سے بہت سخت تھا کسی تشدد پسند نے ایک مسلمان پولیس کے انسپکٹر کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ اس پر ہندو مسلم فساد ہوا یا کم سے کم اسے ہندو مسلم فساد بتایا گیا۔ یہ بات واضح تھی کہ معاملہ اس سے بہت کچھ زیادہ تھا اور معمولی فرقہ وارانہ فسادات سے ذرا مختلف تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ تشدد پسند کے فعل کو فرقہ داری سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو بس ایک پولیس کے افسر کے خلاف تھا بالکل اس سے قطع نظر کہ وہ افسر ہندو تھا یا مسلمان۔ پھر بھی اس قتل کے بعد کچھ ہندو مسلم فساد ضرور ہوا تھا۔ فساد کیسے شروع ہوا اور فساد کا یہ موقع کیا تھا یہ بات صاف نہ ہوئی ہر چند کہ اس باب میں ذمہ دار لوگوں نے سخت سخت الزامات لگائے

اس فساد میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بعض خاص خاص گروہوں نے مثلاً اینگلو انڈین ملازمین ریلوے نے اور دوسرے سرکاری ملازموں نے اس میں بڑا حصہ لیا اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے نہایت وسیع پیمانہ پر انتقامی کارروائیاں کیں ج۔م۔سین گپتا اور بنگال کے دوسرے رہنماؤں نے چاٹ گام کے واقعات کے متعلق معین الزامات لگائے اور مطالبہ کیا کہ ان کی تحقیقات کرلی جائے، یا ہمارے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا جائے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ نہ کرے۔

چاٹ گام کے ان ذرا غیر معمولی واقعات نے دو خطرناک امکانات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ تشدد پسندی کو یوں تو مختلف پہلوؤں سے برا بتایا جا چکا ہے، حتیٰ کے جدید انقلابی طریقہ کار کے نزدیک بھی یہ بری قرار پا چکی ہے لیکن اس کے امکانی نتایج میں سے ایک نے مجھے ہمیشہ بہت متوحش رکھا ہے یعنی ہندوستان میں غیر منظم اور فرقہ وارانہ تشدد کے پھیل جانے کے خطرہ نے۔ میں کچھ ایسا بودا ہندو نہیں ہوں کہ تشدد سے اس لیے خایف ہوں کہ وہ تشدد ہے، مگر یہ تشدد مجھے پسند نہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ابھی انتشار کی قوتیں بہت ہیں اور بے ضابطہ تشدد سے انھیں تقویت پہنچے گی اور ایک متحدہ اور منظم قوم کی تعمیر کا کام جتنا دشوار ہے اس سے دشوار تر ہو جائے گا۔ جب لوگ مذہب کے نام پر قتل کریں یا بہشت میں اپنے لیے جگہ محفوظ کرانے کے لئے تو انھیں سیاسی تشدد پسندی کا عادی بنانا ذرا خطرہ کی بات ہے۔ سیاسی قتل بھی بری چیز ہے۔ مگر پھر بھی سیاسی تشدد پسند کے ساتھ دلیل و بحث ممکن ہے اور اسے دوسری راہ پر ڈالا جا سکتا ہے اس لئے کہ گمان یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے کوشاں ہے وہ دنیاوی مقصد ہے، شخصی نہیں بلکہ قومی مقصد ہے۔ مگر مذہبی قتل اس سے بھی بری چیز ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق

دوسری دنیا سے ہے اور اس کے متعلق بحث و دلیل کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی بعض وقت ان دونوں قسموں کا فرق بہت باریک ہو جاتا ہے بلکہ تقریباً کچھ نہیں رہتا اور سیاسی قتل بھی کسی فوق الطبعی عمل سے نیم مذہبی قتل بن جاتا ہے۔

چاٹ گام میں ایک پولیس افسر کے قتل اور اس کے نتائج سے صاف صاف سامنے آ گیا کہ ایسی تشدد کی کارروائیوں میں کیسے خطرناک امکانات ہیں اور اس سے ہندوستانی اتحاد اور آزادی کو کیسا سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس قتل کے بعد جو انتقامی کارروائیاں ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں بھی فاشستی طریقے پہنچ گئے ہیں۔ اس کے بعد سے خصوصاً بنگال میں اس قسم کی انتقامی کارروائیوں کی بہت سی مثالیں پیش آ چکی ہیں اور یہاں کے یورپین اور اینگلو انڈین باشندوں میں فاشستی روح بلا شبہ پھیل چکی ہے۔ برطانوی سامراج کے بعض ہندوستانی دم چھلوں نے بھی اس روح کو اپنایا ہے۔

عجیب بات ہے کہ خود سیاسی تشدد پسندوں میں یا ان میں سے بہتوں میں یہی فاشستی روح کارفرما ہے، لیکن اس کا رخ دوسری طرف ہے۔ ان کا فاشزم قومی ہے اور یورپین، اینگلو انڈین اور بعض اوپر کے ہندوستانی طبقہ کے سامراجی فاشزم کا مد مقابل ہے۔

میں نومبر ۱۹۳۱ء میں چند روز کے لئے کلکتہ گیا۔ ان دنوں مصروفیت بہت رہی، نجی طور پر بہت سے افراد اور جماعتوں سے ملنے کے علاوہ کئی عام جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ان سب جلسوں میں میں نے سیاسی تشدد پسندی پر بحث کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ تشدد کس قدر غلط اور بے سود ہے اور ہندوستانی آزادی کے لئے کس قدر مضر ہیں نے تشدد پسندوں کو برا بھلا نہیں کہا، نہ انھیں نامرد اور بزدل بتلایا جس طرح ہمارے بعض وہ ہم وطن کہا کرتے ہیں

جن سے شاید ہی کبھی کوئی ایسا کام اتفاق سے بھی سرزد ہوا ہو جس میں بہادری یا خطرہ کا ذرا بھی شائبہ ہو۔ میں نے اسے ہمیشہ بڑی حماقت کی بات جانا ہے کہ کسی ایسے مرد یا عورت کو جو ہر دم جان جوکھوں میں ڈالتا ہو کوئی بزدل کہے۔ اس شخص پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بودے نکتہ چینوں کو جو دور سے پڑے چلاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کر سکتے ذرا اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

کلکتہ کے قیام کے آخری دن شام کو رخصت ہو کر اسٹیشن جانے سے ذرا پہلے دو نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ یہ دونوں بہت کم عمر تھے، کوئی بیس بیس سال عمر ہوگی، ذرا گھبرائے گھبرائے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مجھے خبر بھی نہ تھی کہ یہ کون تھے، مگر ان کے آتے کا مقصد میری سمجھ میں آگیا۔ یہ مجھ سے بہت خفا تھے کہ میں نے سیاسی تشدد کے خلاف تلقین کی۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانوں پر اس کا بہت بُرا اثر ہو رہا ہے اور وہ اس قسم کی مداخلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ان سے کچھ بحث ہوئی بہت جلدی جلدی میں اس لئے کہ میری روانگی کا وقت قریب تھا۔ شاید دوران بحث میں ہمارا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور مزاج میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے شاید کچھ سخت باتیں بھی ان سے کہیں۔ جب ان سے رخصت ہوا تو چلتے چلتے انھوں نے مجھے تنبیہ کی "اب آگے ذرا خیال رہے ایسی باتیں نہ ہوں ورنہ تمہارے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو اوروں کے ساتھ کیا گیا ہے"۔

میں یوں کلکتہ سے رخصت ہوا۔ رات کو جب ریل گاڑی میں لیٹا تو دیر تک ان دو لڑکوں کے گھبرائے گھبرائے چہرے نظر کے سامنے رہے۔ یہ زندگی سے لبریز اور عصبی قوت سے بھرے ہوئے تھے، کیا ہی اچھا سامان تھا اگر انھیں کوئی ٹھیک راہ پر لگا دے! مجھے افسوس تھا کہ میں نے ان سے اس قدر عجلت میں اور ذرا درشتی سے برتاؤ کیا اور جی چاہتا تھا کہ ان سے ذرا دیر تک بات چیت کا موقع ملا ہوتا شاید

میں انھیں سمجھا سکتا کہ اپنی ہونہار زندگیوں کو کسی اور راہ پر ڈالیں، ہندوستان اور آزادی کی خدمت کی کسی راہ پر کہ ان راہوں میں جرات اور قربانی کے مواقع کی کیا کمی ہے پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان نوجوانوں کا خیال آیا ہے۔ مجھے کبھی ان کے ناموں کا علم نہ ہوا نہ پھر کہیں ان کا کوئی اور پتہ چلا، اور کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ کیا معلوم وہ مر گئے کہ کالے پانی یا کسی جیل کی کسی کوٹھری میں جیتے ہیں!

دسمبر کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں دوسری کسان سبھا کا جلسہ ہوا اور میں جلدی جلدی جنوب میں کرناٹک پہنچا۔ اپنے پرانے ساتھی ہندوستانی سیوادل والے ڈاکٹر ن۔ س۔ ہرڈیکر سے ایک پرانا وعدہ تھا اسے پورا کرنا تھا۔ سیوادل قومی تحریک کے رضا کاروں والا حصہ ہے۔ اس کا انتظام بالکل الگ تھا مگر یہ برابر کانگریس کے ساتھ رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے موسم گرما میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے اسے کانگریس کے نظام میں بالکل ملانے اور اسے کانگریس کا شعبہ رضا کاران بنا لینے کا فیصلہ کیا چنانچہ یہ ہوگیا اور ہرڈیکر اور میرے سپرد اس کا کام کیا گیا۔ دل کا صدر مقام وہی صوبہ کرناٹک میں ہبلی رہا اور ہرڈیکر نے مجھے آمادہ کیا کہ وہاں جاکر دل کی مختلف تقریبوں میں شریک ہوں۔ پھر وہ مجھے کچھ دن کے لئے کرناٹک کے دورہ پر لے گئے اور مجھے ہر جگہ لوگوں کا جوش دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ واپسی میں میں شولا پور گیا جو مارشل لا کے نفاذ کی وجہ سے مشہور ہو چکا تھا۔

کرناٹک کے اس دورہ کی حیثیت ایک الوداعی رسم کی سی ہوگئی۔ میری تقریریں گویا ہنس کا آخری گیت تھیں، اگرچہ تھیں ذرا تیز و تند اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ان میں کچھ ایسی موسیقی بھی نہ تھی۔ صوبہ متحدہ سے جو خبریں آئی تھیں وہ بالکل قطعی اور واضح تھیں۔ حکومت نے وار کر دیا تھا اور وار بھی کاری۔ الہ آباد سے کرناٹک جاتے ہوئے میں کملا کے ساتھ بمبئی بھی گیا تھا۔ وہ پھر بیمار تھی۔ میں نے

بمبئی میں ان کے علاج کا انتظام کیا۔ الہ آباد سے بمبئی پہنچنے کے بعد ہی ہمیں خبر ملی تھی کہ حکومت ہند نے صوبجات متحدہ کے لیے ایک خاص آرڈننس جاری کر دیا ہے۔ گاندھی جی جہاز میں تھے اور عنقریب بمبئی پہنچنے والے تھے، مگر حکومت نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کی واپسی کا انتظار نہ کرے۔ آرڈننس کی غرض تو وہی شورش کو دبانا بتائی گئی تھی مگر اس کا جال اتنی اتنی دور تک پھینکا گیا تھا کہ ہر قسم کی سیاسی زندگی ناممکن ہوگئی تھی حد یہ کہ قدیم انجیل والی رسم کو پلٹ کر اس نے اولاد کے گناہوں پر والدین اور سرپرستوں کو سزا دینے کا اہتمام تک کیا تھا۔!

اسی زمانہ میں گاندھی جی کے اس انٹرویو کی خبر پڑھنے میں آئی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے رومانے اخبار ژورنال اطالیا کو دیا ہے۔ اس پر بڑی حیرت یوں ہوئی کہ یوں سرسری طور پر روما میں کوئی انٹرویو دے دینا گاندھی جی کی عادت کے بالکل خلاف بات تھی۔ پھر جو اس بیان کو ذرا غور سے پڑھا تو اس میں بہت سے لفظ اور فقرے ایسے ملے جو گاندھی جی کے ہو ہی نہ سکتے تھے چنانچہ قبل اس کے کہ ان کی طرف سے انکار ہوتا ہم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ انٹرویو جس شکل میں شایع ہوا ہے اس میں تو ہرگز نہیں دیا گیا ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہوگا اسے بہت توڑ مروڑ کر شایع کیا گیا ہے اتنے میں گاندھی جی کی طرف سے اس کی قطعی تردید نکلی اور ان کا یہ بیان شایع ہوا کہ انھوں نے روما میں سرے سے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں اس وقت یہ بات صاف ہوگئی کہ کسی نے گاندھی جی کے ساتھ چال چلی ہے لیکن حیرت تو اس پر ہوئی کہ برطانوی اخباروں اور سیاسی کارکنوں نے گاندھی جی کی تردید کو باور نہیں کیا اور حقارت کے ساتھ انھیں جھوٹا کہہ کہہ کر پکارا اس سے بڑا ہی دکھ ہوا اور بہت غصہ آیا۔

میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کرناٹک کا دورہ چھوڑ دوں اور الہ آباد پہنچوں

دل کہتا تھا کہ میری جگہ صوبہ متحدہ میں اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش ہے جب گھر میں یہ کچھ ہو رہا ہو تو خود دور رہنا بڑی ہی تکلیف دہ آزمائش تھی۔ لیکن میں نے فیصلہ یہی کیا کہ کرناٹک کے پروگرام کی پابندی کروں۔ بمبئی واپس آیا تو بعض دوستوں نے صلاح دی کہ گاندھی جی ٹھیک ہفتہ بھر میں آجائیں گے ان کے پہنچتے تک بمبئی ہی میں ٹھیروں۔ لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ الہ آباد سے پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے لوگوں کی گرفتاریوں کی خبر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری صوبہ کی کانفرنس کا اجلاس اسی ہفتہ میں اٹاوہ میں ہونا قرار پایا تھا۔ چنانچہ میں نے الہ آباد کی واپسی کا فیصلہ کیا کہ اگر آزاد رہا تو چھ روز بعد بمبئی لوٹ آؤں گا، گاندھی جی سے بھی مل لوں گا اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں بھی شریک ہو جاوں گا۔ کملا کو وہیں بمبئی میں بستر علالت پر چھوڑا۔

ابھی الہ آباد پہنچا بھی نہ تھا کہ چیوکی کے اسٹیشن پر نئے آرڈیننس کے ماتحت ایک حکم کی تعمیل مجھ پر کی گئی۔ الہ آباد کے اسٹیشن پر پھر اسی حکم کے مثنیٰ کی تعمیل کی کوشش کی گئی اور گھر پہنچا تو ایک تیسرے صاحب نے تیسری مرتبہ کوشش فرمائی۔ بات صاف تھی کہ بھول چوک کا احتمال بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ اس حکم نے مجھے الہ آباد میونسپلٹی کے حدود میں نظر بند کر دیا تھا اور مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں کسی عام جلسہ یا تقریب میں شریک نہ ہوں نہ کسی جلسہ میں تقریر کروں نہ کسی اخبار یا پرچہ میں کچھ لکھوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی پابندیاں تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ایسا ہی حکم بہت سے ساتھیوں کو ملا تھا جس میں تصدق شروانی بھی تھے۔ دوسرے دن صبح میں نے مجسٹریٹ ضلع کو جس نے یہ حکم جاری کیا تھا خط لکھا جس میں ان کے حکم کی رسید دی اور ان کو اطلاع دی کہ میں ان سے اس بات کی ہدایات لینے کا قصد نہیں رکھتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میں اپنے معمولی طریق پر اپنا

معمولی کام کرتا رہوں گا اور اسی کام کے سلسلہ میں میرا ارادہ ہے کہ جلد بمبئی واپس جاؤں کہ وہاں گاندھی جی سے ملوں اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہوں جس کا میں سکرٹری ہوں۔

اب ایک نئے مسئلہ کا سامنا تھا۔ صوبہ کی کانفرنس کا جلسہ اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا مقرر تھا۔ میں بمبئی سے اس ارادہ سے آیا تھا کہ جلسہ کو ملتوی کرنے کی رائے دوں گا اس لئے کہ اس کی تاریخیں گاندھی جی کے پہنچنے کی تاریخوں سے ٹکراتی تھیں اور اس لئے بھی کہ میں حکومت سے مقابلہ کو بچانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے الہ آباد واپس آنے سے پہلے ہمارے صدر شروانی کے نام صوبہ کی حکومت کا ایک تاکیدی پیام پہنچ چکا تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ کانفرنس میں دیہی مسئلہ پر بحث ہوگی یا نہیں اس لئے کہ اگر بحث ہونے والی ہو تو حکومت کانفرنس ہی کو روک دے۔ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ کانفرنس کا خاص مقصد ہی دیہی مسئلہ پر بحث کرنا تھا کہ اس سے سارے صوبہ میں ہل چل تھی۔ جلسہ کرنا اور اس مسئلہ پر بحث نہ کرنا تو حماقت اور اپنے کو معطل کر دینے کی انتہا ہوتی۔ اور بہرحال ہمارے صدر کو یا اور کسی شخص کو تو یہ اختیار تھا ہی نہیں کہ کانفرنس کو یوں پہلے سے پابند کر دے۔ حکومت کی دھمکی سے بالکل قطع نظر ہم میں سے بعض کا ارادہ خود کانفرنس کو ملتوی کرا دینے کا تھا۔ مگر اب جو یہ دھمکی ملی تو بات اور ہی ہو گئی۔ ایسے معاملوں میں ہم میں سے اکثر ذرا ضدی واقع ہوئے تھے اور یہ خیال کہ حکومت یوں جو چاہتی ہے کرواتی ہے کچھ خوش آئند نہ تھا۔ مگر بہت کچھ دلیل و بحث کے بعد ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ اپنے غرور کو دبا جائیں اور کڑوا گھونٹ پی ہی لیں کانفرنس کو ملتوی کر دیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہم سب جانتے تھے کہ جہاں تک بھی ممکن ہو گاندھی جی کے آنے تک اس جھگڑے کو جو شروع تو ہو ہی گیا تھا بڑھنے

نہ دیں ۔ ہم یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ جب آئیں تو انھیں ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہو جس میں وہ رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے سکیں ۔ ہماری طرف سے کانفرنس کے ملتوی کر دیئے جانے کے باوجود اٹاوہ میں پولیس اور فوج کا بڑا مظاہرہ ہوا، کچھ اکے دکے نمائندے بھی گرفتار کئے گئے اور فوج نے سودیشی نمایش پر قبضہ کر لیا۔

شیروانی نے اور میں نے ۲۶ر دسمبر کی صبح کو الہ آباد سے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ شیروانی کو مجلس عاملہ نے خاص طور پر بلایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے حالات پر مشورہ کرے ۔ ہم دونوں کو آرڈننس کے ماتحت حکم مل چکا تھا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ جائیں ۔ کہا یہ جاتا تھا کہ آرڈننس الہ آباد اور صوبہ متحدہ کے بعض اور ضلعوں کے دیہات میں لگان روکنے کے کام کے خلاف نافذ کیا گیا ہے، اس لئے یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آسکتی تھی کہ حکومت ہمیں ان دیہی علاقوں میں نہ جانے دے، لیکن یہ بات تو صاف تھی کہ ہم بمبئی شہر میں یہ دیہی شورش برپا نہ کرسکتے اور اگر آرڈننس کا مقصد واقعی دیہات کی شورش سے متعلق تھا تو ہمارے صوبہ سے باہر جانے پر تو اور خوش ہونا چاہیئے تھا۔ جب سے آرڈننس نافذ ہوا تھا ہم لوگوں کا طرز عمل برابر مدافعت کا تھا اور اگرچہ کہیں کہیں انفرادی طور پر احکام کی نافرمانی ہوئی تھی مگر فی الحال ہم نے اس نئے قانون سے قوت آزمائی کو ٹالا تھا جہاں تک صوبہ کی کانگریس کا تعلق تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ یہ کم سے کم اس وقت حکومت سے لڑائی کرنے سے بچنا یا اس کو ملتوی کرنا چاہتی تھی ۔ شیروانی اور میں بمبئی اسی لئے جا رہے تھے کہ وہاں گاندھی جی اور مجلس عاملہ ان معاملات پر غور کریں گے اور کسی کو خبر نہ تھی، کم سے کم مجھے تو ہرگز یقین نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا ہوگا ۔

ان سب باتوں سے تو یہ خیال ہوتا تھا کہ ہمیں بمبئی جانے دیا جائے گا اور نظر بندی کے حکم کی محض ضابطہ کی نافرمانی کو کم سے کم اس وقت حکومت گوارا کرے گی۔ مگر دل کچھ اور ہی گواہی دیتا تھا۔

ریل گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ صبح کے اخبارات میں صوبہ سرحدی کے نئے آرڈننس کا ذکر اور عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خاں صاحب کی گرفتاری کی خبر پڑھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری گاڑی بمبئی میل، یکایک بیچ کے ایک اسٹیشن ارادت گنج پر کھڑی ہو گئی جہاں معمولاً یہ گاڑی نہیں ٹھہرا کرتی تھی اور پولیس کے افسر ہمیں گرفتار کرنے کے لئے گاڑی میں چڑھ آئے۔ جیل خانے کی ایک گاڑی لائن کے پاس کھڑی تھی، شیروانی اور میں قیدیوں کی اس بند گاڑی میں سوار ہوئے اور ہچکولے کھاتے نینی پہنچے۔ انگریز پولیس کپتان جس نے ہمیں ۲۶ دسمبر کی صبح کو کہ تحفہ تحایف دینے کا دن ہوتا ہے گرفتار کیا تھا کچھ گم سُم اور افسردہ افسردہ سا تھا۔ شاید ہم نے اس غریب کا بڑا دن خراب کیا۔

غرض ہم یوں قید خانہ کو چلے۔ بقول شاعر،

"راحت و شادمانی سے اب ذرا منہ موڑو
اور کچھ دن کرب و الم کے سانس کھینچو"

(۱۴)

گرفتاریاں۔ تعزیری قوانین اور ضبطیاں

ہماری گرفتاری کے دو دن بعد گاندھی جی یورپ سے بمبئی پہنچے۔ اس وقت انھیں تازہ واقعات کا علم ہوا۔ لندن میں انھوں نے یہ تو سن لیا تھا کہ بنگال میں تعزیری قانون نافذ ہو گیا ہے اور اس سے انھیں سخت تشویش تھی لیکن یہاں پہنچ کر انھیں علم ہوا کہ صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تعزیری قوانین کی شکل میں ان کے لیے بڑے دن کے تحفے اور موجود ہیں اور ان دونوں صوبوں میں ان کے عزیز ترین رفقا گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ معاملہ حد سے گذر چکا تھا اور صلح کی تمام امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی ایک آخری کوشش کی اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کا موقع دیا جائے۔ نئی دہلی سے ان کے پاس یہ جواب پہنچا کہ چند شرائط کے باتحت ملاقات ممکن ہے۔ میرے پاس وائسرائے کے جواب کی نقل موجود نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے شرائط یہ تھیں کہ بنگال، صوبہ متحدہ، اور صوبہ سرحد کے تازہ واقعات، تعزیری قوانین' اور ان کے ماتحت گرفتاریوں کا اگر آپ کوئی ذکر نہ کریں تو تشریف لا سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی یا کسی کانگریسی رہنما کے لیے ان ممنوعہ مسائل کو چھوڑ کر جن سے سارے ملک میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وائسرائے سے باضابطہ گفتگو کرنے کا اور کونسا موضوع باقی رہ جاتا تھا اب یہ صاف ظاہر تھا کہ

حکومت ہند کانگریس کو کچل ڈالنے پر تلی ہوئی ہے اور اس سے کوئی معاملہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ورکنگ کمیٹی کو اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سول نافرمانی پھر شروع کر دے۔ اس کے ممبر جانتے تھے کہ ان کے لئے ہر وقت گرفتاری کا خطرہ ہے اس لئے فطرتاً ان کی خواہش تھی کہ جیل میں جانے سے پہلے قوم کے سامنے ایک صحیح راہ عمل پیش کر دیں۔ پھر بھی سول نافرمانی کی قرارداد محض عارضی طور پر منظور کی گئی اور گاندھی جی نے وائسرائے سے ملنے کی ایک اور کوشش کی انھوں نے وائسرائے کو دوسرا تار بھیجا کہ مجھے غیر مشروط ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ اس کے جواب میں حکومت نے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر دونوں کو گرفتار کر لیا اور وہ بٹن دبا دیا جس سے سارے ملک میں تشدد کی مشین کام کرنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے اور کوئی لڑائی کا خواہشمند ہو یا نہ ہو لیکن حکومت لڑنے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔

ہم جیل میں تھے۔ اور یہ تمام خبریں مبہم اور بے ربط شکل میں ہمارے پاس پہنچی تھیں۔ ہمارا مقدمہ نیا سال شروع ہونے تک ملتوی ہو گیا تھا۔ اس لئے زیر سماعت حوالاتی کی حیثیت سے ہم عام قیدیوں کے مقابلہ میں باہر والوں سے زیادہ مل سکتے تھے ہم نے سنا کہ ملک میں یہ اہم بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا وائسرائے نے ملاقات سے انکار کر کے غلطی کی یا نہیں۔ گویا ان کے ملاقات کرنے یا نہ کرنے پر ہر بات کا دارومدار تھا۔ اس وقت ملاقات کا یہ مسئلہ تمام دوسرے معاملوں پر چھا گیا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر لارڈ ارون یہاں موجود ہوتے تو وہ ہرگز انکار نہ کرتے اور اگر وہ اور گاندھی جی مل بیٹھتے تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستانی اخبارات کتنی سطحی نظر سے اس مسئلہ کو دیکھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کو نظرانداز

کر رہے ہیں۔ ہندوستانی قوم پرستی اور برطانوی سامراج دراصل دو متضاد چیزیں ہیں اس لئے ان دونوں کا ٹکرانا ضروری ہے۔ تو کیا یہ جنگ چند افراد کے ذاتی رویے پر منحصر ہے؟ کیا ان دونوں تاریخی قوتوں کی ٹکر باہمی اخلاق اور دل آویز مسکراہٹ سے رُک سکتی ہے؟ گاندھی جی نے ایک خاص طرز عمل اس وجہ سے اختیار کیا کہ ہندوستان کی قومی تحریک خودکشی نہیں کر سکتی تھی یعنی زندگی اور موت کے معاملے میں بدیشیوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھی۔ اسی طرح ہندوستان کے برطانوی وائسرائے نے ایک دوسرا رویہ اس لئے اختیار کیا کہ قومی تحریک کا مقابلہ اور برطانوی مفاد کی حفاظت کی کوشش کرے۔ پھر اس کا کیا سوال ہے کہ اس وقت کون وائسرائے تھا کون نہیں تھا۔ اگر لارڈ ارون وائسرائے ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو لارڈ ولنگڈن نے کیا۔ کیونکہ دونوں برطانوی سامراج کے آلۂ کار تھے اور ذاتی طور پر مقررہ پالیسی میں محض جزوی ترمیم کر سکتے تھے لارڈ ارون خود اس وقت حکومت برطانیہ کے ایک رکن تھے اس لئے ہندوستان میں حکومت نے جو قدم اٹھایا اس میں وہ بھی شریک تھے ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کے معاملے میں کسی وائسرائے کو ذاتی حیثیت سے اچھا یا برا کہنا بالکل لغویات ہے۔ اور ہمارا ان فضولیات کو اہمیت دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو ہم حقیقت حال کو سمجھتے ہی نہیں یا جان بوجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔

۴ جنوری ۱۹۳۲ء ایک یادگار تاریخ تھی۔ اس روز دلیل اور بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ صبح تڑکے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل گرفتار کر لئے گئے اور شاہی قیدی کی حیثیت سے بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دیئے گئے۔ چار نئے تعزیری قانون نافذ ہوئے جن کی رو سے

مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں کو نہایت وسیع اختیارات مل گئے - مدنی آزادی کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ حکام اپنی مرضی سے افراد کو قید اور املاک کو ضبط کر سکتے تھے - گویا سارے ہندوستان میں ایک طرح فوجی محاصرے کا اعلان ہو گیا رہی اس محاصرے کی وسعت و شدت، وہ مقامی حکام کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی تھی ؎ا

اسی روز صوبہ متحدہ کے ضابطۂ اختیارات ہنگامی کے ماتحت نینی جیل میں ہمارے مقدمے کی پیشی ہوئی - شیروانی کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور ڈیڑھ سو روپیہ جرمانہ کی سزا ملی اور مجھے دو سال کی قید بامشقت اور پانچسو روپیے جرمانہ (بصورت عدم ادائی مزید چھ ماہ) کی سزا ہوئی -

ہم دونوں کا جرم ایک تھا - دونوں کو حکم دیا گیا تھا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ نکلیں - ایک ساتھ بمبئی جانے کی کوشش کر کے دونوں نے یکساں ان کی خلاف ورزی کی تھی - دونوں ساتھ ساتھ گرفتار کیے گئے تھے اور ایک ہی دفعہ کے ماتحت مجرم قرار دئیے گئے تھے - اس کے باوجود ہمیں سزائیں مختلف ملیں - البتہ ایک فرق ضرور تھا - میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ تحریری اطلاع دے دی تھی کہ میں اس حکم کے باوجود بمبئی جانے والا ہوں - شیروانی نے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی - لیکن ان کی روانگی کا بھی سب کو علم تھا اور اخباروں میں بھی یہ خبر شائع ہو گئی تھی - سزا کا حکم سننے کے بعد ہی

؎ا - وزیر ہند سرسیمول ہور نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو دارالعلوم میں یہ اقرار کیا تھا "مجھے تسلیم ہے کہ ہم نے جو تعزیری قانون نافذ کئے ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور ہندوستانیوں کی زندگی کے قریب قریب ہر شعبہ پر حاوی ہیں"

سیر وائی نے مجسٹریٹ سے ایک نہایت ہی دلچسپ سوال کیا جس سے سارا مجمع کھل کھلا کر ہنس پڑا اور بیچارہ مجسٹریٹ گھبرا گیا۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا مجھے کم سزا دینے میں فرقہ دارانہ تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔؟

اسی تاریخی دن یعنی ۲۶ جنوری کو سارے ملک میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے ہم سے تھوڑی دور پر یعنی الٰہ آباد شہر میں بہت بڑے مجمع کا پولیس اور فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ حسب معمول لاٹھی چارج ہوا جس سے بہت سے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ سول نافرمانی کے قیدیوں سے جیل بھر بھرنے شروع ہو گئے پہلے یہ ڈسٹرکٹ جیلوں میں اور نینی کے سنٹرل جیل میں بھیجے گئے اور جب وہاں گنجائش نہیں رہی تو دوسری سنٹرل جیلوں کی باری آئی۔ آخر جیل بھر گئے اور بڑے بڑے جیل کیمپ کھولنا پڑے۔

نینی میں ہمارے چھوٹے سے احاطے میں بہت کم لوگ آئے" یعنی صرف میرے پرانے ساتھی نربدا پرشاد، رنجیت پنڈت اور میرے رشتہ کے بھائی موہن لال نہرو چند روز کے بعد بارک نمبر ۶ کی اس چھوٹی سی برادری میں ایک اور مہمان کا اضافہ ہوا جن کے آنے سے ہم سب کو بہت تعجب ہوا۔ یہ ہمارے سیلون کے نوجوان دوست برنرڈ الیودہارے تھے جو حال ہی میں انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔ میری بہن نے انھیں خوب سمجھا دیا تھا کہ تم مظاہروں میں نہ پڑنا۔ لیکن جوش میں آ کر وہ کانگریس کے جلوس میں شریک ہو گئے اور قیدیوں کی گاڑی نے انھیں جیل خانہ پہنچا دیا۔ کانگریس خلاف قانون دے دی گئی۔ فہرست میں سب سے اوپر ورکنگ کمیٹی کا نام تھا۔ اس کے بعد صوبوں کی کمیٹیاں اور بے شمار مقامی کمیٹیاں تھیں۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ وہ تمام ادارے بھی خلاف قانون ٹھیرائے گئے جو اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے یا محض اس کے

ہمدرد تھے یا انتہا پسند سمجھے جاتے تھے۔ کسان سبھائیں، کاشتکاروں کی انجمنیں نوجوانوں کی انجمنیں، طلبا کے ایسوسی ایشن۔ انتہا پسند سیاسی ادارے، قومی یونیورسٹیاں اور اسکول، قومی اسپتال، سودیشی ادارے، کتب خانے سبھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ فہرست بہت طویل تھی اور ہر بڑے صوبہ کے ذیل میں سینکڑوں نام درج تھے۔ سارے ہندوستان کی میزان لگائی جاتی تو یقیناً ہزاروں تک پہنچتی خلاف قانون اداروں کی اتنی زبردست تعداد خود کانگریس اور قومی تحریک کی کامیابی کی ایک روشن دلیل تھی۔

میری بیوی بمبئی میں بیمار پڑی تھیں اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ میری والدہ اور دونوں بہنیں بہت جلد ایک ایک سال کی سزا پاکر جیل پہنچ گئیں۔ ہمیں نئے آنے والوں کے ذریعہ سے باہر کی تھوڑی بہت خبریں مل جاتی تھیں یا کچھ حال ایک مقامی ہفتہ وار پرچہ سے جو ہمیں پڑھنے کو ملتا تھا معلوم ہو جاتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں قیاس سے کام لینا پڑتا تھا۔ کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ خبروں کا احتساب بڑی سختی سے ہوتا ہے اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو ہمیشہ بھاری سزاؤں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بعض صوبوں میں تو گرفتار ہونے والوں یا سزا پانے والوں کا نام لکھنا بھی جرم تھا۔

غرض ہم نینی جیل میں باہر کی جنگ سے دور تھے پھر بھی ہمارا دل اسی میں پڑا تھا، ہم وقت گذارنے کے لئے چرخہ کاتتے، کتابیں پڑھتے، دوسرے مشاغل میں مصروف رہتے ادھر ادھر کی باتیں کرتے لیکن دل میں ہر وقت یہی سوچتے رہتے کہ جیل خانے کی دیواروں کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غرض ہم اس تحریک سے جدا ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ کبھی انتظار کی خلش

دل کو بے چین کرتی، کسی غلطی پر غصہ آجاتا، کمزوری یا کمینہ پن کی حرکت سے نفرت ہوتی۔ اور کبھی ہم جذبات سے الگ ہوکر نہایت سکون اور غیر جانبداری سے تمام حالات پر غور کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ جب بڑی بڑی قوتیں کام کر رہی ہوں اور قہر و غضب کی چکیاں چل رہی ہوں تو چھوٹی چھوٹی انفرادی غلطیاں اور کمزوریاں لازمی ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ دیکھیں اس جنگ و جدل اس شور شغب، اس دلیرانہ جوش و خروش، اس ظالمانہ جبر و تشدد اور نفرت انگیز بزدلی کا کیا رنگ رہتا ہے اور ان سب چیزوں کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ مستقبل ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا اور یہی اچھا تھا، بلکہ ہم قیدیوں کو تو حال کی بھی خبر نہ تھی۔ لیکن اتنا ہم ضرور جانتے تھے کہ ہمیں جنگ و مصیبت اور قربانی کا آج بھی سامنا ہے اور کل بھی رہے گا۔

میتھو آرنلڈ نے کیا خوب کہا ہے :-

"لوگ کل میدان میں نکل کھڑے ہوں گے اور جنگ از سر نو شروع ہو جائے گی"

زینتھس[1] کا سارا میدان خون سے سرخ نظر آئے گا۔

ہکٹر[1] اور آجکس[1] پھر میدان میں اتریں گے۔

اور ہیلن[1] پھر دیوار پر کھڑے ہو کر اس خوں چکاں منظر کا تماشا دیکھے گی۔

---

[1] یونان کے شاعر ہومر نے ایتھنس اور ٹرائے کا جنگ نامہ لکھا ہے۔ اس میں زینتھس میدان جنگ کا نام ہے۔ ہکٹر اور آجکس فریقین کے سورما ہیں اور ہیلن وہ عورت ہے جس کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔

پھر ہم یا تو امن کا گوشہ ڈھونڈیں گے یا میدان جنگ میں چمکیں گے۔
کبھی اندھی امیدوں سے ابھریں گے کبھی اندھی مایوسیوں میں ڈوبیں گے۔

دل و جان سے سعی و عمل میں مصروف ہو جائیں گے مگر یہ پتہ نہ چلے گا کہ ہماری روح کا کیا حشر ہوتا ہے۔

(۴۲)

بازاری پروپگنڈا

۱۹۴۲ء کے ابتدائی مہینوں میں اور بہت سی عجیب باتوں کے ساتھ ایک یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت دل کھول کر بازاری طرز کے پروپگنڈے سے کام لے رہی تھی۔ چھوٹے بڑے تمام افسر بڑی بلند آہنگی سے دعوے کرتے تھے کہ ہم بڑے نیک اور امن پسند ہیں اور کانگریس بڑی پاپی اور جھگڑالو ہے۔ ہم جمہوریت کے حامی ہیں اور کانگریس ڈکٹیٹری کی مؤید ہے۔ اس تقدس کے جوش میں شاید انھیں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد نہیں رہیں جیسے تعزیری قوانین کا نفاذ، ہر طرح کی آزادی کا سلب کر لینا، اخباروں اور مطبعوں کا گلا گھونٹنا، بلا مقدمہ چلائے لوگوں کو قید میں ڈال دینا، جائداد اور روپے کی ضبطی یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جو آئے دن دیکھنے میں آتی تھیں۔ اور شاید وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کن اصولوں پر قائم ہے۔ سرکاری وزرا، جو ہمارے ہی ہم وطن تھے، جوش خطابت میں یہ فرماتے تھے کہ کانگریس والے تو اپنے ذاتی اغراض حاصل کرتے ہیں (جیل میں!) اور ہم چند ہزار روپیہ ماہوار کی حقیر تنخواہ پر دن رات قوم کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ ماتحت عدالتیں نہ صرف ہمیں بھاری بھاری سزائیں دیتی تھیں بلکہ اس موقع پر وعظ و نصیحت بھی فرماتی تھیں۔ اور کبھی کبھی کانگریس اور اس کے کارکنوں کو جی بھر کے گالیاں بھی دیتی تھیں۔ سر سیموئل ہور نے بھی وزارت ہند کی کرسی پر بیٹھ کر

یہ گل افشانی فرمائی تھی کہ کتے بھونکا کرتے ہیں اور قافلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شاید وہ اس وقت یہ بھول گئے تھے کہ سب کتے تو جیل میں بند تھے اور وہاں آسانی سے بھونک نہیں سکتے تھے۔ اور جو باہر تھے ان کے منہ پر کس کر چھینکا چڑھا دیا گیا تھا۔

سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ کانپور کے فساد کا الزام کانگریس کے سر تھوپا گیا۔ اس خوفناک فساد کی تباہ کاریوں کو بیان کر کے بار بار یہ کہا گیا کہ کانگریس اس کی ذمہ دار ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صرف کانگریس ہی نے شرافت اور ہمدردی سے کام لیا۔ اس کے ایک لائق ترین فرزند نے امن قائم کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور کانپور کی ہر جماعت اور ہر فرقہ نے اس کا ماتم کیا۔ کانگریس کے کراچی کے اجلاس میں جب یہ خبر پہنچی تو فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے بہت تفصیلی تحقیقات کی۔ مہینوں کی محنت کے بعد اس نے ایک ضخیم رپورٹ تیار کی جسے حکومت نے فوراً ممنوع قرار دے دیا اس کے تمام مطبوعہ نسخے ضبط کر لئے اور شاید انھیں ضائع کر دیا۔ ہماری تحقیقات کے نتائج کو اس طرح دبا دینے کے باوجود سرکاری معترضین اور انگریزوں کے اخبارات برابر یہی رٹ لگائے گئے کہ یہ فساد کانگریس کی وجہ سے ہوا۔

ایک دن اس معاملہ اور دوسرے معاملات کی حقیقت آشکارا ہو کر رہے گی۔

لیکن بعض اوقات جھوٹ بہت دن تک سچ سے آگے آگے رہتا ہے۔

جھوٹ اپنا کام کر کے مٹ جائے گا۔

سچ بہت بڑا ہے اور اُسی کا بول بالا ہوگا۔
مگر اس وقت جب اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اس وقت جنگ کی سی حالت تھی اس لئے شاید جذبات کا یہ ہیجان ایک قدرتی چیز تھی اور یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ حکومت سچائی یا ضبط سے کام لے گی مگر پھر بھی ہیجان کی یہ شدت حیرت انگیز تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کی حکمران جماعت کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور اس نے کس طرح اپنے جذبات کو ایک مدت سے دبا رکھا تھا غالباً اس کے اس غیظ و غضب کا سبب ہمارا کوئی قول یا فعل نہیں تھا بلکہ خود اس کا یہ خوف کہ سلطنت ہاتھ سے نکلی جارہی ہے۔ جن حکمرانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہوتا ہے وہ اس طرح بدحواس نہیں ہوجایا کرتے، تصویر کا دوسرا رخ اس رخ سے بہت مختلف تھا دوسری طرف خاموشی طاری تھی۔ یہ کوئی اختیاری اور پروقار خاموشی نہیں تھی بلکہ قید خانہ کی، خوف کی، اور عالمگیر احتساب کی خاموشی تھی۔ اگر اس طرح جبر و تشدد نہ کیا جاتا تو ممکن ہے دوسری طرف بھی یہی ہیجان نظر آتا اور اسی طرح مبالغے اور بدزبانی سے کام لیا جاتا۔ البتہ گھٹے جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ضرور تھا یعنی وہ خلاف قانون خبر کے پرچے جو مختلف شہروں سے کبھی کبھی شائع ہوتے تھے۔

انگریزوں کے جو اخبار ہندوستان میں ہیں، وہ بھی اس بازاری پروپاگنڈے میں بڑے شوق سے شریک ہوگئے اور ان خیالات کو علی الاعلان ظاہر کرنا شروع کردیا جو شاید مدت سے وہ اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے۔ عموماً انھیں اپنی تحریر میں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کیوں کہ ان کے ناظرین میں ہندوستانیوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن اس طوفان میں یہ احتیاط بھی

بہہ گئی۔ اور ہمیں انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے دلوں کی گہرائی کی ایک جھلک نظر آگئی۔ ہندوستان میں ایک ایک کرکے بیشتر اینگلو انڈین اخبار ختم ہو چکے ہیں۔ صرف تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں وہ نہایت اعلیٰ معیار کے اخبار ہیں۔ ان کا خبروں کا انتظام بھی نہایت معقول ہے اور ترتیب اور طباعت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ دنیا کی سیاست کے متعلق ان میں جو افتتاحیہ مقالے شائع ہوتے ہیں گو ان کا نقطۂ نظر رجعت پسندانہ ہوتا ہے لیکن بڑی قابلیت سے لکھے جاتے ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخباری حیثیت سے وہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہیں۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی مسائل میں وہ اپنی سطح سے بہت نیچے گر جاتے ہیں اور ایسی یک طرفہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور جب قومی تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ جانب داری وحشت اور سوقیانہ پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ حکومت ہند کی آواز کو دہرانے لگتے ہیں اور اس مسلسل پروپاگنڈے میں ضبط اور احتیاط کے تمام پردے اٹھا دیتے ہیں۔

ان چند منتخب اینگلو انڈین اخباروں کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار عموماً ادنیٰ قسم کے ہیں۔ ان کی مالی حالت خراب ہے اور ان کے مالک اسے سنبھالنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ان کا روز کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے اور بیچارے اداری عملے کو بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کی طباعت وغیرہ خراب ہوتی ہے اور اشتہارات بھی نامناسب قسم کے ہوتے ہیں زندگی کے عام مسائل اور سیاسیات میں یہ والہانہ روش رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہماری قوم جذبات پرست واقع ہوئی

ہے کچھ یہ کہ (جہانتک انگریزی اخباروں کا تعلق ہے) انگریزی ان کے لئے بیسی زبان ہے اور اس میں ایسا طرز بیان اختیار کرنا کہ سادگی کے ساتھ زور بھی ہو آسان نہیں ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک محکوم رہتے رہتے ور جبر و تشدد سہتے سہتے ہمارے جذبات گھٹ کر اور دب کر رہ گئے ہیں اور جب ذرا سا موقع ملتا ہے اُبل پڑتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے انگریزی اخباروں میں طباعت ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے مدراس کا ہندو سب سے بہتر ہے۔ اس کی وہ شان ہے جو ایک ثقہ اور تقدس مآب بوڑھی بن بیاہی عورت کی ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے کوئی ایسا ویسا لفظ زبان سے نکالا اور وہ حیا و غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گئی۔ ہندو خاص طور پر اوسط طبقے کے شہریوں کا پرچہ ہے اور اس کا کاروبار خوب جما ہوا ہے۔ زندگی کے تاریک پہلو حیات کی کشمکش اور نشیب و فراز سے اسے کوئی واسطہ نہیں بہت سے اعتدال پسند اخباروں کا معیار بھی یہی ثقاہت اور تقدس مآبی ہے۔ یہ رنگ تو وہ پیدا کر لیتے ہیں لیکن ہندو کی اور خصوصیات نہیں پیدا کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے روکھے پھیکے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت نے اس حملہ کے لئے عرصہ سے تیاری کی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ پہلی ہی ضرب نہایت شدید اور موثر ہو۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ نئے نئے تعزیری ضابطوں سے تحریک کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکے۔ گویا اس وقت پیش قدمی کانگریس کی طرف سے ہوئی تھی اور حکومت مدافعت کرتی تھی۔ ۱۹۳۲ء کا طریقہ اس کے بالکل برعکس تھا یعنی اب حکومت نے چاروں طرف سے حملہ شروع کر دیا۔ سارے ملک کے لئے اور اس کے علاوہ علیحدہ علیحدہ تمام صوبوں کے لئے طرح طرح کے

تعزیری ضابطے نافذ کئے اور ان کی رو سے حکام کو دنیا بھر کے اختیارات دیدیئے ادارے خلاف قانون قرار دے گئے عمارتیں، جائداد، موٹریں اور بینک کی رقمیں ضبط کرلی گئیں۔ جلسہ اور جلوس کی ممانعت کردی گئی۔ اور اخبار اور مطبعے پوری طرح جکڑ دئے گئے۔ دوسری طرف بہ خلاف ۱۹۳۰ء کے گاندھی جی کی قطعی رائے تھی کہ سول نافرمانی فی الحال شروع نہ کی جائے اور ورکنگ کمیٹی کے اراکین بھی زیادہ تر ان کے ہم خیال تھے۔ بعض لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ چاہے ہم جنگ کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں مگر جنگ یقینی ہے اس لئے ہمیں اس کیلئے تیار رہنا چاہئے صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں کشمکش برابر بڑھ رہی تھی اس لئے لوگوں کا ذہن آنے والی جنگ کی طرف خود بخود منتقل ہونے لگا تھا۔ لیکن بحیثیت مجموعی تعلیم یافتہ اور اوسط طبقہ اس وقت جنگ کے خیال میں نہ تھا گو وہ اس کو بالکل ناممکن نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے کیوں لوگوں کو یہ امید بندھ گئی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی پر جنگ ٹل جائے گی ظاہر ہے کہ خود ان کی خواہش نے خیال کی صورت اختیار کرلی تھی۔

غرض ۳۲ء کے شروع میں حکومت نے سراسر پیش قدمی کی اور کانگریس اوّل سے آخر تک مدافعت کرتی رہی، تعزیری ضوابط کے یکایک نافذ ہوجانے اور سول نافرمانی کے شروع ہوجانے سے اکثر مقامی کارکن ہکا بکا رہ گئے۔ پھر بھی کانگریس کی دعوت پر چاروں طرف سے لبیک کی آواز بلند ہوگئی اور ہر طرف سے سول نافرمانی کرنے والے اُمڈ آئے میرا تو یہ خیال ہے کہ ۳۲ء میں حکومت برطانیہ کا ۳۰ء سے کہیں زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کیا گیا کیونکہ ۳۰ء میں عموماً سب کہیں اور خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں نمود و نمائش زیادہ تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اگرچہ ۳۲ء

میں لوگوں نے پہلے سے زیادہ استقلال کا ثبوت دیا اور غیر معمولی طور پر پُرامن رہے لیکن سنہ ۳۰ء کے مقابلہ میں جوش بہت کم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ سنہ ۳۰ء کی جنگ میں ایک خاص شان تھی جو اب باقی نہیں رہی تھی۔ حکومت نے اپنی پوری طاقت سے کانگریس کا مقابلہ کیا۔ سارے ہندوستان میں گویا مارشل لا جاری تھا۔ اس کے بعد کانگریس کو آزادیٔ عمل یا پیش قدمی کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی وار نے اسے اور اس کے اوسط طبقہ کے حامیوں کو جو اس کے خاص ہمدرد تھے بیکار کر دیا۔ اس کی چوٹ ان کی جیبوں پر پڑی اور انھیں یقین ہو گیا کہ جو کوئی سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوگا یا کسی طرح اس کی مدد کرے گا، اسے نہ صرف اپنی آزادی سے بلکہ شاید تمام املاک سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ صوبہ متحدہ میں ہم پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا کیونکہ یہاں تو کانگریس غریبوں کی جماعت ہے البتہ بمبئی جیسے بڑے بڑے شہروں میں املاک کی ضبطی کے خوف نے بڑا زبردست اثر ڈالا کیونکہ اس سے تاجروں کا طبقہ تو بالکل برباد ہو جاتا اور اونچے پیشوں کے لوگوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ محض اس دھمکی نے اور کبھی کبھی عمل میں بھی لائی گئی، شہر کے تمام کھاتے پیتے لوگوں کو سُن کر دیا۔ چنانچہ بعد میں مجھے ایک سیدھے سادے لیکن خوش حال تاجر کا ایک عجیب واقعہ معلوم ہوا۔ اس بیچارے کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا بجز اس کے کہ شاید وہ کبھی کچھ چندہ دے دیتا تھا۔ مگر پولیس نے اسے دھمکی دی کہ تم پر پانچ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا اور لمبی سزا الگ ہوگی۔ اس قسم کی دھمکیاں بہت عام تھیں۔ اور یہ خالی خولی دھمکیاں نہ تھیں کیونکہ اس وقت پولیس کا راج تھا اور آئے دن دیکھنے میں آتا تھا کہ وہ گرجتی ہی نہیں بلکہ برستی بھی ہے۔

میرے نزدیک حکومت کے اس رویہ پر کسی کانگریسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے اس انتہائی پر امن تحریک کے خلاف جو جبر و تشدد اختیار کیا وہ تہذیب کے ہر معیار سے گرا ہوا اور سخت قابل اعتراض تھا۔ اگر ہم عملی جدوجہد اور انقلابی طریقے اختیار کریں گے تو چاہے وہ کتنے ہی پُر امن کیوں نہ ہوں ان کا مقابلہ ضرور ہوگا ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انقلاب کا کھیل نہیں کھیلا جا سکتا۔ لیکن بعض حضرات انقلاب بھی چاہتے ہیں اور مقابلہ سے بھی بچتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے جو شخص انقلابی جدوجہد کی راہ میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے خوش حال لوگ بہت کم انقلاب پسند ہوتے ہیں گو ان میں سے ایک آدھ ایسے بھی نکل آتے ہیں، وہ حضرات جو دنیاوی عقل رکھتے ہیں انھیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور ان پر اپنے طبقے سے غداری کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔

عام لوگوں کو جن پر قومی تحریک اصل میں منحصر تھی دبانے کے لئے حکومت کو اور تدبیروں سے کام لینا پڑا۔ اس لئے کہ ان کے پاس نہ موٹریں تھیں نہ بینکوں میں رقم تھی نہ کوئی اور ایسی املاک تھی جس پر قبضہ کیا جا سکتا تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے طرح طرح کی سختیاں شروع کیں اور ان کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حضرات بھی جو (بقول ایک مصنف کے جس کی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے) "سرکاری آدمی" کہلاتے ہیں خوب جھنجوڑے گئے۔ ان میں سے بعض نے یہ سمجھ کر کہ نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے کچھ دن سے کانگریس سے لگاوٹ کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ بھلا حکومت اسے کب برداشت کرنے والی تھی۔ اس کے نزدیک مجہول وفاداری کافی نہیں تھی

بقول فریڈرک کوپرے جو ۵۷ء کی شورش کے سلسلہ میں مشہور رہیں، حکومت "کامل عملی اور ثبوتی وفاداری چاہتی تھی۔ اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ رعایا کی رواداری کے برتے پر قائم رہے" ایک سال پہلے مسٹر لائڈ جارج نے اپنے پرانے رفقاء کار یعنی برطانوی لبرل پارٹی کے لیڈروں کے متعلق جو "نیشنل گورنمنٹ" میں شامل ہوگئے تھے یہ فرمایا تھا کہ "وہ گرگٹ کی طرح جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا ہی رنگ بدل لیتے ہیں" ہندوستان کے نئے حالات میں اب غیر جانبداری کا رنگ نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے ہمارے بعض ہم وطن وفاداری کے گہرے اور شوخ رنگوں میں جو حکومت کو مرغوب تھے، ڈوب گئے اور بڑی دھوم دھام سے ہمارے حکمرانوں سے اظہار محبت کرنے لگے۔ انھیں تعزیری ضوابط، فوجی قواعد، مغرب کے بعد گھر سے نہ نکلنے کے احکام، اور دوسری بے شمار مخالفتوں اور مزاحمتوں کا تو کوئی خوف تھا نہیں، کیونکہ سرکاری طور پر اعلان ہو چکا تھا کہ یہ سب کچھ باغیوں اور مخالفوں کے لئے ہے۔ وفاداروں کو خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مزے سے بیٹھے اس شورش اور ہنگامے کا تماشہ دیکھتے تھے جو چاروں طرف برپا تھا۔ اور اس خوف وہراس سے ذرا بھی متاثر نہ تھے جو ان میں سے بہت سے ہم وطنوں پر طاری تھا۔ گویا وہ "وفادار چرواہے" کی ہیروئن "گلو" کے ہم زبان ہو کر کہتے تھے :-

"ایک چیز کا تو مجھے خوف ہی نہیں
یعنی مجھ پر دست درازی کرنا ناممکن ہے
کیونکہ میں تو پہلے ہی سے راضی ہوں"

نہ جانے کیوں حکومت کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کانگریس خاص کر کے عورتوں کو جیل بھیجنا چاہتی ہے اس امید میں کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا

جائے گا اور انھیں معمولی سزائیں ملیں گی۔ یہ محض احمقانہ خیال تھا۔ دنیا میں کوئی بھی اپنی عورتوں کو جیل میں جھونکنا نہیں چاہتا۔ عموماً عورتوں نے اپنے والد، خاوند یا بھائیوں کی مرضی کے خلاف، یا کم سے کم بغیر ان کی خوشی کے اس تحریک میں حصہ لیا۔ بہر حال حکومت نے عورتوں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر اور جیل خانہ میں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر کے اس کی انتہائی کوشش کی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ میری بہنوں کی گرفتاری اور سزا یابی کے بعد ہی چند پندرہ سولہ برس کی لڑکیاں الہ آباد میں یہ غور کرنے کے لئے جمع ہوئیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ انھیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ لیکن وہ جوش سے سرشار تھیں اور انھیں مشورہ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک نجی مکان میں جمع تھیں کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ہر ایک کو دو سال قید سخت کی سزا دے دی گئی۔ یہ تو بہت معمولی سا واقعہ تھا اسی قسم کے متعدد واقعات ہندوستان کے کونے کونے میں آئے دن ہو رہے تھے۔ جن عورتوں اور لڑکیوں کو تحریک کے سلسلہ میں سزا ہوئی انھیں جیل خانہ میں مردوں سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ میں نے بہت سے تکلیف دہ واقعات سنے ہیں۔ لیکن سب سے عجیب سرگذشت جو میری نظر سے گذری میرا بہن (میڈلین سلیڈ) کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے اپنے اور سول نافرمانی کی دوسری قیدی عورتوں کے بمبئی جیل کے تجربے درج کئے تھے۔

صوبہ متحدہ میں ہماری تحریک کا زیادہ زور دیہاتی علاقہ میں تھا۔ کسانوں کی طرف سے کانگریس حکومت پر برابر دباؤ ڈالتی رہی تھی۔ اس لئے حکومت نے خاص رقم کی چھوٹ کا وعدہ کر لیا تھا اگرچہ ہمارے نزدیک وہ کافی نہ تھی۔ ہماری گرفتاری کے بعد ہی اور چھوٹ کا اعلان کیا گیا کیسی عجیب

بات ہے کہ یہی اعلان ذرا پہلے نہ کیا گیا ورنہ حالات میں بہت بڑا فرق پڑجاتا
ہم ہرگز بے سوچے سمجھے اس کو رد نہ کرسکتے۔ لیکن دراصل حکومت کو تو یہ فکر تھی کہ
اس چھوٹ کا سہرا کانگریس کے سر نہ ہو۔ اس لیے ایک طرف تو اس نے کانگریس
کو کچلنے کی کوشش کی اور دوسری طرف کسانوں کو خاموش کرنے کے لیے
زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی۔ ہمارا یہ بھی اندازہ ہے کہ جہاں کہیں کانگریس
کا سب سے زیادہ زور پڑا تھا وہیں سب سے زیادہ چھوٹ ملی۔

اگرچہ بہت معقول چھوٹ دی گئی تھی لیکن اس سے کسانوں کی مشکلات
کا حل نہیں ہوا البتہ انھیں کچھ سہولت ضرور ہو گئی۔ گویا حکومت نے کسانوں کی
مخالفت کی شدّت میں کمی کردی جس سے ملک کی عام تحریک وقتی طور پر کچھ
کمزور پڑ گئی۔ اس تحریک کی وجہ سے یوپی کے ہزاروں کسانوں پر طرح طرح کی
آفتیں نازل ہوئی تھیں جن سے بہت سے غریب بالکل تباہ ہو گئے تھے لیکن
اسی تحریک کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو اس وقت جو زیادہ سے زیادہ چھوٹ
مل سکتی تھی مل گئی اور (سول نافرمانی کے شدائد سے قطع نظر) وہ زبردست
پریشانیوں سے بچ گئے۔ ان چھوٹے چھوٹے وقتی فائدوں سے کسانوں کا کچھ
زیادہ کام نہیں چلا لیکن اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ملا وہ ان
کوششوں کا نتیجہ تھا جو کسانوں کی حمایت میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی
برابر کرتی رہی تھی۔ عارضی طور پر تمام کسانوں کو اس سے فائدہ پہنچا لیکن
ان میں جو سب سے بہادر تھے وہ اس جنگ میں کام آگئے۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب صوبہ متحدہ میں خاص تعزیری ضابطہ
نافذ ہوا تو اس کے ساتھ ایک توضیحی بیان بھی شائع ہوا۔ اس بیان میں اس کے
علاوہ اور بیانوں میں بھی جو دوسرے تعزیری ضوابط کے ساتھ شائع ہوئے

بہت کچھ جھوٹ سچ درج تھا جس سے پروپیگنڈے کا کام لینا مقصود تھا۔ یہ بھی اس ابتدائی بازاری پروپیگنڈے کا ایک جزو تھا اور ہمیں اس کا موقع بھی حاصل نہ تھا کہ ہم اس کا جواب دیں یا اس سفید جھوٹ کی تردید کر سکیں۔ البتہ ایک مرتبہ شیروانی پر اسی قسم کا جھوٹ تراشا گیا تھا تو انھوں نے اپنی گرفتاری سے پہلے اس کی تردید کر دی تھی۔ حکومت کے ان مختلف بیانوں اور معذرتوں کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کتنی بوکھلائی ہوئی تھی اور اس کے حواس کس حد تک جواب دے چکے تھے۔ کل اتفاق سے میں شاہ اسپین بوربین چارلس سوم کا ایک فرمان پڑھ رہا تھا جس کی رو سے انھوں نے یسوعی فرقے کو اپنی سلطنت سے نکالنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے خواہ مخواہ حکومت ہند کے تعزیری ضوابط اور ان وجوہ کا خیال آ گیا جو ان کی تائید میں پیش کی گئی تھیں۔ شاہ چارلس نے فروری ۱۷۶۷ء میں یہ فرمان جاری کیا تھا۔ اور اس میں اپنے فعل کو اس طرح حق بجانب ٹھیرایا تھا کہ "رعایا میں فرمانبرداری، امن و امان اور عدل و انصاف برقرار رکھنے کے سلسلے میں این جانب پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس کی وجہ سے، نیز اور دوسری فوری، جائز اور ضروری وجوہ کی بنا پر جو این جانب کے سینہ میں محفوظ ہیں این جانب یہ فرمان نافذ کرتے پر مجبور ہوئے ہیں۔"

اسی طرح تعزیری ضوابط کی اصل وجوہ وائسرائے کے سینہ میں یا ان کے مشیروں کے سینوں میں محفوظ رہیں۔ اگرچہ ہر شخص انھیں جانتا تھا۔ سرکاری طور پر جو وجوہ بیان کی گئیں ان سے ہمیں پروپیگنڈے کی اس نوعیت کا پتہ چلا جو حکومت برطانیہ ہندوستان میں شروع کرنے والی تھی۔ چند ماہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ نیم سرکاری رسائل و اشتہارات بہت بڑی تعداد میں

تمام دیہاتی علاقوں میں تقسیم کیئے گئے۔ ان میں طرح طرح کی بے سر و پا باتیں درج تھیں۔ خصوصاً کانگریس پر یہ اتہام لگایا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کا بھاؤ گر گیا جس سے کسانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ تو کانگریس کی انتہائی تعریف تھی۔ کیونکہ اگر وہ ساری دنیا میں کساد بازاری پیدا کر سکتی ہے تو اس کی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ لیکن اس جھوٹ کی بڑے اہتمام کے ساتھ متواتر اشاعت کی گئی تاکہ کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچے۔

ان سب باتوں کے باوجود، صوبہ متحدہ کے خاص خاص اضلاع کے کسانوں نے سول نافرمانی کی دعوت کا جو بعض جگہ لازمی طور پر جھوٹ وغیرہ کے مقامی جھگڑوں کے ساتھ گڈ مڈ ہو گئی تھی بڑا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں اس مرتبہ کسان زیادہ منظم طریقہ سے اور زیادہ بڑی تعداد میں تحریک میں شریک ہوئے۔ شروع شروع میں تو اس میں خاصا خوش دلی کا رنگ تھا۔ میں نے اس قسم کا ایک بہت دلچسپ قصہ سنا ہے۔ ضلع رائے بریلی کے موضع بکولیہ میں پولیس کے کچھ لوگ عدم ادائی لگان کی وجہ سے قرقی لے کر گئے۔ یہ گاؤں بہت خوش حال تھا اور اس کے باشندے ذرا دل والے تھے۔ وہ پولیس اور مال کے افسروں سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور اپنے گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر خندہ پیشانی سے ان سے کہا کہ جہاں آپ کا جی چاہے تشریف لے جائیے۔ ان لوگوں نے چند مویشی وغیرہ قرق کر لیئے۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے ان افسروں کی پان تمباکو سے خاطر کی اور یہ بیچارے بہت خفیف اور شرمندہ ہو کر واپس گئے۔ لیکن یہ تو ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ رفتہ رفتہ رواداری، خوش دلی اور انسانی شرافت کا یہ جذبہ بہت کم ہو گیا۔ بیچارا موضع بکولیہ اپنی خوش دلی

کی وجہ سے سزا سے نہ بچ سکا اور اسے اپنی دلیری کی سزا بھگتنی پڑی ۔

ان اضلاع میں مہینوں لوگوں نے لگان ادا نہیں کیا ۔ اور غالباً گرمیوں کے شروع میں تھوڑا بہت لگان پہنچنا شروع ہوا ۔ یہاں بڑی بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی ہوئیں ۔ لیکن یہ حکومت کی عام پالیسی کے خلاف تھا کیونکہ اس وقت وہ عموماً خاص خاص کارکنوں اور دیہات کے لیڈروں کو گرفتار کرتی تھی ۔ باقی لوگ صرف مار پیٹ کر چھوڑ دیئے جاتے تھے ۔ جیل بھیجنے اور گولی چلانے سے مار پیٹ زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتی تھی ۔ کیونکہ اس کا حسب ضرورت بار بار اعادہ کیا جا سکتا تھا یہ دور دست دیہاتی علاقوں میں ہوتی تھی اس لئے باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی ۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس طرح جیل خانوں میں قیدیوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں بڑھنے پاتی تھی مار پیٹ کے علاوہ لا تعداد بے دخلیاں اور قرقیاں بھی ہوئیں اور املاک و مویشی بھی کثرت سے فروخت کئے گئے ۔ کسان اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ کر یہ دیکھتے تھے کہ ان کے پاس جو تھوڑا بہت اسباب ہے وہ بھی ان سے چھن رہا ہے اور ان کی آنکھ کے سامنے کوڑیوں کے مول بک رہا ہے ۔

حکومت نے ہندوستان بھر کی بے شمار عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا ۔ اسی سلسلہ میں اس نے سوراج بھون بھی ضبط کر لیا ۔ اس عمارت میں کانگریس کا اسپتال قایم تھا چنانچہ اس کے تمام قیمتی ساز و سامان پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا ۔ چند روز تک تو یہ اسپتال بالکل بند رہا ۔ پھر قریب ہی کے ایک چمن میں کھلے میدان میں دوبارہ جاری کر دیا گیا ۔ چند روز بعد وہ سوراج بھون کے متصل ایک چھوٹی سی عمارت میں منتقل ہو گیا اور یہاں کوئی دو ڈھائی سال

تک جاری رہا۔
یہ افواہ بھی تھی کہ ہمارا سکونتی مکان آنند بھون بھی ضبط ہو جائے گا کیونکہ میں نے انکم ٹیکس کا معتدبہ حصہ ادا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ رقم ۱۹۳۰ء میں والد کی آمدنی پر تشخیص ہوئی تھی لیکن انھوں نے سول نافرمانی کی وجہ سے ادا نہیں کی تھی ۱۹۳۱ء میں دہلی کے صلحنامہ کے بعد انکم ٹیکس افسروں سے میری کچھ بحث ہوئی۔ آخر کار میں اسے ادا کرنے کو تیار ہو گیا بلکہ ایک قسط ادا بھی کردی تھی۔ اس کے بعد ہی تعزیری ضوابط نافذ ہوئے اور میں نے یہ طے کیا کہ اب کوئی رقم ادا نہیں کروں گا۔ مجھے یہ قطعاً نامناسب بلکہ ناجائز معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں کو تو میں لگان ادا نہ کرنے کی تلقین کروں اور خود انکم ٹیکس ادا کروں۔ غرض مجھے یہ توقع تھی کہ حکومت ہمارا مکان بھی قرق کرلے گی۔ اس تصور ہی سے میرا دل دکھتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح میری والدہ کو گھر چھوڑنا پڑے گا، ہماری کتابیں، کاغذات اور وہ سازو سامان جو ہمیں بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر بہت عزیز تھا، غیروں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور ممکن ہے سب برباد ہو جائے۔ نیز قومی جھنڈا اتار کر یونین جیک لہرا دیا جائے گا۔ بخلاف اس کے گھر ہاتھ سے نکل جانے میں مجھے ایک خوبی بھی معلوم ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ اس طرح میں کسانوں سے جو بیچارے اپنے گھر بار سے محروم کئے جارہے ہیں نزدیک تر ہو جاؤں گا۔ اور ان کے دل بڑھ جائیں گے۔ تحریک پر یقیناً اس کا بہت اچھا اثر پڑتا لیکن حکومت نے یہ مناسب نہ سمجھا اور ہمارے گھر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شاید اس نے میری ماں کا کچھ خیال کیا ہو۔ یا شاید یہ صحیح اندازہ کرلیا ہو کہ اس سے سول نافرمانی کو تقویت پہنچے گی۔ کئی مہینے بعد حکومت کو میرے ریلوے

کے چند حصوں کا پتہ چلا اور وہ اس نے انکم ٹیکس کے حساب میں قرق کر لیے۔ میری اور میرے بہنوئی کی موٹریں تو پہلے ہی قرق کر کے فروخت ہو چکی تھیں۔

اس زمانہ میں ایک چیز سے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ یعنی مختلف میونسپلٹیوں اور پبلک اداروں نے خصوصاً کلکتہ کارپوریشن نے جس میں کانگریسی اراکین کی اکثریت بیان کی جاتی تھی اپنی عمارتوں پر سے قومی جھنڈا اتار دیا۔ اُنھوں نے یہ حرکت حکومت اور پولیس کے دباؤ سے کی تھی کیونکہ انھیں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت تدارک کیا جائے گا۔ عدول حکمی کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ ہوتا کہ میونسپلٹی کو معطل کر دیا جاتا یا ممبروں کو سزا ہوتی لیکن ادارے جو مستقل حقوق رکھتے ہیں عموماً بزدل ہوتے ہیں اس لئے انھیں وہی کرنا چاہیئے تھا جو انھوں نے کیا۔ پھر بھی مجھے اس سے سخت تکلیف ہوئی۔ یہ جھنڈا ہمارے لئے ان چیزوں کا نشان بن گیا ہے جو ہمیں بہت عزیز ہیں اور اس کے سایہ کے نیچے ہم نے بارہا اس کی عزت و وقار کو برقرار رکھنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اس لئے اسے اپنے ہاتھ سے اتارنا یا اپنی رضامندی سے اتروانا نہ صرف عہد شکنی بلکہ ہتک حرمت ہے۔ یہ گویا روح کی ذلت اور حق کا انکار یا زبردست کے ڈر سے باطل کا اقرار ہے۔ جن لوگوں نے اس طرح حکومت کے آگے سر جھکا دیا انھوں نے قوم کو ذلیل کیا اور اس کی خودداری کو صدمہ پہنچایا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انھیں سورما بن کر آگ میں کود پڑنا چاہیئے تھا۔ دوسروں کو اس بنا پر الزام دینا بالکل غلط بلکہ حماقت ہے کہ وہ صف اول میں کیوں نہیں آئے جیل کیوں نہیں گئے۔ مصیبتیں اور نقصان کیوں نہیں اٹھائے

ہر شخص پر بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بار ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے حالات کو خود بہتر سمجھ سکتا ہے اس لئے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ حکم بن کر اس کا فیصلہ کرے لیکن میدان میں نہ آنا اور چیز ہے اور حق سے یا اس چیز سے جسے انسان حق سمجھتا ہو منہ موڑنا اور بات ہے میونسپلٹی کے ممبروں کو اگر قومی عزت کے خلاف کوئی حکم دیا جاتا اور اس کی خلاف ورزی کی ان میں جرأت نہ ہوتی تو انھیں رکنیت سے استعفے دے دینا چاہیئے تھا۔ لیکن عام طور پر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی نشستوں سے لپٹے رہے۔

تھامس مور نے کہا ہے "جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھ کر بھنبھنانا بند کر دیتی ہیں
اسی طرح حوصلہ ہر جماعت والے جب وزارت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔"

بہر حال ایسے ناگہانی نازک موقع پر جہاں انسان بدحواس ہو جاتا ہے کسی کے رویہ پر اعتراض کرنا بے انصافی ہے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں جیسا کہ گذشتہ جنگ عظیم میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب ٹٹانک جہاز تباہ ہوا تو بڑے بڑے مشہور لوگوں نے جن کے متعلق خواب میں بھی بزدلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جہازرانوں کو رشوت دے دے کر بچنے کی کوشش کی۔ اور دوسروں کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا۔ حال ہی میں جب مورو کاسل جہاز میں آگ لگی اس وقت بھی بڑے شرمناک حالات دیکھنے میں آئے۔ کون جانتا ہے کہ ایسے ناگہانی موقع پر جب ضبط و عقل پر حیوانی جبلت غالب آ جاتی ہے خود ہمارا کیا

عمل ہو۔ اس لئے ہمیں دوسروں کو برا نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم صحیح راستہ سے بھٹکنے پر خاموش رہیں اور آئندہ اس کی احتیاط نہ کریں کہ قوم کی کشتی کو کھینے کا کام ایسے ہاتھوں میں نہ دیا جائے جو تھرتھراتے ہوں اور ضرورت کے وقت جواب دے دیں۔ اپنی ناکامیابی کی تاویل کرنا اور اسے صحیح قرار دینا اس سے بھی برا ہے۔ عذر گناہ بدتر از گناہ،

دو قوتوں کی جنگ زیادہ تر اخلاقی نظم اور ہمت پر مبنی ہوتی ہے سخت سے سخت لڑائی کا دارو مدار انھیں چیزوں پر ہے۔ مارشل فوش فرماتے ہیں "آخر کار جنگ میں اسی کی فتح ہوتی ہے جس کی ہمت بندھی رہے"۔ پُرامن جنگ میں تو اخلاقی نظم اور ہمت کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے عمل سے اس اخلاقی نظم کو نقصان پہنچاتا ہے یا قوم کی ہمت کو پست کرتا ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ غداری کرتا ہے۔

مہینے گذرتے گئے اور روز کی اچھی بری خبریں ہمارے پاس پہنچتی رہیں یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی جیلوں میں وہاں کی گندا اور بے مزہ زندگی کے عادی ہو گئے۔ اس کے بعد قومی ہفتہ کا زمانہ (۶ اپریل تا ۱۳ اپریل) آیا۔ ہم جانتے تھے کہ اس زمانہ میں بہت سے غیر معمولی واقعات ہوں گے۔ اور یہی ہوا۔ لیکن میرے لئے تو ایک حادثہ کے سامنے سب کچھ ماند پڑ گیا۔ الہ آباد میں میری والدہ ایک جلوس میں شامل تھیں۔ پولیس نے اس جلوس کو راستہ میں روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ جس وقت جلوس روکا گیا تو کسی نے میری والدہ کے لئے ایک کرسی لاکر ڈال دی۔ وہ سڑک پر جلوس کے آگے بیٹھی تھیں۔ چند لوگ خاص طور پر ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے جن میں میرا اسکرٹری بھی شامل تھا۔ ان سب کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے بعد حملہ شروع ہوا۔ میری والدہ کرسی

پر سے گر پڑیں اور پے در پے ان کے سر پر کئی بید پڑے - ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا جسکی وجہ سے وہ بیہوش ہو گئیں - اسی حالت میں وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھیں . جواب پبلک اور جلوس والوں سے صاف ہو گئی تھی - کچھ عرصہ بعد ایک پولیس افسر نے انھیں وہاں سے اٹھایا اور اپنی موٹر میں آنند بھون پہنچا دیا -

اسی رات کو الہ آباد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا، چنانچہ فوراً غصہ سے بھرے ہوئے لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے امن اور عدم تشدد کو پس پشت ڈال کر پولیس پر حملہ کر دیا - پولیس نے گولی چلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے -

ہمیں صرف ایک ہفتہ وار اخبار پڑھنے کو ملتا تھا - جب اس حادثہ کے چند روز بعد ہمیں یہ خبر ملی تو میرے دل پر یہ تصور کر کے ایک چوٹ سی لگی کہ میری نحیف بوڑھی ماں سڑک کے گرد و غبار میں خون میں لت پت پڑی تھیں اگر میں وہاں موجود ہوتا تو نہ جانے خود میرا کیا رویہ ہوتا - معلوم نہیں خود میں عدم تشدد پر کہاں تک قائم رہتا - مجھے اندیشہ تھا کہ پچھلے بارہ برس میں میں نے جو سبق سیکھنے کی کوشش کی تھی - یہ دردناک منظر دیکھ کر میں وہ سب کچھ بھول جاتا - اور شاید مجھے ذاتی یا قومی مصالح کا بھی کوئی خیال نہ رہتا

رفتہ رفتہ وہ اچھی ہو گئیں - لیکن اگلے مہینہ میں جب وہ مجھ سے بریلی جیل میں ملنے آئی ہیں اس وقت تک ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی - بہر حال وہ بہت خوش تھیں اور اس پر فخر کرتی تھیں کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ انھیں بھی بید اور لاٹھیاں کھانے کا موقع ملا - لیکن ان کی یہ صحتیابی حقیقی نہیں بلکہ محض ظاہری تھی - اور اس ضعیف العمری میں انھیں جو شدید صدمہ



سروپ رانی نہرو

پہنچا تھا اس نے ان کے سارے نظام کو ہلا ڈالا۔ اور ان پرانی شکایات کو ابھار دیا جنھوں نے ایک سال بعد بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی

(۴۳)

بریلی اور دہرہ دون کے جیلوں میں

چھ ہفتے نینی جیل میں رہنے کے بعد میں بریلی کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیجدیا گیا۔ میری صحت پھر خراب ہوگئی تھی اور روز حرارت ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے طبیعت پریشان تھی۔ چار مہینے کے بعد جب کہ شدید گرمی پڑرہی تھی میں بریلی جیل سے منتقل کر دیا گیا اور اب کی بار ایک ٹھنڈی جگہ بھیجا گیا یعنی دہرہ دون کی جیل میں جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں میں مسلسل ساڑھے چودہ مہینے یعنی قریب قریب اپنی دو سال کی میعاد کے ختم تک رہا۔ ملاقاتوں خطوں اور منتخب اخباروں کے ذریعے سے مجھے باہر کی تھوڑی بہت خبریں تو پہنچ جاتی تھیں مگر پھر بھی مجھے بہت سی باتوں کی مطلق خبر نہ تھی صرف خاص خاص واقعات کا ایک دھندلا سا تصور ذہن میں تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں اپنے ذاتی معاملات اور اس وقت کے سیاسی حالات میں الجھا رہا۔ کوئی ساڑھے پانچ مہینے کے بعد پھر قیدخانے میں پہنچ گیا اور اب بھی یہیں ہوں۔ اس طرح پچھلے ساڑھے تین برس میں میرا وقت زیادہ تر جیل میں گذرا اور میں واقعات سے بے خبر رہا۔ مجھ کو اس کا موقع ہی کب ملا کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا اس سے تفصیلی واقفیت حاصل کرتا مجھے ابھی تک اچھی طرح سے نہیں معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں، جس میں گاندھی جی نے شرکت کی تھی پردے کے پیچھے کیا کیا ہوا۔ میں نہ ان سے اس مسئلے پر گفتگو کر سکا نہ اور واقعات

پر جو اس عرصے میں پیش آئے۔

مجھے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے حالات کا اتنا علم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں قومی تحریک کی نشوونما دکھا سکوں مگر چونکہ میں اس کی بنیاد سے واقف تھا اور کام کرنے والوں کو بھی جانتا تھا اس لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات کی حقیقی اہمیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح مجھے تحریک کی عام رفتار کا خاصا اندازہ تھا۔ پہلے چار پانچ مہینے سول نافرمانی بڑے زور شور سے چلتی رہی اس کے بعد رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ البتہ بیچ میں کبھی کبھی پھر بھڑک اٹھتی تھی۔ عملی جدوجہد کی انقلابی شدت تھوڑے ہی دن رہ سکتی ہے اس کا ایک حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے یا بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی بھی پہلے ہلّے کے بعد آہستہ آہستہ گھٹنے لگی مگر اس دھیمی رفتار سے وہ بہت مدت تک جاری رہ سکتی تھی۔ خلاف قانون قرار دیے جانے کے باوجود کانگریس کا نظام خاصی کامیابی سے چلتا رہا وہ صوبوں کے کارکنوں کے کام سے باخبر رہتی تھی، انھیں ہدایتیں بھیجتی تھی، ان سے رپورٹیں منگاتی تھی اور کبھی کبھی انھیں مالی امداد بھی دیتی تھی۔

صوبوں کی کانگریس کمیٹیاں بھی کم و بیش کامیابی سے چلتی رہیں۔ اس سارے عرصے میں جب میں جیل میں تھا مجھے دوسرے صوبوں کے کچھ زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے مگر رہائی کے دنوں میں صوبہ متحدہ کی جدوجہد کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئی۔ اس صوبہ کی کانگریس ۱۹۳۲ء میں تمام سال اور ۱۹۳۳ء کے وسط تک باقاعدہ کام کرتی رہی یہاں تک کہ کانگریس کے قائم مقام پریسیڈنٹ نے گاندھی جی کے مشورے سے سول نافرمانی ملتوی کر دی۔ اس عرصے میں اکثر اضلاع کو ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں چھپے ہوئے یا سائکلو اسٹائل سے لکھے ہوئے خبر نامے باقاعدہ شائع کیے جاتے تھے، اضلاع کے کام کا وقتاً فوقتاً معا

کیا جاتا تھا اور قومی کارکنوں کو الاؤنس تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ کام زیادہ تر خفیہ طور پر کرنا پڑتا تھا مگر صوبے کی کانگریس کمیٹی کا ہر سکریٹری جو دفتر وغیرہ کا نگراں ہوتا تھا کھلم کھلا کام کرتا تھا یہاں تک کہ وہ گرفتار ہو جاتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا شخص آجاتا تھا۔

سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۳۲ء کے تجربہ سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہم تمام ہندوستان میں خفیہ خبر رسانی کا سلسلہ آسانی سے قائم کر سکتے ہیں اگرچہ کچھ زیادہ کوشش نہیں کی گئی اور برابر مزاحمت ہوتی رہی پھر بھی ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی مگر ہم میں سے بہت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خفیہ طور پر کام کرنا سول نافرمانی کے اصول کے ساتھ نہیں کھپتا اور اس سے عام لوگوں میں بیداری پیدا نہیں ہوتی بلکہ افسردگی سی چھا جاتی ہے اگر عام تحریک بڑے پیمانے پر جاری ہو تو اس کے ساتھ تھوڑی بہت خفیہ کارروائی بھی مفید ہو سکتی ہے مگر اس میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے (خصوصاً اس وقت جب تحریک کا زور گھٹ رہا ہو) کہ کہیں یہ کم و بیش بے اثر خفیہ کارروائیاں عام تحریک کی جگہ نہ لے لیں۔ گاندھی جی نے جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں خفیہ کارروائیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

صوبہ متحدہ کے علاوہ گجرات اور کرناٹک میں بھی کچھ دن تک کسانوں کی محصول نہ دینے کی تحریک چلتی رہی۔ گجرات اور کرناٹک دونوں جگہ کاشتکار اپنی زمین کے مالک ہیں۔ انھوں نے حکومت کو مالگذاری ادا کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سخت نقصان پہنچا۔ کانگریس کی طرف سے تھوڑی بہت کوشش کی گئی کہ مصیبت زدوں کی مدد کی جائے اور بے دخلیوں اور املاک کی ضبطیوں سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی کی جائے۔ ظاہر ہے کہ کوشش بہت محدود تھی۔ صوبہ متحدہ میں کانگریس کمیٹی نے بے دخل کسانوں

کی مدد کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہاں مسئلہ بہت بڑا تھا اس صوبے میں اسامیوں کی تعداد زمیندار کاشتکاروں سے بہت زیادہ ہے) اور رقبہ بھی بہت وسیع تھا اور کانگریس کمیٹی کے پاس روپیہ بہت کم تھا۔ یہاں بیسیوں ہزار آدمیوں کو اس تحریک کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا ان سب کی مدد کرنا ناممکن تھا اور ان میں اور دوسرے کاشتکاروں میں جو خود فاقے کر رہے تھے تفریق کرنا بھی مشکل تھا اگر دو چار ہزار آدمیوں کی مدد بھی کی جاتی تو اس سے جھگڑے پڑ جاتے اور بددلی پھیل جاتی اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کوئی مالی امداد نہیں دیں گے یہ بات کاشتکاروں کو پہلے ہی سے سمجھا دی گئی تھی اور انھوں نے ہماری مشکلات کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں اور اُف تک نہ کی۔ البتہ جہاں تک ممکن تھا ہم نے بعض افراد کی خصوصاً جیل جانے والے کارکنوں کے بال بچوں کی مدد کی۔ اس بدنصیب ملک کے افلاس کا یہ حال ہے کہ ایک روپیہ مہینہ بھی ان کے لئے بڑی نعمت تھی۔

اس سارے عرصے میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی (جو خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) اپنے اجرت پر کام کرنے والے کارکنوں کو قلیل مقررہ الاؤنس دیتی رہی اور جب وہ باری باری سے جیل جاتے تھے تو ان کے خاندان کی خبرگیری کی جاتی تھی۔ یہ بجٹ کی سب سے بڑی مد تھی۔ اس کے بعد اشتہاروں وغیرہ کی چھپائی کا نمبر تھا۔ یہ بھی خاصی رقم ہو جاتی تھی۔ ایک اور بڑی مد سفر خرچ کی تھی اور اس کے علاوہ جن اضلاع کی کمیٹیوں کی مالی حالت اچھی نہ تھی انھیں کچھ امداد دی جاتی تھی۔ ان سب مصارف کے باوجود صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بیس مہینے میں جنوری سنہ ۳۲ء سے آخر اگست سنہ ۳۳ء تک جب وہ ایک طاقتور حکومت کے ساتھ زبردست لڑائی لڑ رہی تھی کل ترسیٹھ (۶۳) ہزار روپیہ یعنی تقریباً ۳ ہزار

ایک سو چالیس روپیہ ماہوار خرچ کیا۔ (اس رقم میں الہ آباد، آگرہ، کانپور، لکھنؤ وغیرہ
کی خوش حال ضلع کمیٹیوں کے علیحدہ مصارف شامل نہیں ہیں) صوبہ متحدہ ۱۹۳۲ء
اور ۱۹۳۳ء میں سارے وقت تحریک میں پیش پیش رہا اور میرے خیال میں جتنا
کام اس نے کیا اس کے مقابلے میں یہ خرچ بہت ہی کم ہے۔ اس چھوٹی سی رقم کا
بھلا ان خاص اخراجات سے کیا مقابلہ ہے جو صوبہ کی حکومت نے سول نافرمانی کو
دبانے کے لئے برداشت کئے۔ میرا قیاس ہے (اگرچہ مجھے ٹھیک معلوم نہیں)
کہ کانگریس کے بعض اور بڑے بڑے صوبوں نے اس سے بہت زیادہ خرچ کیا۔
بہار، کانگریس کے نقطہ نظر سے اپنے ہمسائے صوبہ متحدہ سے بھی غریب ہی پھر بھی
اس کا کام اس تحریک میں نہایت شاندار تھا۔

غرض سول نافرمانی رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی حد تک
جاری رہی۔ البتہ اس میں عام تحریک کا رنگ کم ہوتا گیا۔ حکومت کی سختیوں سے
قطع نظر کر کے اسے پہلا سخت دھچکا ستمبر ۱۹۳۲ء میں پہنچا جب کہ گاندھی جی نے
ہریجنوں کے معاملے کی وجہ سے پہلی بار برت رکھا۔ اس برت سے عام لوگوں میں
جوش اور بیداری پیدا ہوئی مگر اس نے دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ مئی ۱۹۳۳ء
میں سول نافرمانی کے التوا کا اعلان کر دیا گیا اور وہ عملی طور پر ختم ہو گئی۔ اس کے
بعد بھی وہ اصولی طور پر باقی تھی مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں
کہ اگر التوا نہ کیا جاتا تب بھی وہ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ حکومت کے جبر و تشدد
نے سارے ہندوستان کو سن کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر قوم کی اعصابی قوت ختم ہو چکی
تھی اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اسے ابھارے۔ انفرادی طور پر بہت سے لوگ تھے
جو سول نافرمانی کر سکتے تھے مگر وہ ایک مصنوعی فضا میں کام کر رہے تھے۔
جیل میں اس عظیم الشان تحریک کے رفتہ رفتہ گھٹنے کی خبر سن کر ہم کو بڑی تکلیف

ہوئی، حالانکہ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جنھیں فوری کامیابی کی امید ہو۔ ایک خفیف سا احتمال ضرور تھا کہ اگر عام لوگ پورے جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو شاید کوئی فوری نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے مگر اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں کو یہی توقع تھی کہ لڑائی بہت طول کھینچے گی بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنے پڑیں گے، صدہا مشکلات کا سامنا ہوگا تب کہیں آہستہ آہستہ عام لوگوں میں انضباط، اتحاد عمل اور اتحاد خیال پیدا ہوگا۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے شروع میں کبھی کبھی اس خیال سے ایک خوف سا ہوتا تھا کہ کہیں ہمیں بہت جلد ظاہری کامیابی نہ حاصل ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا کہ کانگریس مصالحت کرتی اور اس سے گورنمنٹ کے آدمیوں اور مطلب پرستوں کی بن آتی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ کامیابی اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے جب عام لوگوں میں اتنی قوت اور ان کے خیالات میں اتنی وضاحت ہو کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ورنہ یہی ہوگا کہ عام لوگ تو لڑیں گے اور قربانیاں کریں گے اور عین وقت پر دوسرے لوگ آکر مزے میں مال غنیمت پر قبضہ کر لیں گے۔ اس کا بہت سخت اندیشہ تھا اس لئے کہ خود کانگریس کے اندر لوگوں کے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کوئی واضح تصور نہ تھا کہ وہ کس قسم کی حکومت یا سماج چاہتے ہیں۔ بعض کانگریسی تو اس خیال کے تھے کہ موجودہ نظام حکومت میں کچھ زیادہ تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس برطانوی حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ سودیشی چھاپ کے لوگوں کو مقرر کر دینا کافی ہے۔

خالص قسم کے حکومت پرستوں سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا کیونکہ ان کا ایمان تو یہ ہے کہ جو حکومت بھی ہو اس کی اطاعت کی جائے۔ ان کے

علاوہ لبرل پارٹی اور تعاونی پارٹی بھی تقریباً پورے طور پر برطانوی حکومت کی ہم خیال تھی، اور ان کی طرف سے جو نکتہ چینی ہوتی رہتی تھی اس کا نہ کوئی اثر تھا نہ کوئی قدر و قیمت۔ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ تو ہر حال میں قانون کے بندے ہیں اور اس لئے ان سے یہ توقع تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ سول نافرمانی کو پسند کریں گے مگر انھوں نے صرف ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفا نہیں کی بلکہ کم و بیش حکومت کے دست و بازو بن گئے۔ ہر قسم کی قانونی آزادی چھینی جا رہی تھی اور وہ سہمے ہوئے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حکومت صرف سول نافرمانی کو توڑنا اور دبانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ہر قسم کی سیاسی زندگی اور پبلک جدوجہد کو روکنا چاہتی تھی مگر اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ جو لوگ قانونی آزادی کی حمایت کیا کرتے تھے وہ سب لڑائی میں شریک تھے اور حکومت کے جبر و تشدد کے آگے سر نہ جھکانے کی سزا بھگت رہے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ڈر کے مارے ذلت سے سر تسلیم خم کر دیا اور نکتہ چینی کی جرات نہیں کی۔ اگر کبھی کچھ ہلکی سی نکتہ چینی ہوتی بھی تھی تو بہت نیازمندانہ لہجے میں اور اس کے ساتھ کانگریس کو اور تحریک میں شریک ہونے والوں کو دل کھول کر برا بھلا بھی کہا جاتا تھا۔

مغربی ملکوں میں رائے عامہ پوری قوت سے قانونی آزادی کی حمایت کرتی ہے اور اگر اس میں مداخلت کی جائے تو بیزاری اور مخالفت کا طوفان برپا ہو جاتا ہے (شاید اب یہ بات ایک قصہ پارینہ ہو گئی ہے) بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ خود عملی جدوجہد میں شریک ہونا نہیں چاہتے مگر وہ تقریر و تحریر کی آزادی جلسوں اور انجمنوں کی آزادی، اشخاص اور اخبارات کی آزادی کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ ہمیشہ اس کے لئے احتجاج کرتے رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کو روکنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ

کسی حد تک انگلستان کی لبرل پارٹی کے روایات کی حامل ہے (حالانکہ اصل میں ان دونوں میں نام کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں) اور اس سے یہ توقع ہوسکتی تھی کہ وہ قانونی آزادی کی پامالی کی کم سے کم اصولی مخالفت کرے گی کیونکہ خود اسے بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ والٹیر کی ہم زبان ہو کر کہتی "تم جو کچھ کہتے ہو اس کا میں قطعاً مخالف ہوں مگر میں مرتے دم تمہارے اس حق کی حمایت کروں گا کہ جو کہنا چاہتے ہو وہ کہہ سکو"

شاید انھیں الزام دینا بے انصافی ہے، کیونکہ انھوں نے کبھی آزادی اور جمہوریت کا حامی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور موقع ایسا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ان کی زبان سے نکل جاتی تو بیچارے مصیبت میں پڑ جاتے۔ البتہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ آزادی کے قدیم علم بردار برطانوی لبرل، اور لیبر پارٹی کے نئے اشتراکی ہندوستان میں حکومت کے جبر و تشدد سے کس حد تک متاثر ہوئے۔ وہ اس دردناک منظر کو خاصے اطمینان اور سکون سے دیکھتے رہے اور کبھی کبھی اس پالیسی کے متعلق جسے مانچسٹر گارجین کا نامہ نگار "جبر و تشدد کا سائنٹفک" استعمال کہتا ہے پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہے۔ حال میں انگلستان کی نیشنل گورنمنٹ نے "قانون بغاوت" کا مسودہ پاس کرانے کی کوشش کی تھی اور اس پر لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی تھی، اس پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ تقریر کی آزادی میں مداخلت کرتا ہے اور مجسٹریٹوں کو تلاشی کا وارنٹ جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ میں جب ان اعتراضات کو پڑھتا تھا تو دل سے ان کی تائید کرتا تھا اور اسی کے ساتھ میری آنکھوں میں ہندوستان کی تصویر پھرنے لگتی تھی جہاں برطانیہ کے مجوزہ قانون بغاوت سے ہزار درجہ بدتر قانون نافذ ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ اہل برطانیہ انگلستان میں اسی کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے

ہیں، اور ہندوستان میں اونٹ کا اونٹ نگل جاتے ہیں اور ان کی تیوری پر بل تک نہیں آتا۔ میں تو ان کے اس کمال کا قائل ہوں کہ وہ اپنے اخلاقی اصول کو اپنے مادی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ہر چیز جو ان کے سیاسی منصوبوں میں مددے۔ انھیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سچے دل سے اخلاقی جوش کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کو برا کہتے ہیں کہ وہ آزادی اور جمہوریت کے دشمن ہیں اور اسی سچے دل سے ہندوستان میں آزادی اور جمہوریت کی پامالی کی حمایت کرتے ہیں اور اُسے ضروری سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے اخلاقی دلائل سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل خالص بے غرضی پر مبنی ہے۔

ادھر ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی اور ہمارے مرد اور عورتوں کی جان پر بنی رہی تھی اور ادھر لندن میں خاصان حکومت ہندوستان کے لئے دستور اساسی بنا رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس۔ اور اس کی نہ جانے کتنی کمیٹیاں ہو رہی تھیں اور اسمبلی کے ممبران کمیٹیوں کی ممبری کی کوشش کر رہے تھے تاکہ قوم کی خدمت بھی کریں اور سیر و سفر کا لطف بھی اٹھائیں۔ اُس کے بعد ۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور اس میں ہندوستانی اسیسر بلائے گئے۔ پھر ہماری فیاض حکومت کی طرف سے ان لوگوں کو جو شہادت دینے جا رہے تھے جہاز کے ٹکٹ مفت دئے گئے۔ بہت سے لوگ دوبارہ ہندوستان کی خدمت کے جوش میں پبلک کے خرچ پر سمندر پار گئے اور سُنا ہے بعض نے تو کرائے کی رقم پر بچت بھی کی۔

کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ارباب غرض کے یہ نمائندے ہندوستان کی عام تحریک سے خوف زدہ ہو کر برطانوی شہنشاہی کے زیر سایہ لندن میں جمع ہوئے مگر ہمارے جذبہ قومیت کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا کہ ہمارے ہندوستانی

بھائیوں نے یہ حرکت عین اس وقت کی جب مادر وطن موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ مگر ہم میں سے بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا (جو آگے چل کر غلط ثابت ہوا) کہ اس سے صاف صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان میں کون لوگ رجعت پسند ہیں اور کون ترقی پسند۔ اس تفریق سے عام لوگوں کی سیاسی تربیت میں مدد ملے گی اور سب پر ظاہر ہو جائے گا کہ بغیر کامل آزادی کے ہمارے سماجی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عام لوگوں کی مصیبت دور نہیں ہو سکتی

یہ حضرات نہ صرف روزمرہ کی زندگی کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے بھی، عام ہندوستانیوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ اُن کے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ انھیں مطلق احساس نہیں کہ عام لوگوں کے کیا خیالات ہیں اور وہ کون سا جذبہ ہے جو انھیں قربانیاں کرنے اور تکلیفیں سہنے پر ابھار رہا ہے۔ ان نامور مُدبّروں کو صرف ایک ہی حقیقت نظر آتی ہے یعنی برطانوی شہنشاہی۔ ان کے نزدیک اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اس لئے چار ناچار اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔ وہ اتنا بھی نہ سمجھے کہ عام لوگوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقی اور عملی دستور نہیں بنایا جا سکتا۔ مسٹر ف۔ ج اسپینڈر نے اپنی نئی کتاب "ہمارے زمانہ کی مختصر تاریخ" میں آئرلینڈ کی مشترکہ کانفرنس کی ناکامیابی کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۰ء میں دستور کی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو سیاسی لیڈر اس نازک وقت میں دستور بنانے کی فکر میں تھے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مکان کا بیمہ اس وقت کرے جب اس میں آگ لگی ہو۔ آئرلینڈ میں ۱۹۱۰ء میں جو آگ لگی تھی اس سے بہت بڑی آگ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اور

اگرچہ اس کے شعلے بجھ گئے ہیں مگر اس کے انگارے، جن میں ہندوستان کے جوش آزادی کی حرارت ہے، مدت تک دہکتے رہیں گے۔

ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں تشدد کا جذبہ انتہا کو پہنچ گیا تھا یہ روایات پہلے سے چلی آتی تھیں اور برطانوی حکومت ابتدا سے ہندوستان میں زیادہ تر پولیس کا کام کرتی تھی۔ ملکی حکام کے طرز خیال پر بھی فوجی رنگ غالب تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں کی فوج مفتوحہ علاقے میں پڑاؤ ڈالے پڑی ہے جب موجودہ نظام کی مخالفت شروع ہوئی تو یہ رنگ اور بھی گہرا ہو گیا۔ ان لغو حرکتوں نے یعنی جو بنگال وغیرہ میں کبھی کبھی ہوتی تھیں حکومت کے تشدد کو اور بھڑکایا اور اسے سختی کرنے کے لئے ایک عذر بھی مل گیا۔ حکومت کی پالیسی اور اس کے تعزیری ضابطوں کی وجہ سے عاملہ اور پولیس کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے کہ گویا ہندوستان میں پولیس کا راج قائم ہو گیا اور کوئی اس کی روک ٹوک کرنے والا نہ رہا۔

اس جبر و تشدد کی زد میں کم و بیش ہندوستان کے سب ہی صوبے آئے مگر صوبہ سرحد اور بنگال کو سب سے زیادہ مصیبت اٹھانی پڑی۔ صوبہ سرحد ہمیشہ سے بڑی حد تک ایک فوجی علاقہ تھا اور اس میں نیم فوجی انتظام رائج تھا۔ اس کا محل وقوع جنگی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا اور وہاں سرخ پوشوں کی تحریک پھیلنے سے حکومت بالکل بدحواس ہو گئی تھی۔ سارے صوبے میں ہر طرف فوجی دستے نظر آتے تھے جو "امن قائم کرنے میں" اور "سرکش دیہات" کو قابو میں لانے میں مصروف تھے۔ سارے ہندوستان میں پورے پورے گاؤں پر اور کبھی کبھی (خصوصاً بنگال میں) شہروں پر بھی بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔ اکثر تعزیری پولیس بھی تعینات کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب پولیس

کو اتنے اختیار دیئے گئے تھے اور کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی تو اس کا زیادتی کرنا ایک لازمی امر تھا۔ قانون و انصاف کی بدنظمی اور بے انصافی کی عجیب عجیب مثالیں دیکھنے میں آتی تھیں۔

بنگال کے بعض حصوں میں بہت افسوس ناک منظر نظر آتا تھا۔ حکومت وہاں کی ساری آبادی کو (یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ساری ہندو آبادی کو) دشمن سمجھتی تھی اور بارہ اور پچیس سال کے درمیان عمر رکھنے والے ہر مرد و عورت لڑکے لڑکی کو ایک کاغذ رکھنا پڑتا تھا جس میں اس کا نام و نشان درج ہوتا تھا۔ جتھے کے جتھے نظر بند کر دیئے جاتے تھے یا انھیں کسی علاقے میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ لباس پر بندشیں عائد کی گئی تھیں۔ مدرسوں کی نگرانی ہوتی تھی یا وہ بند کر دیئے جاتے تھے۔ لوگوں کو بائیسکل رکھنے کی اجازت نہیں تھی انھیں اپنی نقل و حرکت کی اطلاع پولیس کو دینی پڑتی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد گھر سے نکلنے کی ممانعت، فوجوں کا گشت، تعزیری پولیس، مجموعی جرمانے، غرض دنیا بھر کے قاعدوں اور ضابطوں کی زنجیروں نے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا۔ علاقے کے علاقے فوجی محاصرہ کی حالت میں تھے اور ان کے سارے باشندوں کی حیثیت ان قیدیوں کی سی تھی جو عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہیں اور ہر وقت پولیس کی شدید نگرانی میں رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر سے یہ عجیب و غریب قاعدے یا ضابطے ضروری تھے یا نہیں تھے۔ اگر ان کی ضرورت نہیں تھی تو حکومت پر بہت سخت الزام آتا ہے کہ اس نے پورے پورے علاقوں کے باشندوں کو خواہ مخواہ ستایا۔ ذلیل کیا اور شدید نقصان پہنچایا اور اگر ان کی ضرورت تھی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

اس جبر و تشدد نے جیل میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، قیدیوں کی تقسیم مختلف درجوں میں کرنا ایک لغو فعل تھا اور اس سے اکثر ان لوگوں کو جو ادنچے درجے میں رکھے جاتے تھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ بہت کم لوگوں کو اونچے درجے ملتے تھے اور بہت سے زود حس مردوں اور عورتوں کو ایسی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی تھی جو ان کے لئے سوہان روح تھیں معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جان بوجھ کر ایسی پالیسی اختیار کرتی ہے جس سے سیاسی قیدیوں کی حالت عام قیدیوں سے بدتر ہو جائے۔ جیل کے ایک انسپکٹر جنرل نے تو یہاں تک کیا کہ تمام جیل خانوں میں ایک خفیہ گشتی بھیجدی جس میں یہ ہدایت کی کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے ساتھ "انتہائی سختی کا برتاؤ کرنا چاہیئے"[1] کوڑے لگانے کی سزا جیل میں عام ہوگئی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۳۳ء کو نائب وزیر ہند نے دارالعوام میں بیان کیا "سر سیموئل ہور کو اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں پانچسو قیدیوں کو سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں کوڑے لگائے گئے" معلوم نہیں اس تعداد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں یا نہیں جنھیں جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کی سزا میں کوڑے لگائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ہمیں جیل میں یہ خبریں پہنچیں کہ بہت سے لوگوں کو کوڑے کی سزائیں دی گئی ہیں تو مجھے یاد آیا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہم نے اس قسم کے دو ایک واقعات کے خلاف احتجاج کیا تھا

---

[1] - یہ گشتی ۳۰ جون ۱۹۳۲ء کو جاری کی گئی تھی اور اس کے الفاظ حسب ذیل تھے "انسپکٹر جنرل جیل کے مہتمموں اور ماتحت افسروں کو آگاہ کرتے ہیں کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کا دماغ درست کر دینا چاہیئے اور ان کے ساتھ انتہائی سختی کا برتاؤ ہونا چاہیئے"

اور تین روز کا فاقہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے اس وحشیانہ سزا سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب بھی مجھے صدمہ ہوتا تھا اور دل دکھتا تھا مگر اس کا کبھی خیال بھی نہ آیا کہ مجھے پھر احتجاج اور فاقہ کرنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میں بالکل بے بس ہوں۔ انسان کا احساس وحشت اور بہیمیت کا منظر دیکھتے دیکھتے کُند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی بُری چیز کیوں نہ ہو ایک مُدّت کے بعد دنیا کو اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہمارے آدمیوں سے جیل میں سخت ترین مشقّت کے کام لئے جاتے تھے مثلاً چکّی پیسنا، کولھو چلانا وغیرہ اور انھیں ہر قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ عاجز آکر معافی مانگ لیں اور اقرار نامے پر دستخط کر کے رہا ہو جائیں یہ جیل کے افسروں کی بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔

جیل کی اکثر سزائیں لڑکوں اور نوجوانوں کے حصّے میں آتی تھیں اس لئے کہ وہ بے جا سختیوں پر بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ یہ بڑے اچھے بہادر لڑکے تھے جن میں خودداری، تیزی طرّاری اور من چلاپن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اگر یہ انگلستان کے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہوتے تو ان کی بڑی قدر اور ہمّت افزائی کی جاتی۔ مگر ہندوستان میں ان کی نوجوانانہ تصوّر پرستی اور خودداری کا صلہ یہ ملتا تھا کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں، کال کوٹھری میں بند کئے جاتے تھے، اور کوڑوں سے پٹتے تھے۔

ہماری عورتوں کی حالت جیل میں اور بھی زیادہ افسوسناک تھی۔ یہ عموماً اوسط طبقے کی عورتیں تھیں جو گھروں کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں، اور اس سماج نے جس میں مردوں کی خود غرضانہ حکومت ہے

انھیں طرح طرح کی بندشوں اور رسموں میں جکڑ رکھا تھا۔ آزادی کی تحریک ان کے لئے دُہری اہمیت رکھتی تھی۔ جس جوش وخروش سے یہ اس تحریک میں شریک ہوئیں اس کی تہ میں یقیناً یہ خواہش تھی کہ انھیں گھر کی غلامی سے بھی نجات مل جائے۔ یہ خواہش مبہم اور غیر محسوس سہی مگر شدت سے ان کے دلوں میں موجود تھی۔

جیل میں معدودے چند کے سوا ان خواتین کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ وہ بدترین قسم کی عورتوں کے ساتھ رکھی جاتی تھیں اور اکثر انھیں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ایک بار میں اس بارک میں رکھا گیا جو عورتوں کے احاطہ سے متصل تھی۔ صرف ایک دیوار بیچ میں تھی۔ اس احاطے میں اور عورتوں کے ساتھ چند سیاسی قیدی عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک خاتون کے گھر میں ایک زمانہ میں مہمان رہ چکا تھا۔ ایک اونچی دیوار کے حائل ہونے کے باوجود نگراں قیدی عورتوں کی ڈانٹ ڈپٹ کی آواز صاف سنائی دیتی تھی اور مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا کہ میری دوستوں کو ایسی بیہودہ اور نامعقول باتیں سننی پڑتی ہیں۔

یہ بات صریحی طور پر نظر آتی تھی کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں دو برس پہلے یعنی ۱۹۳۰ء کے مقابلے میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہوتا تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ چند افسر اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہوں سوا اس کے اور کوئی وجہ عقل میں نہیں آسکتی تھی کہ حکومت نے قصداً یہ پالیسی مقرر کی ہے۔ کچھ سیاسی قیدیوں پر موقوف نہیں بلکہ یوں بھی صوبہ متحدہ کا جیل کا محکمہ اس زمانہ میں اس کے لئے بدنام تھا کہ وہ ہر قسم کی ہمدردی اور انسانیت سے محروم ہے۔ ہمیں نہایت معتبر ذریعے سے اس کی ایک دلچسپ مثال معلوم ہوئی۔ ایک بار جیل کے ایک معزز وزیٹر، جو ہماری طرح باغی ایجی

نہیں، بلکہ حکومت کے مقربین میں سے تھے اور سر کا خطاب رکھتے تھے، ہم سے ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ چند مہینے پہلے وہ ایک اور جیل کے معائنہ کے لئے گئے تھے اور انھوں نے اسی رپورٹ میں جیلر کے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے کہ وہ "ہمدردی کے ساتھ ضابطے کی پابندی کراتے ہیں" جیلر نے ان سے درخواست کی کہ آپ میری ہمدردی کا ذکر نہ کیجئے اس لئے کہ سرکاری حلقوں میں یہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ مگر وزیٹر صاحب نہیں مانے اور انھیں یقین نہ آیا کہ اس رپورٹ سے جیلر کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد جیلر وہاں سے دور کسی کوردہ مقام پر بدل دیا گیا جو اس کے لئے ایک قسم کی سزا تھی۔

بعض جیلروں کو جو خاص طور پر سخت اور بے باک سمجھے جاتے تھے ترقیاں ملیں اور خطاب دئے گئے۔ رشوت کی جیل میں اس قدر گرم بازاری ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس سے بچتا ہو۔ مگر میرا اور میرے بہت سے دوستوں کا یہ تجربہ ہے کہ جیل کے افسروں میں وہی لوگ سب سے زیادہ رشوت لیتے ہیں جو بڑے سخت گیر بنتے ہیں۔

خوش قسمتی سے میرے ساتھ جیل میں اور جیل کے باہر بھی لوگوں کا برتاؤ بہت اچھا رہا اور ہر شخص جس سے مجھے سابقہ پڑا میرے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا ان موقعوں پر بھی جب میں اس سلوک کا مستحق نہیں تھا۔ البتہ جیل میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے مجھے اور میرے عزیزوں کو بڑا دکھ پہنچا۔ ایک بار میری والدہ، کملا، اور میری بیٹی اندرا، الہ آباد کے ڈسٹرک جیل میں میرے بہنوئی رنجیت پنڈت سے ملنے کے لئے گئیں جیلر نے انھیں بے قصور برا بھلا کہا اور باہر نکال دیا مجھے اس سے بہت رنج ہوا

اور صوبے کی حکومت نے اس معاملے میں جو طریقہ اختیار کیا اس سے اور بھی زیادہ صدمہ پہنچا۔ اس خیال سے کہ کہیں پھر جیل کے ملازموں کے ہاتھ سے میری والدہ کی توہین نہ ہو میں نے سب سے ملاقات کرنا ترک کر دیا دہرہ دون کے جیل میں سات مہینے تک ایک شخص سے بھی ملاقات نہیں کی۔

۴۴

ایک قیدی کی نفسی کیفیتیں

میں اور گووند بلبھ پنتھ بریلی ڈسٹرکٹ جیل سے دیرہ دون جیل منتقل کر دئے گئے۔ اس خیال سے کہ کوئی مظاہرہ نہ ہونے پائے ہمیں بریلی اسٹیشن سے ریل پر سوار نہیں کیا بلکہ وہاں سے پچاس میل آگے لے جا کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی پر بٹھایا اور وہ بھی خفیہ طور پر رات کے وقت۔ مہینوں تنہائی میں بند رہنے کے بعد رات کی خنکی میں موٹر کار کا سفر بڑا خوشگوار معلوم ہوا۔

بریلی جیل سے روانگی سے پہلے ایک بات ایسی ہوئی جس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ اور جس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ بریلی کا انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں موجود تھا۔ جب میں موٹر میں بیٹھنے لگا تو اس نے کچھ شرماتے ہوئے ایک بنڈل میری طرف بڑھایا اور کہا کہ اس میں جرمنی کے چند پرانے باتصویر رسالے ہیں، میں نے سنا تھا کہ آپ نے جرمن زبان سیکھنا شروع کی ہے۔ اس لئے میں یہ رسالے آپ کے لئے لیتا آیا۔ میں نہ ان صاحب سے پہلے کبھی ملا تھا اور نہ اس کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا مجھے ان کا نام تک معلوم نہیں، ان کے اس بے ساختہ اخلاق، اور اس جذبۂ ہمدردی نے جو اس کا محرک ہوا مجھے بہت متاثر کیا اور میں ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولونگا

آدھی رات کے سناٹے میں موٹر کے اس طویل سفر میں، میں انگریزوں اور ہندوستانیوں، حاکموں اور محکوموں، سرکاری عہدیداروں اور غیر سرکاری لوگوں کے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان کتنا زبردست خلیج حائل ہے

اور یہ ایک دوسرے سے کس قدر بددل اور بدظن ہیں لیکن اس بددلی اور بدگمانی کے علاوہ اجنبیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے ہر فریق دوسرے سے کھٹکتا ہے اور کھچا کھچا رہتا ہے۔ ایک دوسرے کو ترش رو اور روکھا نظر آتا ہے اور دونوں میں سے کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس پردے کے پیچھے شرافت اور انسانیت بھی ہے۔ انگریز ملک کے حاکم ہیں اور جاہ و منصب عطا کرنا ان کے اختیار میں ہے اس لئے بہت سے خوشامدی، ابن الوقت اور عہدوں کے خواہاں انھیں گھیرے رہتے ہیں اور انھی ناپاک نمونوں سے انھوں نے ہندوستانیوں کی سیرت کا اندازہ لگایا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں نے انگریزوں کو صرف افسروں کی حیثیت سے دیکھا، جو انسانیت سے خالی مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور ہر وقت اپنے مستقل حقوق کو محفوظ رکھنے کی دھن میں رہتے ہیں کسی شخص کے انفرادی رویے میں جب وہ اپنے انسانی جذبات کے ماتحت کام کرتا ہے، اور اس کے منصبی طرز عمل میں جب وہ ایک فوج کا سپاہی ہوتا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے۔ سپاہی جب ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو اس کی انسانیت رخصت ہو جاتی ہے۔ وہ ایک کل کے پتلے کی طرح حرکت کرتا ہے اور ان بے ضرر انسانوں پر گولی چلاتا ہے جنھوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہی حال اس پولیس کے افسر کا ہے جسے آج کسی شخص سے ذرا سی بدسلوکی کرنا بھی گوارا نہیں تو کل بے گناہوں پر بے تکلف لاٹھی چارج کرتا ہے۔ اس وقت نہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے نہ مجمع کے ان افراد کو جن پر وہ لاٹھیاں اور گولیاں برساتا ہے۔

جب کوئی شخص دوسرے فریق کو جماعت یا مجمع کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو انسانی رشتہ غائب ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جماعت بھی افراد سے

مردوں، عورتوں اور بچوں سے بنتی ہے جن کے سینے میں دل ہے اور اس میں محبت، نفرت اور تکلیف کا احساس موجود ہے۔ انگریز اگر صاف گوئی سے کام لیں تو یہ کہیں گے کہ انھوں نے ہندوستانیوں میں بعض معقول آدمی بھی دیکھے ہیں مگر وہ استثنا کا حکم رکھتے ہیں۔ ورنہ عموماً ہندوستانی سخت قابل نفرت ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی بھی یہی کہیں گے کہ وہ چند ایسے انگریزوں کو جانتے ہیں جو قابل تعریف ہیں لیکن انھیں چھوڑ کر باقی سب کے سب مغرور، ظالم اور بد ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہر شخص دوسری قوم کا اندازہ ان افراد سے نہیں لگاتا جن سے اسے انسان کی حیثیت سے سابقہ پڑا ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے جن سے وہ بالکل ناواقف ہوتا ہے یا بہت کم واقفیت رکھتا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے میں بڑا خوش نصیب ہوں کیونکہ میرے ہموطن اور انگریز دونوں بلا استثنا ہمیشہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آئے یہاں تک کہ وہ پولیس والے جنھوں نے مجھے گرفتار کیا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے اور جیلر وغیرہ بھی مجھ سے بڑی مہربانی سے پیش آتے رہے اور ان کی اس انسانیت کی وجہ سے لڑائی کی تلخیوں اور جیل کی زندگی کی سختیوں میں بہت کچھ کمی ہو گئی میرے ہموطنوں کا مجھ سے اچھا سلوک کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ ان میں تو مجھے کچھ نہ کچھ شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ لیکن انگریز بھی مجھے محض ایک جماعت کے رکن نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت دیتے رہے۔ میں نے انگلستان میں تعلیم پائی ہے اور وہاں کے ایک پبلک اسکول میں رہا ہوں۔ شاید اس وجہ سے وہ مجھے اپنے سے قریب تر سمجھتے ہیں۔ اور چاہے میری قومی سرگرمیاں انھیں کتنی ہی نامعقول معلوم ہوتی ہوں لیکن وہ اپنے معیار کے مطابق مجھے کم و بیش مہذب ضرور سمجھتے ہیں میرے ساتھ جو خاص مراعات کی جاتی تھیں جب میں اس کا مقابلہ اپنے ساتھیوں

لی حالت سے کرتا تھا۔ تو اکثر مجھے اس سے تکلیف ہوتی تھی اور شرم آتی تھی۔
لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود جیل پھر جیل ہے اور وہاں تکلیف دہ ماحول کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ وہاں کی ساری فضا تشدد، کمینہ پن، رشوت اور جھوٹ سے ناپاک تھی جیل کے ملازم یا تو انتہائی خوشامد کرتے تھے یا گالی سے بات کرتے تھے۔ جو شخص حساس طبیعت رکھتا ہو وہ ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر طبیعت جھنجلاتی تھی کسی خط یا اخبار میں کوئی بری خبر دیکھ کر کچھ دیر کے لئے پریشانی یا غصے سے دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ باہر تو کام میں لگے رہنے سے تسکین رہتی تھی اور مختلف دلچسپیاں اور سرگرمیاں دماغ اور جسم کا توازن قائم رکھتی تھیں، لیکن جیل میں گھٹے ہوئے جذبات کے نکاس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اور آدمی اندر ہی اندر کھولتا رہتا تھا اسی وجہ سے اس کی رائے ہر معاملے کے متعلق یکطرفہ اور غلط ہوتی تھی۔ اور بیماری تو جیل میں بڑی سخت مصیبت تھی۔
پھر بھی میں نے جیل کے معمولات کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا۔ اور کافی جسمانی ورزش اور دماغی محنت کے ذریعے سے اپنی صحت کو قائم رکھا۔ ورزش اور محنت کی باہر کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن جیل میں یہ نہایت ضروری چیز ہے کیونکہ اس کے بغیر صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے میں اوقات کی نہایت سختی سے پابندی کرتا تھا اور اور جہاں تک ممکن تھا اپنے پرانے معمولات کو قائم رکھتا تھا، تاکہ طبیعت سست نہ ہونے پائے۔ مثلاً میں پابندی سے داڑھی مونڈتا تھا (جیل میں مجھے سیفٹی ریزر رکھنے کی اجازت تھی) میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ لوگ عموماً ان کی پروا نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور کاموں میں بھی سست پڑ جاتے ہیں۔ دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد شام کی تکان بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور رات کو بڑے مزے کی نیند آتی تھی۔

اس طرح دن، ہفتے اور مہینے گذرتے گئے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی مہینہ ایسا بھاری ہوجاتا تھا کہ کاٹے نہ کٹتا تھا۔ اور بعض اوقات میں دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے بیزار ہوجاتا تھا، اپنے جیل کے ساتھیوں سے جیل کے عملے سے، باہر والوں سے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا یا ایسا کیوں نہ کیا، سلطنت برطانیہ سے (مگر اس سے تو میں ہمیشہ سے بیزار تھا)۔ اور سب سے زیادہ اپنے آپ سے میں سخت اعصابی بے چینی میں مبتلا رہتا تھا اور وہ نفسی کیفیتیں جو ایک قیدی پر گذرتی ہیں، مجھ پر بڑی شدت سے طاری ہوتی تھیں۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے دوروں سے بہت جلد افاقہ ہوجاتا تھا۔

جیل میں ملاقات کا دن ہمارے لئے عید کا دن ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کے انتظار میں دن گنا کرتا تھا۔ لیکن ملاقات کا جوش ختم ہونے کے بعد فطرتًا اس کا ردعمل شروع ہوتا تھا یعنی ہمیں بڑی تنہائی اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ملاقاتیں خوشگوار ثابت نہیں ہوتی تھیں۔ یعنی کوئی پریشان کن خبر سننے میں آتی تھی یا کوئی اور بات ایسی ہوتی تھی جس کی وجہ سے میں رنجیدہ ہوجاتا تھا۔ ملاقات کے موقعوں پر جیل کے افسر تو موجود رہتے ہی تھے لیکن بریلی میں دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ خفیہ پولیس والے بھی کاغذ پنسل لئے بیٹھے تھے اور جو لفظ ہماری زبان سے نکلتا تھا اُسے بڑے شوق سے لکھتے جاتے تھے۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آتا تھا اور ان ملاقاتوں کا سارا لطف جاتا رہتا تھا۔

اس کے بعد جب الہ آباد جیل میں ایک ملاقات کے موقع پر میری ماں اور بیوی کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا گیا اور حکومت نے بھی اس کا کوئی تدارک نہیں کیا تو میں نے احتجاج کے طور پر ان ملاقاتوں کو جو میرے لئے اس قدر قیمتی تھیں ترک کردیا۔ قریب قریب سات مہینے تک میں کسی شخص سے نہیں ملا۔

میرے لئے یہ بڑے سخت دن تھے ۔ اس کے بعد جب میں نے دوبارہ ملاقات کا سلسلہ شروع کیا اور میرے عزیز پہلے پہل مجھ سے ملنے آئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ کس قدر خوشی ہوئی ۔ میری بہن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ آئے تھے ۔ ان میں سے ایک ننھا سا بچہ حسب عادت میرے کاندھے پر چڑھ گیا تو مجھے اپنے جذبات کا ضبط کرنا مشکل ہو گیا ۔ اتنے دن تک انسانوں کی صحبت کے لئے ترسنے کے بعد گھر کی زندگی کے لطف نے مجھے بے چین کر دیا ۔

جس زمانے میں ملاقات کا سلسلہ بند تھا مجھے گھر کے یا دوسرے جیلوں کے خطوں کا (کیونکہ میری دونوں بہنیں جیل میں تھیں) اور زیادہ بےچینی سے انتظار رہنے لگا۔ اور یہ چیز میرے لئے اور بھی قیمتی ہو گئی ۔ اگر مقررہ وقت پر خط نہ پہنچتا تو مجھے سخت پریشانی ہوتی لیکن جب آجاتا تو مجھے اس کے کھولنے میں ایک قسم کی ہچکچاہٹ سی ہوتی ۔ میں اس سے اس طرح کھیلتا رہتا جیسے کوئی اپنی محبوب چیز سے کھیلتا ہے جو اپنے قابو میں ہو ۔ اور میرے دل کی تہہ میں یہ خیال بھی کھٹکتا رہتا کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا بات نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہنچے ۔ خط بھیجنے اور خط پانے دونوں سے پرسکون زندگی میں بڑا خلل واقع ہوتا ہے ۔ ان سے جذبات میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے جس سے تکلیف ہوتی ہے ایک دو روز تک خیالات پریشان رہتے ہیں اور روزمرہ کے کام پر پوری توجہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

نینی اور بریلی کے جیلوں میں ہمارے ساتھ بہت سے لوگ تھے لیکن ڈیہرہ دون میں شروع شروع میں صرف ہم تین آدمی تھے یعنی گووند بلبھ پنتھ ۔ کاشی پور کے کنور آنند سنگھ اور میں ۔ دو ایک مہینے بعد پنتھ جی اپنی چھ مہینے کی میعاد کاٹ کر چلے گئے لیکن دو صاحب اور تشریف لے آئے جنوری ۱۹۳۳ء تک سب ساتھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا ۔ آخر اگست میں مجھے رہائی ملی ۔ اس عرصے میں

یعنی پورے آٹھ مہینے دیرہ دون جیل میں، میں نے بالکل تنہائی کی زندگی گذاری یہاں تک کہ کوئی بات کرنے کو بھی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جیل کا کوئی اہلکار چند منٹ کے لئے آنکلتا تھا۔ اگرچہ اصطلاحی طور پر مجھے قید تنہائی کی سزا نہیں دی گئی تھی لیکن یہ صورت قریب قریب وہی تھی۔ میرے لئے یہ بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ اچھا ہوا کہ میں نے ملاقات کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سے مجھے کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک خاص رعایت یہ تھی کہ مجھے باہر سے تازہ پھول منگانے اور چند فوٹو رکھنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ ان سے میرا جی بہت کچھ بہل جاتا تھا عموماً جیل میں پھولوں اور تصویروں کے رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اکثر لوگوں نے میرے لئے پھول بھیجے۔ لیکن مجھے ان کے لینے کی اجازت نہیں ملی۔ بات یہ ہے کہ جیل کی کوٹھری میں خوشنمائی پیدا کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے میرے ایک ساتھی کو جو میرے برابر کی کوٹھری میں رہتے تھے۔ اس بات پر تنبیہ کی کہ انھوں نے اپنا منہ ہاتھ دھونے کا سامان سلیقے سے سجا کر رکھا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اپنی کوٹھری کو اس طرح مت سجاؤ کہ اس سے آرائش اور "عیش پسندی" ظاہر ہو۔ اب ذرا اس سامان عیش کی فہرست بھی ملاحظہ کیجئے۔ ایک دانت صاف کرنے کا برش، منجن کی شیشی، فاؤنٹن پن کی روشنائی، سر میں ڈالنے کے تیل کی ایک بوتل، ایک برش، ایک کنگھا اور شاید دو ایک اور چھوٹی چیزیں۔

جیل میں انسان کو روزمرہ کی معمولی معمولی چیزوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ وہاں اپنا ذاتی سامان بہت کم ہوتا ہے، اس میں آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکتا اگر کوئی چیز کھو جائے تو دوبارہ منگانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے ہر شخص انھیں بہت عزیز رکھتا ہے وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کرتا ہے جو باہر عموماً

ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہیں۔ ملکیت کا جذبہ وہاں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا جہاں کوئی چیز جو رکھنے کے قابل ہو میسر نہیں آتی۔

کبھی کبھی زندگی کی خوش گوار چیزوں کے لئے دل تڑپتا ہے مثلاً جسمانی آرام و آسائش، خوشگوار ماحول، دوستوں کی صحبت، دلچسپ گفتگو، بچوں کے ساتھ کھیلنا . . . . کبھی اخبار میں کوئی تصویر یا فوٹو دیکھ کر پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جوانی کی بے فکریوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ گھر کی یاد کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی ہے اور سارا دن بے چینی میں کٹتا ہے۔

میں روز تھوڑی دیر چرخہ کاتتا تھا کیونکہ ذہنی کام کرنے کے بعد جسمانی محنت سے سکون حاصل ہوتا تھا لیکن میرا خاص شغل لکھنا پڑھنا تھا۔ جو کتابیں میں چاہتا تھا وہ سب مجھے نہیں مل سکتی تھیں کیونکہ اس معاملے میں بڑی پابندیاں تھیں اور سختی سے احتساب ہوتا تھا۔ احتساب کرنے والے بعض اوقات نااہل لوگ ہوتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ اسپنگلر کی کتاب "زوال مغرب" اس لئے روک دی گئی کہ کتاب کا نام خطرناک اور باغیانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے شکایت کا موقع نہیں ہے اس لئے کہ پھر بھی مجھے بہت سی مختلف قسم کی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ اس معاملے میں بھی میرے ساتھ خاص رعایت تھی کیونکہ میرے بہت سے ساتھیوں کو (جو درجہ اول کے قیدی تھے) مسائل حاضرہ کے متعلق کتابیں ملنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ بنارس جیل میں وھائٹ پیپر تک (جس میں حکومت برطانیہ کی دستوری تجاویز درج تھیں) منگانے کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اس میں سیاسی معاملات کی بحث تھی۔ برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی سے ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

جب ہندوستان میں معمولی سے معمولی مدنی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں تو قیدیوں کے حقوق کا تذکرہ کرنا فضول ہے۔ پھر بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ اگر ایک عدالت کسی شخص کو قید کی سزا دیتی ہے تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جسم کے ساتھ دماغ کو بھی سزا دی جائے۔ قیدی کا جسم پابند ہے لیکن دماغ کیوں نہ آزاد ہو؟ ہندوستان کے جیلوں کے ارباب حل وعقد یقیناً اس سوال پر برافروختہ ہوں گے۔ کیونکہ ان میں جدید خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت، اور غور و فکر کی عادت عموماً بہت کم ہوتی ہے۔ احتساب یوں بھی بے انصافی اور حماقت کا فعل ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کی بدولت بہت سی جدید مطبوعات اور ترقی پذیر رسائل اور اخبارات سے محروم رہتے ہیں۔ ممنوعہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ قیدیوں کو وہ کتابیں بھی نہیں ملتیں جن کی جیل کے باہر خریدنے اور پڑھنے کی قانوناً اجازت ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا تھا۔ وہاں نیویارک کے مشہور و معروف سنگ سنگ جیل میں چند اشتمالی رسائل کی ممانعت تھی۔ امریکہ کے حکمراں طبقہ کو اشتمالیوں سے خاص کد ہے لیکن اس کے باوجود جیل کے حکام نے یہ تسلیم کیا کہ قیدیوں کو ہر طرح کی مطبوعات حتیٰ کہ اشتمالی رسائل و اخبارات بھی منگانے کا حق ہے۔ جیل کے وارڈن نے اس میں صرف ایک استثنا کیا تھا یعنی ان کارٹونوں کی اجازت نہیں دی تھی جنھیں وہ اشتعال انگیز سمجھتا تھا۔

ہندوستان کی جیلوں کے متعلق ذہنی آزادی کے مسئلہ پر بحث کرنا بالکل فضول ہے کیونکہ یہاں تو عام قیدیوں کو نہ کوئی اخبار ملتا ہے اور نہ لکھنے کا سامان احتساب کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو ان سب چیزوں کی ایک سرے سے ممانعت ہے صرف درجہ اول کے قیدیوں کو لکھنے کا سامان ملتا ہے لیکن روزانہ اخبار ان میں

سے بھی سب کو نہیں دئے جاتے اور جنھیں ملتے بھی ہیں تو وہی اخبار جنھیں حکومت پسند کرتی ہے۔ رہے دوسرے اور تیسرے درجے کے سیاسی اور غیر سیاسی قیدی ان کے لئے اصولاً لکھنے کا سامان ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بعض سیاسی قیدیوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انھیں لکھنے کا سامان دیدیا جاتا ہے لیکن اکثر یہ رعایت منسوخ ہوتی رہتی ہے۔ درجہ اول کے قیدی ہزار میں ایک سے زیادہ نہ ہوتے ہونگے اس لئے ہندوستانی قیدیوں کی عام حالت پر غور کرتے وقت ہم انھیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے۔ جہاں تک کتابوں اور اخبارون کا تعلق ہے، درجہ اول کے ان خوش نصیب، قیدیوں کو بھی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو اکثر مہذب ممالک کے عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔

بقیہ قیدیوں یعنی ہزار میں نو سو ننانوے کو ایک وقت میں دو تین کتابیں منگانے کی اجازت ہے لیکن پابندیاں اتنی سخت ہیں کہ عام طور پر وہ اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لکھنا یا کتابوں کے نوٹ لینا بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔ ذہنی تربیت کو جان بوجھ کر اس طرح روکنا بہت عجیب اور معنی خیز ہے۔ قیدیوں کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کے دماغ کی تربیت کی جائے اور اس کا رُخ بدلا جائے۔ انھیں لکھنا پڑھنا اور کوئی کارآمد ہنر سکھایا جائے لیکن ہندوستان میں جیل کے حکام کو شاید یہ بات نہیں سوجھی۔ کم سے کم صوبہ متحدہ میں تو اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ابھی کچھ عرصے سے لڑکوں اور نوجوان قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش شروع ہوئی ہے۔ لیکن وہ بالکل ناکافی ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے وہ قطعًا نااہل ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیدی پڑھنے لکھنے کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس بہت سے قیدی اسی

غرض سے آتے تھے اور میں نے دیکھا کہ انھیں لکھنے پڑھنے کا دل سے شوق تھا جن قیدیوں سے ملنے کا ہمیں موقع ملا تھا ہم انھیں پڑھاتے تھے اور وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ اکثر جب آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ دو ایک قیدی بارک کے اندر دھندلی سی لالٹین کے پاس بیٹھے اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

غرض میں کتب بینی میں مصروف رہتا تھا۔ میں اپنے مطالعے کا موضوع بدلتا رہتا تھا مگر عموماً ٹھوس کتابیں پڑھتا تھا۔ ناولوں سے ذہن سست ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے زیادہ ناولیں نہیں پڑھیں جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو لکھنے لگتا تھا۔ تاریخ عالم کے موضوع پر میں نے اپنی لڑکی کے نام خطوں کا جو سلسلہ لکھا ہے اس میں میں اپنی سزا کے پورے دو سال مصروف رہا۔ اور اس سے میرے ذہن کی چستی اور مستعدی قائم رہی۔ ایک حد تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اسی دور ماضی میں رہتا ہوں جس کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں اس لئے میں اپنے جیل کے ماحول کو قریب قریب بھول گیا تھا۔

سفرنامے پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ مثلاً ہیون سانگ، مارکو پولو، ابن بطوطہ وغیرہ پرانے سیاحوں کے تذکرے اور زمانہ حال کے لوگوں مثلاً ہیڈن (جس نے وسطی ایشیا کے ریگستانوں میں سفر کیا ہے) اور روئیج (جس نے تبت کے بڑے دلچسپ واقعات لکھے ہیں) وغیرہ کی کتابیں۔ تصویروں کی کتابیں خصوصاً پہاڑوں برف کے تودوں۔ اور ریگستانوں کی تصویریں دیکھنے میں بھی بڑا لطف آتا تھا کیونکہ جیل میں ہر شخص وسیع فضاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے لئے ترستا ہے۔ میرے پاس موں بلاں کوہ آلپس، اور ہمالیہ کی تصویروں کی چند خوبصورت کتابیں تھیں میں اکثر انھیں دیکھا کرتا تھا اور جب میری کوٹھری یا بارک کا درجہ حرارت ۱۱۵

ڈگری یا اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا تو ہیں برف کے ان تودوں کو حسرت سے تکتا کرتا تھا۔ اٹلس کو دیکھ کر طبعیت میں بڑا ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ اس سے ان جگہوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جنھیں ہم دیکھ چکے تھے اور ان مقامات کا تصور بندھ جاتا تھا جنھیں دیکھنے کا ارمان تھا۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان پُرانے منظروں کا پھر لطف اٹھائیں۔ ان نقطوں اور نشانوں کی سیر کریں جو بڑے بڑے شہروں کو ظاہر کرتے ہیں، ان موٹی گہری لکیروں پہ سے گذریں جو پہاڑوں کی علامت ہیں اور ان نیلے دھبوں کو عبور کریں جو سمندر کی نشانی ہیں۔ غرض دنیا کے تمام دلکش مناظر دیکھیں اور بدلتی ہوئی انسانی زندگی کی کش مکش کا مطالعہ کریں۔ یہ آرزوئیں ہمیں بےچین کر دیتی تھیں اور جلدی سے ہم حسرت و افسوس کے ساتھ اٹلس کو اٹھا کر رکھ دیتے تھے۔ اور پھر اسی چار دیواری میں لوٹ آتے تھے جو ہمیں گھیرے ہوئے تھی اور انہی بے کیف معمولات میں مصروف ہو جاتے تھے جو ہماری قسمت میں لکھے تھے

(۴۵)

قید خانے کے جانور

ایک سال اور ڈھائی مہینے میں نے دہرہ دون جیل میں اپنی چھوٹی سی کوٹھری یا کمرے میں گزارے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا میں اس کا ایک جزو بن گیا ہوں۔ میں اس کے ہر حصہ سے آشنا تھا۔ سفیدی سے پتی ہوئی دیواروں، ناہموار فرش اور کرم خوردہ چھت کی کڑیوں کے ایک ایک نشان اور ایک ایک داغ سے واقف تھا۔ باہر مختصر سے صحن میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے گچھے میرے پرانے دوست بن گئے تھے۔ میں اپنی کوٹھری میں تنہا نہیں تھا اس لئے کہ یہاں ہر قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑوں اور بھڑوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ کڑیوں کے پیچھے چھپکلیوں کا ڈیرہ تھا جو ہر شام کو اپنے شکار کی تلاش میں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کے خیالات و جذبات کا کوئی نقش اس کے گرد و پیش میں باقی رہ جاتا ہے تو یقین ہے کہ اس کوٹھری کی تنگ فضا بھی طرح طرح کے خیالات سے معمور ہو گی اور وہ ہر چیز میں بسے ہوئے ہوں گے۔

دوسرے قید خانوں میں میں اچھی اچھی کوٹھریوں میں رہا ہوں لیکن دہرہ دون جیل میں مجھے ایک ایسی رعایت حاصل تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ یہاں کا اصل جیل خانہ نہایت مختصر ہے اور ہم جیل کے احاطہ ہی میں مگر اس کی دیواروں سے باہر ایک پرانی حوالات میں رہتے تھے۔ یہ جگہ

بہت چھوٹی تھی اس قدر چھوٹی کہ اس میں ٹہلنے کی مطلق گنجائش نہ تھی لہذا ہمیں اجازت تھی کہ اپنی کوٹھری سے باہر جیل کے پھاٹک کے سامنے جو تقریباً سو گز کے فاصلہ پر تھا صبح و شام ٹہل سکیں۔ گویا احاطۂ جیل میں رہنے کے باوجود ہم اس کی دیواروں سے باہر نکل کر پہاڑ اور کھیتوں کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ پاس ہی آمد و رفت کے لئے ایک سڑک بھی تھی۔ لیکن اس رعایت سے جس کا میں نے ذکر کیا ہے صرف میں ہی نہیں بلکہ درجہ الف اور ب کے تمام قیدی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جیل کی دیواروں سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر ہی ایک اور چھوٹی سی حوالات بھی تھی جو یورپین حوالات کہلاتی تھی۔ اس کے ارد گرد کوئی دیوار نہ تھی لہذا اس میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہستان کے دلفریب منظر اور بیرونی زندگی کا نظارہ ممکن تھا۔ یورپین مجرم اور دوسرے قیدی جو یہاں رکھے گئے تھے انھیں بھی صبح و شام جیل خانہ کے پھاٹک کے سامنے چہل قدمی کی اجازت حاصل تھی۔

صرف وہی قیدی جو ایک مدت تک جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر بند رہیں اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی حدود سے باہر ٹہل لینا یا بیرونی دنیا کے وسیع اور کشادہ منظر سے لطف اندوز ہونا نفسیاتی اعتبار سے کیسی عجیب و غریب نعمت ہے۔ مجھے جیل سے باہر نکلنے کا اس قدر شوق تھا کہ برسات کے موسم میں بھی جب موسلا دھار بارش کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہتا اور مجھے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں چلنا پڑتا میں نے باہر نکل کر ٹہلنا ترک نہیں کیا۔ اس قسم کی چہل قدمی یوں تو ہر جگہ اچھی معلوم ہوتی مگر قریب ہی سر بفلک ہمالیہ کا منظر میرے لئے مزید خوشی کا باعث ہوتا تھا جس سے دم بھر کے لئے قید خانے کی پریشانی اور کلفت بڑی حد تک رفع ہو جاتی

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس طویل عرصہ میں جب ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل مسدود ہو جاتا اور مجھے کئی مہینے لگاتار تنہا رہنا پڑتا یہ محبوب پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ کوٹھری کے اندر سے اگرچہ میرے لئے ان کا لطف اٹھانا ناممکن تھا مگر ان کا تصور میرے دل میں اس طرح سما گیا تھا کہ مجھے ان کے قرب کا ہر وقت احساس رہتا۔ معلوم ہوتا تھا میرے اور ان کے درمیان ایک پراسرار ربط قائم ہو گیا۔

پرندوں کے جھنڈ اڑتے اڑتے نظر سے غائب ہو گئے۔
اور وہ بادل کا اکیلا ٹکڑا بھی تیرتا ہوا دور چلا گیا۔
میں تنہا بیٹھا ہوں اور میرے آگے بہت دور چنگ ٹنگ
کی بلند چوٹی کھڑی ہے۔
ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں اکتاتے۔ پہاڑ اور میں

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ شاعر لی تے پو کی طرح مجھے پہاڑوں سے کبھی وحشت نہیں ہوئی لیکن یہ بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً مجھے ان کے قرب سے ایک طرح کی تسکین محسوس ہوتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پہاڑوں کا وقار اور ثبات، لاکھوں کروڑوں برس کی حکمت و دانائی سے مالا مال مجھے چشم نمائی کرتا ہے، میرے تلون پر ہنستا ہے اور میرے بے چین دل کو سکون اور تقویت بخشتا ہے۔

ہندوستان کے نشیبی میدانوں کی نسبت دہرہ دون میں بہار کا موسم طویل بھی ہوتا ہے اور خوش گوار بھی۔ جاڑے میں درختوں کے پتے گر گئے تھے اور وہ ننگے ہو کر رہ گئے تھے تعجب تو یہ ہے کہ پیپل کے وہ چار بڑے بڑے درخت بھی جو پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے پتوں سے قریب قریب خالی

ہو گئے تھے اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ مگر پہاڑ کی ہواؤں نے انھیں پھر گرما دیا اور ان کے رگ و ریشہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دفعتہً ان پیپل کے پیڑوں اور تمام درختوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور ایک طلسمات کا عالم نظر آنے لگا جیسے پردے کے پیچھے پر اسرار قوتیں کام کر رہی ہوں میں ان کی شاخوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹتے دیکھ کر چونک پڑتا تھا۔ یہ منظر نہایت ہی خوش گوار اور مسرت خیز تھا دفعتہً لاکھوں کروروں پتے بڑی سرعت کے ساتھ شاخوں پر نمودار ہو کر آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھے اور پھر ہوا کی تال پر رقص کرنے لگے۔ کونپلوں کا دیکھتے ہی دیکھتے پتے بن جانا کس قدر عجیب و غریب منظر ہے۔

اس سے پہلے میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ آم کے نئے پتوں کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے موسم خزاں میں کشمیر کے پہاڑوں پر ہلکا گلابی رنگ چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ آم کے پتے بہت جلد اپنا رنگ بدل کر پھر سبز ہو جاتے ہیں۔

برسات کی بارشیں ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ گرمی کی تپش کو بجھا دیتی ہیں۔ مگر کبھی نعمت کی فراوانی زحمت بھی بن جاتی ہے اور دہرہ دون بارش کے دیوتا کا استھان ہے۔ برسات کی ابتدا میں شروع ہی کے پانچ چھ ہفتوں میں یہاں تقریباً پچاس ساٹھ انچ بارش ہو جاتی ہے۔ اس وقت جیل کے ایک تنگ گوشے میں دبک کر بیٹھ جانا اور یہ کوشش کرنا کہ آدمی ٹپکتی ہوئی چھت کے پانی یا کھڑکیوں میں سے آنے والی بوچھار سے بچا رہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

برسات کے بعد خزاں کا موسم نہایت خوش گوار ہوتا تھا اور جاڑا۔

بشرطیکہ بارش نہ ہو۔ پانی کی بوچھار، بجلی کی کڑک، تیز و تند ہواؤں کے چلنے سے دم الجھتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ایک اچھا مکان، کسی قدر آسائش اور گرمی میسر ہو۔ بعض اوقات اُولے گرتے تھے اور ایک ایک اولا کھیلنے کی گولی سے بڑا ہوتا تھا۔ جب یہ اُولے نالی دار آہنی چھت پر گرتے تو ان سے کچھ اس قسم کا زبردست شور پیدا ہوتا تھا جیسے توپیں چل رہی ہوں۔

ایک دن مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کی چوبیسویں تاریخ تھی۔ دن بھر رعد و باراں کا زور رہا۔ سردی نہایت سخت تھی جسمانی تکلیف کے لحاظ سے یہ سب سے بُرا دن تھا جو میں نے جیل میں گذارا۔ لیکن شام کو دفعتہً مطلع صاف ہو گیا۔ ارد گرد کے تمام پہاڑ اور پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں یہ دیکھ کر میری تمام افسردگی اور کلفت دور ہو گئی۔ اگلے روز بڑا دن تھا صاف اور خوش گوار اور برف آلود پہاڑوں کا منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا تھا۔

روز مرہ کے مشاغل سے محروم ہونے کی وجہ سے ہمیں فطرت کے مشاہدے کا شوق ہو گیا۔ مختلف قسم کے جانوروں اور کیڑوں کو جو وہاں موجود تھے ہم بہت غور سے دیکھنے لگے۔ جب میری مشاہدے کی قوت بڑھ گئی تو میں نے دیکھا کہ میری کوٹھری اور باہر صحن میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے موجود ہیں اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں تنہائی کی شکایت کرتا تھا اور یہ خبر نہ تھی کہ وہ احاطہ جو بظاہر خالی اور ویران معلوم ہوتا تھا زندگی سے معمور ہے۔ ان رینگنے اور اُڑنے والے کیڑوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا اس لئے میں نے بھی انھیں نہیں چھیڑا۔ البتہ کھٹملوں اور مچھروں اور ایک حد تک مکھیوں سے میری لڑائی مسلسل جاری رہی۔ بھڑوں اور زہریلے کیڑوں سے جو بھنکرتوں کی تعداد

میں میری کوٹھری میں موجود تھے میں نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ مجھ میں اور ان میں صرف ایک دفعہ ذرا سا جھگڑا ہوا تھا۔ شاید ایک بھڑ نے نادانستہ طور پر مجھے کاٹا اور مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں نے ان کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن انھوں نے اپنے چھتوں کو بچانے کے لئے جن میں غالباً ان کے انڈے تھے بڑی بہادری سے میرا مقابلہ کیا۔ مجبوراً مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑا اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر آئندہ انھوں نے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی تو میں بھی ان کو اپنے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس واقعہ کے بعد میں ایک سال سے کچھ اوپر ہی اس کوٹھری میں رہا ہوں لیکن ان بھڑوں یا زہریلے کیڑوں نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا اور ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔

چمگادڑوں سے مجھے نفرت تھی لیکن مجبوراً انھیں بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ نہایت خاموشی سے پرواز کرتے اور ایک لحظہ کے لئے آسمان کی تاریک فضا کے مقابل نظر آجاتے۔ ان بھیانک جانوروں سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ میرے چہرے کے برابر سے گذر جاتے ہیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔ بڑے بڑے چمگادڑ فضا میں بہت اوپر پرواز کرتے تھے۔

میں گھنٹوں چیونٹی، دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اور چھپکلیوں کا جب وہ شام کو رینگتی ہوئی چپکے چپکے اپنے شکار کو تاکتی رہتیں یا کبھی نہایت ہی مضحک انداز سے دُم ہلا ہلا کر ایک دوسرے کا پیچھا کرتیں۔ عام طور پر یہ بھڑوں کی طرف سے بچتی تھیں لیکن دو مرتبہ میں نے دیکھا کہ اُنھوں نے نہایت احتیاط سے بھڑوں کا پیچھا کیا اور پھر دفعتہً سر سے انھیں دبوچ لیا۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو

ڈنک سے بچا یا یا یہ محض اتفاقی بات تھی۔

ان کے علاوہ گلہریاں قریب کے درختوں پر بے شمار تھیں۔ کبھی کبھی انھیں یہاں تک جرأت ہوتی کہ ہمارے پاس چلی آتیں۔ لکھنؤ جیل میں میں کئی کئی گھنٹے قریب قریب بے حس و حرکت بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس اثنا میں اکثر ایسا ہوتا کہ ایک گلہری میری ٹانگ سے ہوتی ہوئی گھٹنہ پر آ بیٹھتی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دفعتہً میری آنکھیں اس سے چار ہوتیں اور وہ محسوس کرتی کہ میں کوئی درخت وغیرہ نہیں ہوں جو اس نے مجھے سمجھ رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خوف سے ٹھٹکتی اور پھر نہایت تیزی کے ساتھ بھاگ جاتی۔ بعض اوقات گلہریوں کے چھوٹے چھوٹے بچے درختوں پر سے گر پڑتے۔ ان کی ماں گلہری بھی ان کے پیچھے ہی آ جاتی اور ایک چھوٹی سی گیند کی طرح ان کا گچھا سا بنا کر انھیں کسی محفوظ گوشہ میں لے جاتی۔ کبھی یہ بچے گم بھی ہو جاتے تھے۔ ایک بار میرے ایک رفیق کو اسی قسم کی تین گلہریاں مل گئیں جن کی ہم بہت دیر تک دیکھ بھال کرتے رہے۔ یہ گلہریاں اس قدر چھوٹی تھیں کہ ان کو کھلانا پلانا نا ممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ آخر یہ مسئلہ ایک نئی ترکیب سے حل کیا گیا یعنی ہم نے فونٹین پین میں روشنائی ڈالنے کی نلکی کی نوک پر ذرا سی روئی لگا دی۔ اور اس سے دودھ پلانے کی بوتل کا کام لیا۔

کبوتروں سے میں نے کوئی جیل خالی نہیں پایا۔ سوائے الموڑہ کے کوہستانی قید خانہ کے۔ دہرہ دون میں سینکڑوں ہزاروں کبوتر تھے شام کو ان کے جھنڈ کے جھنڈ سطح آسمان پر چھا جاتے۔ بعض اوقات جیل کے عہدہ داران ان کا شکار کرتے اور کھا جاتے۔ یہاں مینائیں بھی تھیں جو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ان کے ایک جوڑے نے میری کوٹھری کے دروازہ کے بالکل

اوپر اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا اور ان کی خوراک کا انتظام میرے ذمہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئیں کہ اگر صبح یا شام ان کے کھانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرے پاس چلی آتیں اور شور مچا مچا کر اپنی غذا طلب کرتیں۔ ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ دیکھ کر اور بے صبری کی چیخوں کو سن کر مجھے بے حد لطف آتا تھا۔

طوطوں

نینی میں بہت سے ~~توتوں~~ نے میری بارک کی دیواروں میں درزوں کے اندر اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے اختلاط اور اظہار محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو نر توتوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی ان موقعوں پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی اور جس کی فتح ہوتی اسے اپنا مورد عنایت بناتی۔

دہرہ دون میں طرح طرح کے پرند موجود تھے ان کے چہچہوں سے ایک شور برپا ہو جاتا تھا۔ مگر کوئل کی دردناک کوک ان سب پر غالب آجاتی تھی برسات اور برسات سے کچھ پہلے "دماغی بخار" کا پرند آجاتا اور مجھے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ دن ہو یا رات، دھوپ ہو یا بارش یہ پرندہ لگاتار ایک ہی نغمہ الاپتا رہتا ہے ہمیں اکثر پرندے نظر نہیں آتے تھے۔ ہم صرف ان کی آواز سنتے تھے ہمارے مختصر سے صحن میں کوئی درخت نہیں تھا البتہ میں عقابوں اور چیلوں کو دیکھا کرتا تھا جو بہت اوپر ہوا میں نہایت خوب صورتی سے منڈلایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیر کی طرح نیچے گرتیں اور پھر ہوا کے جھونکے میں اوپر اٹھ جاتیں۔ مرغابیوں کا جھنڈ البتہ ہمارے سروں پر سے گذر جاتا تھا۔

بریلی جیل میں بندروں نے ایک بہت بڑی نوآبادی قائم کر رکھی

تھی۔ ان کی حرکتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے
ایک بندر کا بچہ کسی طرح ہماری بارک کے احاطہ میں آگیا اور باوجود کوشش
کے دیوار کو نہیں پھاند سکا۔ یہ دیکھ کر جیل کے محافظوں، قیدیوں اور قیدی
نگرانوں نے پکڑ کر اس کی گردن میں رسی ڈال دی۔ اس کے ماں باپ ایک
اونچی سی دیوار پر بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کا غصہ لحظہ بلحظہ بڑھ
رہا تھا۔ دفعتہً ان میں سے ایک جغادری بندر نیچے کود پڑا اور اس ہجوم پر
جس نے بندر کے بچہ کو گھیر رکھا تھا حملہ کر دیا۔ یہ فعل غیر معمولی جرائت اور دلیری
کا کام تھا اس لئے کہ محافظ اور قیدی نگراں ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے
لئے اس کو دھمکا رہے تھے اور ان کی تعداد بھی بڑی تھی آخر بے دریغ جرائت
کی فتح ہوئی اور انسانوں کا ہجوم لاٹھیاں اور ڈنڈے سب کچھ چھوڑ کر ڈر کے
مارے بھاگ گیا۔ یوں بندروں نے اپنے بچہ کو انسانوں کے ہاتھ سے
بچا لیا۔

بعض اوقات جیل میں ایسے جانور بھی چلے آتے تھے جن کا آنا کچھ بہت
زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ بچھوؤں کو میں اکثر اپنی کوٹھری میں دیکھتا تھا خصوصاً
رعد و باراں کے طوفان کے بعد۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے
نہیں کاٹا حالانکہ مجھے ان سے ایسی ایسی جگہوں پر سابقہ پڑا جہاں ان کی
موجودگی کا وہم بھی نہیں ہوتا تھا مثلاً بستر پر۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ میں نے
کوئی کتاب پڑھنے کے لئے اٹھائی، اور اس میں بچھو موجود تھا۔ میں نے
ایک نہایت سیاہ بچھو کو جو شکل سے بہت زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا
بوتل میں بند کر رکھا تھا اور اسے مکھیاں وغیرہ کھلایا کرتا۔ ایک دن میں نے
اس کو ڈوری میں باندھ کر دیوار پر چھوڑا تو وہ میرے ہاتھ سے بھاگ نکلا۔ اس کی

آزادی کو میں خطرناک سمجھتا تھا اس لئے میں نے اپنی کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

جیل میں میری کوٹھری میں یا اس کے قریب ہی تین چار سانپ بھی پائے گئے۔ ان میں سے ایک کی خبر کسی نہ کسی طرح باہر جا پہنچی اور اخباروں نے اسے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا سچ پوچھئے تو مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی بلکہ لطف آیا۔ قید خانہ کی زندگی بڑی بے کیف ہوتی ہے اور اس کی یکسانی کو جو چیز بھی توڑ دے وہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے سانپ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ان سے وحشت نہیں ہوتی جتنی بعض اور لوگوں کو ان کے ڈسنے سے بیشک ڈر معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی اس کا سامنا ہو جائے یقیناً اس سے اپنی حفاظت کی فکر کرتا ہوں میرے دل میں کراہیت یا غیر معمولی خوف کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ البتہ کھنکھجوروں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بلکہ ڈر سے زیادہ گھن آتی ہے۔ ایک مرتبہ علی پور جیل کلکتہ میں آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز میرے پاؤں پر رینگ رہی ہے۔ میں نے چور مشعل کو جلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کھنکھجورا بستر پر موجود ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے کودا اور کوٹھری کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ یہ موقعہ تھا جب میں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ پاولاف کی اضطراری حرکات کیا ہوں گی۔

دہرہ دون میں میں نے ایک نیا جانور دیکھا یوں کہنا چاہئے کہ وہ جانور میرے لئے نیا تھا۔ میں جیل کے پھاٹک میں کھڑا جیلر سے باتیں کر رہا تھا کہ ہمیں ایک شخص نظر آیا جو ایک عجیب و غریب جانور کو اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ جیلر نے اسے بلوا بھیجا تو میں نے دیکھا کہ یہ جانور چھپکلی اور مگر مچھ کے بین بین ہے۔ یہ تقریباً دو فٹ لانبا تھا اس کے پنجے اور کھال سفنہ دار تھی

اس بھنگم جانور کو جو ابھی زندہ تھا ایک عجیب و غریب طریق سے مروڑ کر جیسے گرہ لگائی جاتی ہے شکاری اسے بانس میں لٹکائے خوش خوش گھر لئے جا رہا تھا ہم نے دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ اس جانور کو 'بو' کہتے ہیں جیلر کے اس سوال سے کہ وہ اسے کیا کرے گا اس شخص کی باچھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگا کہ میں اس کی بھجیا بناؤں گا۔ یہ شخص جنگل کا رہنے والا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد جب میں ایف، ڈبلیو، چیپلن کی کتاب "جنگل اندھیرے اور روشنی میں"۔ کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس جانور کو پنگولین کہتے ہیں۔

قیدیوں اور بالخصوص ان مجرموں کے لئے جن کی سزا بہت طویل ہو سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ان کے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ جانوروں کو پال کر اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ عام قیدیوں کو اس کی اجازت نہیں ہوتی مگر قیدی نگراں جن کو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہو جاتی ہے ایسا کریں تو حکام جیل کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا عام طور پر گلہریاں اور عجیب بات یہ ہے کہ نیوسلے پالے جاتے ہیں کتوں کو تو جیل میں آنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی البتہ بلیوں پر کوئی قید نہیں ایک دفعہ بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ مجھ سے مانوس ہو گیا جس کو دراصل جیل کے ایک افسر نے پالا تھا۔ جب اس کی تبدیلی ہو گئی تو مجھے اس بچے کی جدائی کا واقعی افسوس ہوا۔ کتے اگرچہ جیل میں نہیں آسکتے لیکن دہرہ دون میں مجھے بالکل اتفاقی طور پر ان سے سابقہ پڑ گیا۔ ہمارے جیل کے افسروں میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ ایک کتیا لے آئے لیکن جب ان کی تبدیلی ہو گئی تو انھوں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اس پر یہ کتیا ادھر ادھر ماری ماری

پھرنے لگی۔ کبھی موریوں میں پڑی رہتی اور کبھی محافظین جیل کے یہاں سے اسے چند ٹکڑے مل جاتے۔ لیکن زیادہ تر اسے بھوکا ہی رہنا پڑتا۔ چونکہ میں قید خانہ کے باہر حوالات میں رہتا تھا اس لئے کبھی کبھی خوراک کی تلاش میں یہ کتیا میرے پاس بھی آنکلتی۔ میں نے اسے باقاعدہ کھلانا پلانا شروع کیا۔ کچھ دن گذر گئے تو اس نے ایک نالی میں بہت سے بچے دیے جن میں سے اکثر لوگ اٹھالے گئے مگر تین بچ گئے۔ ان کی خوراک کا اہتمام میرے ذمہ تھا مگر ایک مرتبہ جب ان میں سے ایک پلا بہت زیادہ بیمار ہو گیا تو مجھے اس کی وجہ سے بے حد تکلیف اٹھانا پڑی بعض اوقات مجھے رات کو بار بار اٹھنا پڑتا تاکہ اس کی نگہداشت کرسکوں۔ جب یہ پلا بچ گیا تو میں بہت خوش ہوا کہ میری تیمار داری رائگاں نہیں گئی۔

جیل سے باہر مجھے کبھی جانوروں سے اتنا سابقہ نہیں پڑا جتنا جیل کے اندر۔ یہ صحیح ہے کہ کتوں کا مجھے ہمیشہ شوق رہا ہے اور میں نے کئی بار ان کو پالا بھی لیکن اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے کبھی پوری طرح ان کی دیکھ بھال نہیں کرسکا۔ قید خانہ میں میں کتوں کی رفاقت سے خوش تھا۔ عام طور سے ہم ہندوستانی جانوروں کو پیار سے نہیں پالتے اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اہنسا کے عام فلسفہ کے ان سے اکثر لاپروائی بلکہ سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے ہی کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کو یہ جانور کس قدر محبوب ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کیا پرستش تک کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لئے بلوے بھی ہو جاتے ہیں۔ بایں ہمہ گائے سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے عبادت کے ساتھ شفقت کا ہونا ضروری نہیں۔

مختلف ممالک نے مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقاصد یا سیرت کے اظہار کے لئے علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ اور جرمنی نے عقاب، انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے لڑتا ہوا مرغا، قدیم روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان بنانے سے قوموں کی سیرت پر کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر ... لڑنے والے جانور بلکہ درندے ہیں۔ لہذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جن قوموں نے اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشونما پائی ہے انھوں نے خود بھی قصداً اس قسم کے عادات وخصائل اختیار کرلئے ہیں وہ دوسروں پر جھپٹتے ہیں غراتے ہیں اور موقع پاکر دبوچ لیتے ہیں اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں حلم اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان کا قومی نشان گائے ہے۔

(۴۶)

جدوجہد

جیل سے باہر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے بہادر مرد اور عورتیں پُرامن طریقے سے ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کا مقابلہ کر رہی تھیں گو انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اس وقت یا مستقبل قریب میں ان کی کامیابی ناممکن ہے دوسری جانب حکومت کے مسلسل اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تشدد سے یہ حقیقت آشکارا ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں اس کی بنا کس چیز پر قائم ہے۔ ہمیں کم سے کم اسی خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اس کا پردہ ریا چاک ہو گیا۔ بالآخر سنگینوں کو فتح ہوئی لیکن ایک بہت بڑے جنگجو کا قول ہے کہ "سنگینوں سے اور کام لے سکتے ہیں مگر ان پر بیٹھ نہیں سکتے" ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا اس طرح محکوم رہنا زیادہ اچھا ہے بجائے اس کے کہ ہم اپنے ضمیر کو بیچ ڈالیں اور روحانی اعتبار سے فنا ہو جائیں۔ قیدخانوں میں اگرچہ ہمارے جسم بالکل بے بس تھے مگر ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم یہاں بھی اپنا کام کر رہے ہیں بلکہ شاید ان لوگوں سے بہتر کر رہے ہیں جو جیل سے باہر ہیں۔ مانا کہ ہم کمزور ہیں لیکن یہ بات کہاں تک ٹھیک ہے کہ ہم اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہندوستان کا مستقبل قربان کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کی طاقت محدود ہے اور ہمارے بہت سے ساتھی معذور ہو گئے یا مر گئے، بعض نے علیحدگی اختیار کر لی اور بعض نے ہمارے ساتھ غداری کی۔ پھر بھی ہماری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو فراموش نہ کرے اور اپنی ہمت کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھے تو اس کے لئے ناکامی کا کوئی امکان نہیں حقیقی ناکامی یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں کو ترک کر دیں یعنی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم کے آگے ذلت سے سر جھکا دیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم دشمن کے لگائے ہوئے زخموں سے دیر میں بھرتے ہیں۔

اسی کمزوری اور حالات کی نامساعدت کو دیکھ کر اکثر طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود ہمیں اپنی کامیابیوں پر فخر تھا کیونکہ ہماری قوم نے واقعی بڑی بہادری سے کام لیا تھا اور ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک شجاع اور باہمت جماعت کے فرد ہیں۔

سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں دو مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کا عام اجلاس منعقد کیا جائے ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ کلکتہ میں۔ ظاہر تھا کہ ایک خلاف قانون جماعت امن و امان سے اپنا اجلاس کس طرح منعقد کر سکتی ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا پولیس سے اس کا تصادم ضروری تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس ہمیشہ لاٹھیوں کے زور سے منتشر کرتی رہی۔ اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کیا لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان غیر قانونی اجتماعات میں سینکڑوں نمائندے ہندوستان کے ہر حصہ سے آئے اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ صوبجات متحدہ کا حصہ ان میں بہت نمایاں تھا۔ مارچ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جب اجلاس کلکتہ کی نوبت آئی ہے تو میری ماتاجی نے بھی اس میں شرکت پر اصرار کیا لیکن پنڈت مالویہ اور ان کے رفقا کی طرح وہ بھی گرفتار ہو گئیں اور انھیں بھی کلکتہ جاتے ہوئے چند دن آسنسول کی جیل میں گذارنا پڑے۔ اس موقع پر انھوں نے

جس ہمت اور قوت کا اظہار کیا اس سے مجھے بے حد تعجب ہوا۔ وہ کمزور تھیں اور بیمار بھی لیکن وہ قید خانہ سے نہیں ڈرتی تھیں اس لئے کہ وہ اس سے زیادہ سخت مصیبتیں برداشت کر چکی تھیں جس ماں کا بیٹا، دونوں بیٹیاں اور بہت سے عزیز جن کو وہ دل سے چاہتی تھیں زیادہ تر جیل میں رہتے اسے خالی گھر سے وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔

جب ہماری جدوجہد دھیمی پڑ گئی اور اس نے ایک خاص رفتار اختیار کر لی تو اس میں وہ جوش و خروش بھی نہیں رہا، البتہ بیچ میں کبھی کبھی لوگ بھڑک اٹھتے تھے۔ اس زمانہ میں میرے خیالات زیادہ تر دوسرے ملکوں کی سیر کیا کرتے تھے جہاں تک ممکن تھا میں نے جیل کے اندر اپنا وقت اس کساد بازاری کے مطالعہ میں گذارا جو دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اس مبحث کے متعلق مجھے جو کتاب بھی ملی میں نے اسے پڑھ ڈالا۔ اور جوں جوں مجھے زیادہ کتابیں دستیاب ہوتی گئیں میری دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ معلوم ہوتا تھا ہندوستان اور اس کے تمام مسائل اور جدوجہد اس زبردست ناٹک کا ایک سین ہے جو سیاسی اور معاشی قوتوں کی کشمکش کی شکل میں دنیا بھر میں قومی اور بین الاقوامی اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔ اس جدوجہد میں میری ہمدردی کا رُخ روز بروز اشتمالیت کی طرف ہوتا گیا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت بہت دنوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور روس کا میرے دل پر خاص اثر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں اس ملک کی اکثر باتوں کو ناپسند کرتا تھا مثلاً مخالف رائے کا بے رحمی سے دبا دینا، مزدوروں کی جبری تنظیم، اور مختلف کارروائیوں میں تشدد سے کام لینا جو میرے نزدیک غیر ضروری تھا۔ لیکن سرمایہ داروں کی دنیا میں بھی تو جبر و تشدد کی کمی نہیں ہے

غرض مجھے روز بروز یقین ہوتا گیا کہ ہماری حریص سماج اور ہماری ملکیت کی بنیاد ہی تشدد پر قائم ہے اور بغیر تشدد کے اس کا زیادہ دن چلنا محال ہے۔ اگر عام لوگوں کی یہی حالت رہی کہ بھوک اور فاقے کا ڈر انھیں چند آدمیوں کا حکم ماننے پر مجبور کرے اور ان کی فلاح و عظمت کا باعث ہو تو تھوڑی سی سیاسی آزادی لے کر کیا کرنا ہی۔

تشدد سے دراصل کوئی بھی خالی نہیں لیکن سرمایہ داری نظام کا تو خمیر ہی تشدد سے بنا ہے یہ خلاف اس کے روس کا تشدد اگرچہ بجائے خود کچھ بہت اچھی چیز نہیں پھر بھی اس کا مقصد ایک جدید نظام قائم کرنا ہے جو صلح و اشتراک اور جمہور کی حقیقی آزادی پر مبنی ہے۔ باوجود اپنی غلطیوں کے سوویٹ روس نے غیر معمولی مشکلات پر غلبہ حاصل کیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس جدید نظام کی تاسیس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ جب تمام عالم میں کساد بازاری کا زور تھا اور کسی نہ کسی طرح ہر شخص کا قدم پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا سوویٹ روس میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کی نظر لینن اعظم! جیسے بلند انسان کی قیادت میں مستقبل پر تھی اور وہ صرف یہی دیکھتا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے ممالک ماضی کے از کار رفتہ ہاتھوں میں دب کر اپنی قوتیں زائل کر چکے تھے اور ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ گذرے ہوئے عہد کے نکمے آثار کو محفوظ رکھیں۔ وسط ایشیا کے پس ماندہ ممالک نے سوویٹ حکومت کے ماتحت جو زبردست ترقی کی ہے اس کی رُوداد نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ لہذا ان دونوں مظاہر کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر مجھے روس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا جو اس تاریک اور سنسان عالم میں میرے سامنے ایک روشن اور حوصلہ افزا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

لیکن اگرچہ سوویٹ روس کی کامیابی یا ناکامی ایک اشتمالی
قائم کرنے کے عملی تجربے کی حیثیت سے بے حد اہم ہے، مگر نظریہ اشتم
صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے بولشویک اپنی غلطیوں
قومی یا بین الاقوامی وجوہ کی بنا پر ناکام رہیں اور پھر بھی اشتمالی
بالکل صحیح ہو۔ خود اس نظریہ کی رُو سے دوسروں کے لئے ہر بات
روس کی تقلید کرنا حماقت ہے اس لئے کہ روس نے اشتمالیت کو جس
استعمال کیا ہے اسکا انحصار اس ملک کے مخصوص حالات اور تاریخی نش
اور پھر ہندوستان اور دوسرے ممالک کو یہ موقع حاصل ہے کہ بولش
کی غلطیوں سے بھی اتنا ہی فائدہ اٹھائیں جتنا اس کی کامیابیوں۔
بولشویکوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اپنا قدم نہایت تیزی سے
آگے بڑھائیں ان کے اردگرد دشمنوں کا نرغہ تھا اور وہ بیرونی
سے ڈرتے تھے۔ اگر ان کی رفتار اس قدر تیز نہ ہوتی تو شاید وہ آ
سے جو دیہاتی علاقوں کو اٹھانی پڑی بچ سکتے تھے۔ لیکن اب سوا
کہ تبدیلی کی رفتار کم رکھنے سے انقلاب ممکن بھی تھا یا نہیں۔ ایسی
صورت حال میں جب ایک نظام میں بنیادی تبدیلی کرنی تھی جزو
سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ چاہیے آگے چل کر ترقی کی رفتار کتنی ہی
کیوں نہ ہو پہلا قدم یہی ہونا چاہیئے تھا کہ موجودہ نظام کا خاتمہ کرد
جو اپنا کام پورا کر چکا تھا اور آئندہ ترقی کی راہ میں حائل تھا۔

ہندوستان میں زمین اور صنعت کے مسائل ایک دو
وابستہ ہیں بلکہ تمام کا حل صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ایک انقلا

ہیں" اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو گی کہ ہم ایک کھائی کو دو جستوں میں عبور کرنے کی کوشش کریں"۔

مجھے روس سے بحث نہیں مگر مارکسیت کے نظریے اور اس کے فلسفے نے میرے ذہن کے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کر دیا۔ اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکسی تفسیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک ڈراما ہے جو گویا بتدریج کھیلا جا رہا ہے اور اس کی تہ میں ایک مقصد اور نظام موجود ہے، خواہ وہ غیر شعوری کیوں نہ ہو۔ ماضی اور حال کی دل ہلا دینے والی تباہی اور بربادی کے باوجود مستقبل میں ہزار ہا خطروں کے ساتھ امید کی روشنی جلوہ گر ہے۔ مارکسیت کا جو پہلو مجھے خاص طور سے پسند آیا وہ اس کا علمی طرزِ خیال اور اذعانی عقیدے سے قطعاً آزاد ہونا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ روس اور بعض دوسرے مقامات میں سرکاری اشتمالیت میں اذعانیت کا زور ہے۔ اور جو لوگ اشتمالیت کے منکر ہیں ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ امر بلاشبہ افسوسناک ہے مگر سوویٹ ممالک میں جہاں زبردست تغیرات نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے اور اندرونی مخالفت کے قوی ہو جانے سے ہولناک ناکامی کا اندیشہ تھا، اس تشدد کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی عظیم الشان کساد بازاری اور نازک حالات سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے جو مارکسیت نے تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ جب اور تمام نظام اور نظریے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے یہی ایک اصول تھا جس نے کم و بیش صحت کے ساتھ ان مشکلات کی توضیح کی اور ان کا حقیقی حل پیش کیا۔

جوں جوں مجھے اس بات کا یقین ہوتا گیا میں نے اپنے دل میں ایک نیا جوش محسوس کرنا شروع کیا۔ قانون شکنی کی تحریک کے ناکام رہنے سے جو افسردگی پیدا ہو رہی تھی لحظہ بلحظہ کم ہوتی گئی۔ مجھے یہ نظر آنے لگا کہ دنیا نہایت تیزی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا راستہ جنگ کے زبردست خطرات اور مصائب و آفات سے پُر ہے لیکن بہر حال ہم اس راستے کو طے کر رہے ہیں۔ ہم میں جمود ہرگز نہیں ہے۔ قومی تحریک نے میری نظر میں اس دور و دراز سفر کے ایک مرحلے کی صورت اختیار کر لی میں نے اسے بہت غنیمت سمجھا کہ جبر و تشدد نے ہماری قوم کو آنے والی کشاکش کے لئے تیار کر دیا اور اس پر مجبور کر دیا کہ جو نئے خیالات اس وقت دنیا کو ہلا رہے ہیں ان پر غور کرے۔ جوں جوں ہمارے کمزور عناصر ہم سے دور ہوں گے ہم زیادہ مضبوط، زیادہ منضبط اور زیادہ پختہ ہوتے جائیں گے۔ وقت ہماری مدد کر رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے روس، جرمنی، انگلستان، جاپان، امریکہ، فرانس چین، اسپین، اٹلی اور وسط یورپ کے واقعات کا زیادہ احتیاط سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور کوشش کرتا رہا کہ موجودہ حالات کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکوں۔ مجھے ان کوششوں سے بے حد دلچسپی تھی جو آنے والے طوفان کو روکنے کے لئے ہر ملک فرداً فرداً یا دوسروں کے ساتھ ملکر کر رہا تھا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں کی ان مسلسل ناکامیوں سے جو سیاسی اور معاشی خرابیوں کی اصلاح کے لئے اور مختلف اسلحہ جات کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے منعقد کی جا رہی تھیں مجھے وہ تکلیف دہ مسئلہ یاد آ جاتا تھا جو ہمیں اپنے ملک میں درپیش ہے یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ۔ باوجود انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ہم اس مسئلے کو ابھی تک حل نہیں

کر سکے اسی طرح جیسے اس عالمگیر یقین کے باوجود کہ ان کی ناکامی تمام دنیا کے لئے ایک خوفناک حادثے کا باعث ہوگی یورپ اور امریکہ کے مدبّرین ایک دوسرے سے اتفاق رائے نہیں کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں جس طریقے سے معاملے کو طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ غلط ہے اور صحیح طریقہ اختیار کرنے کی کسی کو جُرات نہیں ہوتی۔

دنیا کے مصائب اور نزاعات پر اس طرح غور کرتے کرتے میں اپنی ذاتی اور قومی مصیبتوں کو بھول گیا۔ بعض اوقات مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ تاریخ عالم کے اس نہایت ہی اہم انقلابی دور کا میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ دنیا کے اس گوشے میں آنے والے زبردست تغیرات میں میرا بھی کچھ حصہ ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنگ اور تشدد کی فضا کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ جاتا اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور یاس انگیز منظر یہ تھا کہ بعض اچھے خاصے ذہین اور سمجھدار آدمی محکومیت و غلامی اور پستیٔ اخلاق کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ ان کے دل میں انسان کے افلاس، اس کا دکھ درد اور مظلومیت سے بیزاری کا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس دم گھٹنے والی فضا میں ہر طرف سوقیانہ شور و غل اور منظم فریب کا زور ہے اور نیک لوگ خاموش ہیں۔ ہٹلر اور ہٹلر کے بعد "بھورے خط" کی کامیابیوں سے مجھے بے حد قلق ہوا لیکن اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ یہ زیادہ دن چلنے والی چیز نہیں۔ بعض دفعہ یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ انسان کی سعی و کوشش بالکل بے سود ہے اس لئے کہ قدرت کی مشین اندھا دھند اپنا کام کر رہی ہے اور اس میں ایک چھوٹے سے پرزے کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بایں ہمہ زندگی کا اشتمالی فلسفہ میرے لئے تسکین خاطر اور اطمینان کا

باعث تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں اس پر کیوں کر عمل کیا جائے۔ ابھی تو ہم نے سیاسی آزادی کا مسئلہ ہی حل نہیں کیا۔ ہمارے دلوں پر قوم پرستانہ نصب العین کا تسلط ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم معاشی آزادی کی کوشش بھی اسی وقت شروع کر دیں یا سیاسی آزادی کے بعد اس کی طرف توجہ کریں۔ لیکن ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان سے قدرتاً سماجی مسئلہ روز بروز ہمارے سامنے آتا گیا اور یہ ظاہر ہو گیا کہ ہم اپنی سیاسی آزادی کے مسئلے کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتے۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں جو روش اختیار کر رکھی ہے اس سے قدرتاً ہماری جماعت کے وہ طبقے جو اجتماعی مسائل میں رجعت پسند ہیں سیاسی آزادی کے مخالف ہوتے گئے یہ ایک ناگزیر امر تھا اور مجھے خوشی ہوئی کہ معاشی طبقوں کی حد بندی ہو گئی۔ معلوم نہیں دوسروں کو اس بات کا احساس ہوا یا نہیں۔ میرے خیال میں تو بہت کم لوگوں کو ہوا۔ یہ سچ ہے بڑے بڑے شہروں میں تھوڑے بہت کٹر اشتمالی موجود تھے وہ قومی تحریک کے زبردست مخالف تھے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی وہ منظم تحریک جس کا تعلق خصوصیت کے ساتھ بمبئی اور ایک حد تک کلکتہ سے تھا ایک اشتراکی تحریک تھی مگر کساد بازاری اور تکالیف و مصائب نے اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منتشر کر دیا۔ یوں بھی پڑھے لکھے لوگوں کے اندر مبہم سے اشتراکی اور اشتمالی خیالات پھیل رہے تھے یہاں تک کہ حکومت کے بعض سمجھدار ملازم بھی ان سے متاثر ہوئے۔ کانگریس کا نوجوان طبقہ جو کبھی برائٹس کی جمہوریت کی بحثیں اور مارلے کیتھ اور میزینی کی تصنیفات پڑھا کرتا تھا اب روس کے اشتمالی اور اشتراکی حالات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مقدمہ سازش میرٹھ

نے لوگوں کے ذہن کو بڑی حد تک ان نئے خیالات کی طرف متوجہ کر دیا اور دنیا کی نازک صورت حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اس مبحث پر غور کریں اس طرح تحقیق اور تنقید اور موجودہ نظام کی مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب ہوا کا رُخ کس طرف ہے۔ تاہم یہ تحریک نہایت کمزور اور ڈانواں ڈول تھی۔ بعض لوگ فاشستی خیالات کی حمایت کر رہے تھے۔ غرض اشتراکیت کا کوئی صاف اور واضح تصوّر لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ ابھی تک قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہو گی ہمارے لئے قومیت کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔ اگر کانگریس ابتک ہندوستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور ترقی پسند جماعت ہے (بعض مزدور جماعتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے اس نے گاندھی جی کے زیر قیادت اسی اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت کے باوجود ایک غیر معمولی بیداری پیدا کر دی ہے جس سے انقلابی مقاصد کو بڑی مدد ملی۔ اس کا وجود ابھی تک کارآمد ہے اور آئندہ بھی رہے گا یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قومیت کے جذبے کی جگہ سماجی انقلاب کا جذبہ پیدا ہو جائے اس لئے ہماری آئندہ ترقی اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے کانگریس سے وابستہ ہے اگرچہ ہم دوسرے ذرائع سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

چنانچہ میرے نزدیک کانگریس سے قطع تعلق کرنا گویا قومی زندگی کی رو سے الگ ہونا اور اپنے سب سے قوی حربے کو کھو دینا ہے۔ غالباً اس کا نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ہم اپنی قوتوں کو بے کار تجربات میں ضائع کر دیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کانگریس اپنی موجودہ شکل میں کبھی ایسا کر سکے گی کہ ہمارے سماجی نظام کو بنیادی طور پر بدل ڈالے۔ اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو یقین ہے کہ اس کے دو یا دو سے زیادہ ٹکڑے ہو جاتے اور اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے بہت سے اجزا اس سے الگ ہو جاتے۔ اگر اس سے ہر جماعت کے مقاصد بالکل صاف ہو جاتے اور ایک اچھی منظم پارٹی خواہ اسے کانگریس میں اکثریت حاصل ہوتی یا اقلیت، انقلابی سماجی پروگرام کی حمایت کرتی تو یہ صورت کچھ ایسی بری نہ تھی۔

لیکن اس وقت کانگریس اور گاندھی جی ایک چیز تھے۔ سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کیا کریں گے۔ اصول و نظریات کے لحاظ سے وہ بعض اوقات اس قدر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انسان کو تعجب ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے وہ بحالت موجودہ ہندوستان کے سب سے بڑے انقلاب پسند ہیں۔ انھوں نے ایک عجیب و غریب شخصیت پائی ہے اس لئے انھیں عام پیمانوں سے ناپنا یا معمولی منطقی اصول سے جانچنا ناممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً انقلاب پسند ہیں اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے حصول کا بیڑا اٹھا چکے ہیں اس لئے جب تک یہ آزادی حاصل نہ ہو جائے وہ یقیناً انتہا پسندانہ طرزِ عمل اختیار کریں گے۔ اس دوران میں وہ عام لوگوں میں زبردست قوتوں کو بیدار کر دیں گے اور مجھے تو تھوڑی سی امید ہے کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ اشتراکیت کی منزل کی طرف بڑھیں گے۔

ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اکثر اشتمالی سالہا سال سے گاندھی جی اور کانگریس پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کر رہے ہیں اور کانگریس کے لیڈروں پر بدترین الزامات لگاتے ہیں۔ نظری اعتبار سے دیکھئے تو کانگریس

کی ذہنیت کے متعلق ان کی بہت سی تنقیدیں نہایت صحیح اور برمحل تھیں جن کی آئندہ واقعات نے ایک حد تک تائید بھی کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے عام سیاسی حالات کا تجربہ جو بعض اشتمالی اس سے پہلے کر چکے تھے غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوا لیکن اصول اور کلیات کی بحث سے قطع نظر کر کے جب تفصیلات کا اور کانگریس کی سرگرمیوں کا سوال آتا ہے تو اس میں انھیں بڑا دھوکا ہوتا ہے ہندوستان میں اشتمالیوں کی قلیل تعداد اور بے اثری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اشتمالیت کی اشاعت و تبلیغ اور لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے ان کا مشغلہ زیادہ تر دوسروں کی مذمت کرنا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا ردعمل ان کے لئے کس قدر مضرت رساں ثابت ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے زیادہ تر مزدور حلقوں کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ جہاں دو چار چلتے ہوئے فقرے مزدوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتے ہیں لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے لئے محض چلتے ہوئے فقرے کافی نہیں۔ اشتمالی اس بات سے بے خبر ہیں کہ اسوقت ہندوستان میں اوسط طبقہ سب سے بڑی انقلابی قوت کا مالک ہے یہ صحیح ہے کہ کٹر اشتمالیوں کے اس طرز عمل کے باوجود بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اشتمالیت کی طرف کھنچ آئے ہیں مگر ان دونوں کے درمیان ابھی تک ایک خلیج حائل ہے۔

اشتمالیوں کی رائے میں کانگریس کے لیڈروں کا مقصد یہ رہا ہے کہ حکومت پر عام لوگوں کا دباؤ ڈالکر ہندوستانی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے لئے صنعتی اور تجارتی فوائد حاصل کریں۔ کانگریس کا کام یہ ہے کہ "کسانوں نیچے اوسط طبقے کے لوگوں اور صنعتی مزدوروں کی سیاسی اور معاشی بے چینی کی قوت سے بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے مالکان کارخانہ اور ساہوکاروں

کی گاڑی چلائے"۔ گویا ہندوستانی سرمایہ دار پس پردہ بیٹھے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے نام حکم جاری کر دیتے ہیں کہ اول جمہور میں ایک تحریک اٹھائے اور جب وہ بہت بڑھ جائے یا بہت خطرناک ہو جائے تو اسے دفعتہً ملتوی کر دے یا اصل راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دے۔ کانگریسی رہنما یہ نہیں چاہتے کہ انگریز سچ مچ ہندوستان سے چلے جائیں کیونکہ انھی کی مدد سے یہاں کی فاقہ مست آبادی قابو میں رکھی جا سکتی ہے اور اس سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اور ہندوستان کا اوسط طبقہ اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا۔

یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ کانگریس کی سرگرمیوں کا جو عجیب و غریب تجزیہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس کا بعض سمجھدار اشتمالیوں کو دل سے یقین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان کے خیالات اس قسم کے ہوں تو انھیں ہندوستان میں کیونکر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی قومی تحریک کا اندازہ یورپ کی لیبر تحریک کے معیار سے کرتے ہیں۔ چونکہ مغرب میں مزدوروں کے لیڈر اکثر ان سے غداری کرتے ہیں لہٰذا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی حال ہوگا۔ اُنھوں نے اس بات کو فراموش کر رکھا ہے کہ ہندوستان کی قومی تحریک غریبوں یا مزدوروں کی تحریک نہیں بلکہ یہ اوسط طبقے یعنی بورژوا کی تحریک ہے جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کا مقصد محض سیاسی آزادی ہے نہ کہ سماجی نظام کی تبدیلی۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقصد بہت محدود ہے اور قومی تحریک ایک فرسودہ چیز ہے۔ اس تحریک کی بنیاد کو سمجھ لینے کے بعد یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ اس کے رہنما عوام سے غداری کرتے ہیں کیونکہ وہ طریق زمینداری یا نظام سرمایہ داری

کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ انھوں نے تو کبھی یہ دعویٰ ہی نہیں کیا البتہ کانگریس میں بعض لوگ اس قسم کے ضرور موجود ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے جو سرمائے اور زمین کے موجودہ نظام کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو کانگریس کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سرمایہ دار جماعتوں کو (جن میں زمیندار اور تعلقہ دار شامل نہیں ہیں) برطانوی اور بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی کی ترویج سے بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ ہر قومی تحریک ملکی صنعتوں کی حمایت اور بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کا سبق دیتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ سول نافرمانی اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے دوران میں بمبئی کے مالکان کارخانہ نے بطور ایک جماعت کے یہ جسارت کی کہ لنکا شائر کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہمارے قومی مقاصد کے ساتھ بہت بڑی غداری تھی اور اسے بجا طور پر غداری ہی سے تعبیر کیا گیا۔ بمبئی کے مالکان کارخانہ کے نمائندوں نے بھی جب ہم میں سے اکثر جیل میں تھے اسمبلی میں ہمیشہ کانگریسیوں اور "انتہا پسندوں" کا مضحکہ اڑایا۔

پچھلے چند سال سے سرمایہ دار طبقوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کانگریس اور قومیت کے نقطۂ نظر سے بھی شرمناک ہے۔ اٹاوا کے معاہدے سے ممکن ہے کسی چھوٹی سی جماعت کو عارضی فائدہ پہنچا ہو مگر بحیثیت مجموعی اس نے ہندوستان کی صنعت کو نقصان پہنچایا اور اسے برطانوی سرمائے اور صنعت کا اور بھی محتاج کر دیا۔ یہ معاہدہ جو عام لوگوں کے لئے بے حد

مضر تھا اس وقت کیا گیا جب ہماری جد وجہد جاری تھی اور ہزار ہا ہندستانی جیل خانوں میں بند تھے۔ نوآبادیوں نے جہاں تک ہوسکا انگلستان سے بہتر سے بہتر شرائط حاصل کیں لیکن ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب کچھ انگلستان کو بخش دیا بعض من چلے ساہوکاروں نے بھی چاندی سونے کے کاروبار میں ہندوستان کے مفاد کو قربان کرکے خوب نفع کمایا۔

گول میز کانفرنس میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار آپس میں ملکر کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں اُنھوں نے کھلم کھلا جارحانہ حیثیت سے حکومت کا ساتھ دیا۔ انھی کی امداد سے حکومت نے تعزیری ضابطوں کی شکل میں جابرانہ قوانین منظور کئے اور یوپی کونسل کے زمیندار اراکین کی بہت بڑی اکثریت نے ان لوگوں کی رہائی کی مخالفت کی جو سول نافرمانی کی تحریک میں قید ہوئے تھے۔

یہ خیال کہ گاندھی جی نے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۰ء میں محض جمہور کے دباؤ سے وہ تحریکیں جو بظاہر جارحانہ معلوم ہوتی تھیں شروع کیں سراسر غلط ہے سچ ہے کہ جمہور میں اکثر حرکت پیدا ہوتی رہی لیکن دونوں موقعوں پر خود گاندھی جی نے اسے ایک بڑی تحریک کی شکل دی۔ ۱۹۲۱ء میں تو انھوں نے تن تنہا کانگریس میں ترک موالات کی تحریک منظور کرائی اور ۱۹۳۰ء میں اگر وہ ذرا سی بھی مخالفت کرتے تو ہم ہرگز حکومت کے خلاف کوئی موثر اور جارحانہ طرز عمل اختیار نہ کر سکتے۔

یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ بعض اوقات محض حماقت یا ناواقفیت کی وجہ سے ذاتیات پر حملہ کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلے کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ گاندھی جی کے خلوص نیت پر حملہ کرنا خود اپنی

ذات اور اپنے مقصد کو نقصان پہنچانا ہے۔ ہندوستان کے کروڑہا باشندوں کے نزدیک وہ حق و صداقت کا مجسمہ ہیں اور جو شخص ان سے ذرا بھی واقف ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس جوش اور خلوص سے ہر موقع پر صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اشتمالیوں نے اپنے آپ کو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ دیہاتی علاقوں سے نہ انھیں واقفیت ہے اور نہ ان سے کوئی تعلق ہے۔ مگر ہندوستان کا مسئلہ اس وقت کسانوں کا مسئلہ ہے اس لئے صنعتی مزدوروں کو اگرچہ وہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مستقبل میں ان کی اہمیت برابر بڑھتی جائے گی وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو کسانوں کو حاصل ہے۔ کانگریسی کارکن اس وقت ہر جگہ دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ کانگریس کسانوں ہی کی ایک جماعت بن جائے گی لیکن کسان جب اپنا فوری مقصد حاصل کر لیتا ہے تو بہت کم انقلاب کی طرف مائل ہوتا ہے لہذا ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں کے بعد شہر اور دیہات اور مزدور اور کسان کے مقابلے کا مسئلہ چھڑ جائے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کانگریس کے لیڈروں اور کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے میرے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ان سے بہتر انسان نہیں مل سکتے۔ پھر بھی میں نے ہر اہم معاملہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور بعض دفعہ مجھے اس بات پر کوفت بھی ہوئی ہے کہ بعض ایسی باتیں جو میری نظر میں بالکل عیاں اور واضح ہیں ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اتنی عقل نہیں رکھتے بلکہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی و نظر کی دنیا میں الگ الگ راہیں اختیار کر لی ہیں۔ میں

اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے نکلنا کس قدر مشکل اور دیر طلب ہے یہ مختلف فلسفۂ زندگی کے دائرے ہیں جن میں انسان بتدریج غیر شعوری طور پر نشوونما پاتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو جو ہم سے اختلاف خیال رکھتے ہیں، الزام دینا بے کار ہے اشتراکیت نام ہے زندگی اور اس کے مسائل کے ایک خاص نفسیاتی نظریے کا جس کا انحصار محض منطق پر نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے نظریے بھی وراثت، تربیت، ماضی کی روایات اور موجودہ ماحول کے اثرات پر مبنی ہیں۔ یہ قوت صرف زندگی اور اس کے تلخ تجربات میں ہے کہ وہ ہمیں نئی راہوں پر چلائیں اور رفتہ رفتہ ہمارے خیالات کو بدل دیں، جو اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ شاید ہم اپنی ذاتی کوشش سے اس انقلاب میں تھوڑی بہت مدد دے سکیں اور شائد "انسان جو راہیں اپنے مقدر سے بچنے کے لئے اختیار کرے وہی اُسے مقدر کی منزل پر پہنچا دیں"

(۴۷)

مذہب کیا ہے؟

ستمبر ۳۲ء کے وسط میں ہمارا جیل کا پرسکون اور یکساں روزمرہ معمول یکا یک درہم برہم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گولا آکر پھٹا ہو۔ خبر آئی کہ گاندھی جی نے، ان جداگانہ حلقہائے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کرنے کے لئے جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اپنے فرقہ وارانہ فیصلہ میں پنچ ذاتوں کے لئے تجویز کئے تھے، اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ روزہ رکھ کر جان دے دیں گے۔ اس شخص میں بھی لوگوں کو جھنجوڑنے کی کیسی کچھ صلاحیت ہے؟ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے ہر قسم کے اتفاقات واحتمالات سامنے آئے، اور میرا توازن ذہنی بالکل بگڑ گیا۔ دو دن تک بالکل تاریکی میں رہا، کوئی روشنی نہ تھی جو راہ دکھاتی۔ گاندھی جی کے فعل کے بعض نتائج کا خیال آتا تو دل بیٹھا جاتا تھا۔ معاملہ کا ذاتی پہلو بھی خاصا قوی تھا اور دل ہی دل میں کیسے دکھ کے ساتھ یہ خیال آتا تھا کہ شاید اب انھیں کبھی نہ دیکھ سکوں گا کوئی سال بھر ہوا تھا کہ انگلستان جاتے وقت انھیں جہاز پر دیکھا تھا، کیا یہی آخری دیدار ثابت ہونے کو تھا؟

پھر سخت الجھن ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنی آخری قربانی کے لئے ایک ضمنی مسئلہ کو کیوں چنا، محض حلقہائے انتخاب کے معاملہ کو! اس کا اثر ہماری تحریک آزادی پر کیا ہوگا؟ کیا یہ نہ ہوگا کہ کم سے کم تھوڑے دن کے لئے

اہم تر مسائل پس پشت جا پڑیں گے اور اگر ان کا یہ مقصد حاصل ہو بھی گیا اور نیچ ذاتوں کے حلقہائے انتخاب اور ہندوؤں کے ساتھ مخلوط بھی ہو گئے تو کیا اس کا ردِّعمل یہ نہ ہو گا کہ لوگ سمجھنے لگیں گے کہ اچھا کچھ تو مل ہی گیا اور اب تھوڑے دنوں اور کچھ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا ان کا یہ فعل فرقہ وارانہ فیصلہ کو اور اس کل تجویز کو جسے حکومت نے آگے بڑھایا ہے ماننے اور جزوی طور پر قبول کرنے کے مرادف نہیں؟ اور کیا یہ بات ترکِ موالات اور سول نافرمانی کے اصولوں کے مطابق ہے؟ اتنی قربانی، اتنی شجاعانہ سعی کے بعد کیا ہماری تحریک ایک حقیر سی چیز ہو کر رہ جانے والی ہے؟

مجھے ان پر غصہ بھی آتا تھا کہ ایک سیاسی مسئلہ کو یوں مذہبی اور جذباتی طریق پر حل کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں بار بار خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں خدا نے روزہ کی تاریخ تک ان کے لئے مقرر کی ہے۔ لوگوں کے لئے یہ کیسی بری مثال قایم کرنا ہے؟

اور اگر باپو کہیں مر گئے؟ پھر ہندوستان کا کیا حال ہو گا؟ اس کی سیاست کس راہ پر چلے گی؟ سامنے تیرہ و تار مستقبل دکھائی دیتا تھا، اور جب اس کا خیال آتا تو دل پر یاس و حرمان کا تسلط ہو جاتا۔

غرض یونہی سوچتا تھا اور سوچے جاتا تھا۔ دماغ میں انتشار تھا اور غصہ و یاس اور اس شخص کے لئے محبت جو اس ساری پریشانی کا باعث تھا۔ سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں، طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی، ہر ایک سے جھگڑتا تھا اور سب سے زیادہ خود اپنے سے۔

پھر ایک عجیب کیفیت گذری۔ یوں سمجھئے کہ ایک جذباتی بحران سا

ہوا اور جب وہ ختم ہوا تو طبیعت میں کچھ سکون محسوس ہوا اور مستقبل پھر اتنا تاریک نہ رہا، باپو میں ہمیشہ سے ایک عجیب صفت ہے کہ ٹھیک نفسیاتی موقع پر صحیح بات کر گذرتے ہیں، اس لئے خیال ہوا کہ شاید ان کا یہ فعل بھی، جسے بہت سے اعتبارات سے حق بجانب ثابت کرنا ممکن نہ تھا، بڑے نتائج کا باعث بن جائے۔ اور صرف اس تنگ میدان ہی میں نہیں جس سے اس کو واسطہ ہے بلکہ قومی جدوجہد کے وسیع تر میدان میں بھی۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ اگر باپو مر بھی گئے تو ہماری آزادی کی سعی تو بہر حال جاری رہے گی۔ اس لئے ہر چہ بادا باد، ہمیں تیار رہنا چاہیئے اور اپنے کو اس کام کا اہل بنانا چاہیئے۔ اپنے ذہن کو جب یوں بے جھجک گاندھی جی کی موت تک کے مقابلہ کے لئے تیار کر لیا تب کہیں سکون اور جمعیت خاطر نصیب ہوئی اور میں پھر دنیا اور اس کے ممکنات سے نبٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔

اس کے بعد اس حیرت خیز بیداری کی خبریں آئیں جو سارے ملک میں پیدا ہوئی، اس جادو اثر جوش کی لہر کی جو ساری ہندو سماج میں دوڑ گئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ چھوت چھات بس اب ختم ہوئی۔ دل نے کہا کیسا جادوگر ہے یہ چھوٹا سا آدمی جو یرودا کے قید خانہ میں بیٹھا ہے۔ یہ ان تاروں کو کتنی اچھی طرح پہچانتا ہے جن سے دلوں کو جنبش دی جاتی ہے۔

ان کا ایک تار مجھے ملا۔ سزایابی کے بعد یہ ان کا پہلا پیام تھا۔ اتنے عرصہ کے بعد پیام پانے پر دل بہت خوش ہوا۔ اس تار میں انھوں نے لکھا تھا: کرب کے ان تمام دنوں میں تم میرے ذہن کی آنکھ کے سامنے رہے ہو۔ تمھاری رائے جاننے کا بڑا فکر ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری رائے کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ اندو سے اور سروپ کے بچوں سے ملا تھا۔ اندو

خوش خرم تھی، ذرا گوشت بھی آ گیا ہے - میری حالت بہت اچھی ہے - تار سے جواب دو - پیار -"

بڑی نرالی بات تھی پرٹھیٹھ گاندھی جی کی سی بات تھی کہ برت کی کلفت میں اور اپنی بے شمار مشغولیتوں میں بھی انھیں اس کا خیال رہا کہ میری بچی اور میری بہن کے بچوں کے آنے کا ذکر کر دیا، اور اندرا کے موٹے ہو جانے تک کا! (میری بہن بھی اس زمانہ میں قید میں تھیں اور یہ سب بچے پونا کے ایک مدرسہ میں پڑھتے تھے) زندگی میں جو چیزیں یوں ذرا ذرا سی معلوم ہوتی ہیں پر دراصل بہت کچھ ہوتی ہیں، یہ انھیں کبھی نہیں بھولتے -

اسی زمانہ میں خبر ملی کہ حلقہائے انتخاب کے متعلق کچھ تصفیہ ہو گیا - جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مہربانی سے مجھے گاندھی جی کے تار کا جواب دینے کی اجازت دیدی اور میں نے یہ تار بھیجا - "آپ کے تار اور اس مختصر سی اطلاع نے کہ تصفیہ ہو گیا دل کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا - برت کی خبر سے پہلے تو سخت ذہنی کوفت اور انتشار پیدا ہوا، لیکن آخر میں آس مشربی نے فتح پائی اور مجھے اپنا گم شدہ اطمینان قلب پھر سے مل گیا - دبے ہوئے مظلوم طبقوں کی خاطر جو قربانی بھی کی جائے کم ہے - آزادی کا معیار سب ادنیٰ گروہ کی آزادی ہے - لیکن ڈرتا یہ ہوں کہ ان باتوں میں ہمارا مقصد وحید پس پشت نہ پڑ جائے - مذہبی نقطہ نظر سے تو کوئی حکم میں لگا نہیں سکتا - ڈر یہ ہے کہ آپ کے طریقوں کو دوسرے بیجا طور پر استعمال نہ کریں - لیکن آپ جیسے جادوگر کو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں - پیار -"

پونا میں جو ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے انھوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اور برطانوی وزیر اعظم نے غیر معمولی عجلت کے ساتھ اسے قبول

کرلیا، اور اپنے سابقہ فیصلہ میں اس کے مطابق تبدیلی کردی، اور برت ٹوٹ گیا۔ مجھے ایسے میثاق اور معاہدے بہت ناپسند ہیں مگر پونا کے معاہدہ کا اس کے مفاد سے قطع نظر، میں نے دل سے خیر مقدم کیا۔

آخر یہ ہماہمی ختم ہوئی اور پھر وہی جیل کا روزمرہ معمول شروع ہوا۔ ہریجن تحریک کی اور گاندھی جی جیل خانہ سے جو کام کر رہے تھے اس کی اطلاعیں پہنچتی تھیں اور میرا دل ان سے کچھ بہت خوش نہ ہوتا تھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ چھوت چھات کو ختم کرنے اور نیچ ذاتوں کو ابھارنے کی تحریک کو بڑی قوت پہنچی، لیکن اس عہد نامہ سے اس قدر نہیں جتنی کہ اس مجاہدانہ جوش سے جو تمام ملک کے اندر پیدا ہو گیا۔ اور یہ ایسی چیز تھی جس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

مگر اس میں بھی شک نہیں کہ سول نافرمانی کو نقصان پہنچا۔ ملک کا دھیان دوسرے معاملوں کی طرف مڑ گیا، اور کانگریس کے بہت سے کام کرنے والے ہریجن تحریک کی طرف چلے گئے۔ غالباً ان میں سے بہتیرے اس بات کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ کوئی ذرا زیادہ محفوظ کام مل جائے جس میں جیل جانے کا ڈر نہ ہو اور اس سے زیادہ لاٹھی کی مار اور املاک کی ضبطی کا خطرہ نہ ہو۔ یہ بات ہے بھی فطری، اور اپنے ہزارہا کارکنوں سے یہ توقع رکھنا بھی بیجا ہے کہ وہ ہر وقت انتہائی تکلیف اٹھانے اور اپنے گھر بار کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے آمادہ رہیں گے۔ پھر بھی اس عظیم الشان تحریک کے اس تدریجی انحطاط کو دیکھ دیکھ کر جی بہت کڑھتا تھا، مگر باوجود اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی اور کبھی کبھی تو بڑے پیمانہ پر مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے جیسے مارچ اپریل ۱۹۳۳ء میں کلکتہ کانگریس کا مظاہرہ۔ گاندھی جی،

پرواہ جیل میں تھے نگران کے ساتھ خاص رعایت یہ کر دی گئی تھی کہ یہ لوگوں سے مل جل سکتے تھے اور ہر یجن تحریک کے لئے ہدایات دے سکتے تھے - کچھ ہو اس سے اس ناگواری میں کمی ہوگئی جو ان کے قید میں ہونے کی وجہ سے قوم میں تھی اس لئے ان سب باتوں سے طبیعت پست ہوتی تھی -

کئی مہینہ بعد مئی ۱۹۳۳ء کے شروع میں گاندھی جی نے اپنا ۲۱ دن والا برت شروع کیا - اس کی اطلاع آئی تو بھی پہلے پہلے تو صدمہ سا ہوا ، مگر میں نے اسے ایک ناگزیر حادثہ جان کر قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اپنے کو اس کا عادی بنا لیا - بلکہ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ جب وہ برت رکھنا طے ہی کر چکے اور اس کا اعلان بھی کر چکے تو لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کے ترک کرانے پر اصرار کرتے ہیں - یہ برت میری سمجھ میں تو آتا نہ تھا ، اور اگر فیصلہ سے پہلے مجھ سے رائے لی جاتی تو میں سختی سے اس کی مخالفت کرتا مگر میں گاندھی جی کے قول کی بڑی قدر کرتا ہوں اور مجھے یہ بات غلط معلوم ہوتی تھی کہ ایک خالص شخصی معاملہ میں جو ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا کوئی بھی ان سے اس قول کے تڑوانے کی کوشش کرے - اس لئے اس برت پر ہر چند کہ بہت ناشاد تھا مگر راضی تھا -

برت شروع کرنے سے چند روز پہلے انھوں نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں ایک خط لکھا جس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا - انھوں نے جواب چاہا تھا اس لئے میں نے یہ تار بھیجا ! " آپ کا خط ملا - جن باتوں کو میں سمجھتا ہی نہیں ان کی بابت کہہ کیا سکتا ہوں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پردیس میں بھٹک گیا ہوں نشان راہ اگر کوئی ہے تو بس ایک آپ کی ذات - اندھیرے میں راہ ٹٹولتا ہوں اور ٹھوکر [illegible] محبت آپ کے

ساتھ ہے ۔"

ایک طرف میں ان کے فعل کو ناپسند کرتا تھا، دوسری طرف یہ فکر تھا کہ انھیں دُکھ نہ دوں، اور ان دونوں میں کشمکش تھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے انھیں دل دہی کا کوئی پیام نہیں بھیجا اور اب کے وہ اس تکلیف کی آزمائش میں اپنے کو ڈالنے پر تلے ہی ہوئے ہیں جس میں ممکن ہے کہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کا دل بڑھاؤں۔ ذہن کی زندگی میں ذرا ذرا سی باتوں سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے، اور اس مصیبت سے جانبر ہونے کے لئے انھیں اپنی اعصابی قوت کا شمہ شمہ درکار ہوگا۔ یہ بھی مجھے محسوس ہوا کہ اب جو کچھ بھی ہو، چاہے بدقسمتی سے ان کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو، سب کو مضبوطی سے جھیلنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے انھیں یہ تار بھیجا: "اب کے آپ نے اپنی عظیم الشان مہم شروع ہی فرما دی ہے میں اپنی محبت اور تبریک کا ہدیہ پھر پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اب بہت صاف محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا۔ اور جو بھی ہو جیت آپ کی ہے ۔"

وہ اس برت سے جانبر ہو گئے۔ برت کے پہلے ہی دن انھیں جیل سے چھوڑ دیا گیا اور ان کے مشورہ سے چھ ہفتے کے لئے سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی۔

اس برت کے زمانہ میں پھر میں نے اس جذباتی جوش کا نظارہ کیا اور بار بار سوچا کیا کہ آیا سیاست میں یہ بھی کوئی صحیح طریقہ ہے۔ یہ تو مری ہوئی چیزوں کو زندہ کرنا ہے اور اس کے مقابلہ میں وضاحت سے سوچنے سمجھنے کے لئے [illegible] موقع نہیں۔ سارا ہندوستان، یا اس کا بہت بڑا

حصہ، ادب اور احترام سے مہاتما کا منہ تکتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ معجزہ کے بعد معجزہ دکھائیں، چھوت چھات کو ختم کرا دیں، سوراج حاصل کرا دیں وغیرہ وغیرہ اور خود کوئی کچھ نہیں کرتا! اور گاندھی جی ہیں کہ دوسروں کو سوچنے سمجھنے کی ہمت نہیں دلاتے، ان کا اصرار ہے بس خلوص اور قربانی پر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جذباتی وابستگی کے باوجود میں برابر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر سیاسی کاموں میں ان کی جبلت سلیم ان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے، عمل کا ولولہ بھی ہے، لیکن کیا عقیدتمندی کا راستہ ایک قوم کو تربیت دینے کا صحیح راستہ ہے؟ ممکن ہے کچھ دن تو اس سے کام چلے، مگر پھر آگے؟

پھر ایک بات یہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ موجودہ نظام معاشرت کو کہ تشدد اور کشاکش پر مبنی ہے کس طرح قبول کرتے ہیں، اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ قبول کرتے ہیں۔ میرے سینہ میں بھی کشاکش تھی، اور میری وفاداریاں مجھے مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔ جانتا تھا کہ قید کی غیر اختیاری آڑ ہٹی اور بہت سی دقتوں کا سامنا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بالکل یکہ و تنہا ہوں اور یکسر غریب الوطن۔ ہندوستان جسے اپنا دل دیا اور جس کے لئے جان لڑائی ایک عجیب سا وحشت کدہ معلوم ہوتا تھا۔ سوچتا کہ کہیں میرا ہی قصور تو نہیں کہ میں اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت اور طریق فکر کو نہیں اپنا سکتا؟ نہایت قریب کے ساتھیوں کے متعلق بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے میرے درمیان ایک غیر مرئی روک ہے، جب اسے دور کرنے میں ناکام رہتا تو ناشاد ہوتا اور پھر اپنے ہی خول میں سمٹ رہتا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ انھیں چاروں طرف سے پرانی دنیا گھیرے ہوئے ہے یعنی ماضی کے افکار، اور امیدوں اور

آرزوؤں کی دنیا، اور نئی دنیا ابھی بہت دور ہے۔ بقول شاعر "دو دنیاؤں کے
درمیان سرگرداں، ایک مردہ، دوسری میں پیدا ہونے کی ہنوز قدرت نہیں؛
غرض کہیں بھی سر دھرنے کا ٹھکانا نہ تھا!"

کہتے ہیں کہ اور سب باتوں سے زیادہ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے
ہندو، مسلمان، سکھ سب اپنے اپنے مذہب پر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے
کا سر پھوڑ کر اس فخر کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے
ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو ہو گیا ہے
میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک
ظاہر کی ہے۔ تقریباً ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی
کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ
اٹھانے کا، تاہم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی
ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں جانتا ہوں کہ اس میں اور کچھ بھی ہے۔ کوئی ایسی
بات، جس سے انسانوں کی ایک گہری احتیاج پوری ہوتی ہے۔ ورنہ یہ ایسی
زبردست قوت کیسے ہوتا جیسی کہ رہ چکا ہے اور بے شمار بے تاب روحوں
کی تسکین و راحت کا سامان کیسے کرتا؟ اس کا بخشا ہوا امن کیا محض اندھے
یقین اور بے سوالی کی پناہ ہے؟ وہ سکون ہے جو چین سے بندرگاہ میں
پہنچ جانے، اور کھلے سمندر کے طوفانوں سے بچ جانے پر حاصل ہوتا ہے؟ یا
اس سے زیادہ کچھ اور؟ بعض صورتوں میں تو یقیناً یہ کچھ اور بھی ہوتا
ہے۔

لیکن منظم مذہب کا ماضی کچھ بھی رہا ہو آج تو وہ زیادہ تر ایک خالی شکل ہے
حصہ رہا ہے [illegible]

کی نہیں، بلکہ اوروں کے مذہب کی!) ایک متحجر جسم سے دی ہے جس کی شکل تو کسی جانور یا دوسری زندہ چیز کی ہے، جس کا نامی مغز سب غائب ہو گیا ہے۔ بس خول اس لئے باقی ہے کہ اس میں کوئی بالکل ہی دوسری چیز بھر گئی ہے۔ اگر مذہب میں کوئی قابل قدر چیز باقی بھی ہے تو وہ بھی بہت کچھ دوسری مضر چیزوں میں لپٹی ہوئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حال مغربی مذہبوں کی طرح ہمارے مشرقی مذاہب پر بھی گذرا ہے۔ انگریزی کلیسا شاید اس مذہب کی سب سے واضح مثال ہے جو کسی حقیقی معنی میں مذہب نہیں۔ ایک حد تک تو یہ حال تمام منظم پروٹسٹنٹ مذاہب کا ہے، لیکن کلیسائے انگلستان اس میں بہت آگے اس لئے نکل گیا ہے کہ یہ مدت سے ریاست کا ایک سیاسی شعبہ ہے۔[1]

---

[1] ۔ ہندوستان میں تو انگریزی کلیسا اور انگریزی حکومت میں تمیز کرنا بھی دشوار ہے، ہندوستان کی سرکاری آمدنی سے باضابطہ تنخواہ پانے والے پجاری اور پادری اسی طرح سامراجی قوت کے علم بردار ہیں جیسے کہ دوسری اعلیٰ خدمات والے۔ ہندوستانی ریاست میں بہ حیثیت مجموعی یہ کلیسا جمود اور ترقی دشمنی کی ایک قوت رہا ہے اور عام طور سے اس نے ہر ترقی اور اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ مشن کے معمولی کام کرنے والے عام طور پر ہندوستان کے ماضی اور اس کے تمدن سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں اور اس بات کے معلوم کرنے کی ذرا زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ تمدن کیا تھا اور کیا ہے۔ اسے تو فکر بس زیادہ اس کا ہوتا ہے کہ کفار کے عیبوں اور گناہوں کو ظاہر کرے۔ اس کلیہ کے بہت سے مستثنیات بھی ضرور رہیں مثلاً جارلی اینڈریوز سے زیادہ سچا دوست ہندوستان کا اور کون ہے۔ ال، گ، ہمہ گیر (بقیہ صفحہ ۱۶۲/ا)

اس میں شک نہیں کہ اس کے معتقدوں میں بہت سے لوگ نہایت اعلیٰ سیرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کلیسا نے کس کس طرح برطانوی سامراج کی خدمت انجام دی ہے اور سرمایہ داری اور سامراج دونوں کو ایک اخلاقی اور مسیحی لباس پہنایا ہے۔ اس نے اعلیٰ ترین اخلاقی معیاروں سے ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ کی غاصبانہ سیاست کو حق بجانب ثابت کیا ہے اور انگریزوں کے اندر اس غیر معمولی اور قابل رشک احساس کے پیدا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۲) محبت، ان کا جذبہ خدمت، ان کی بے حساب دست داری سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ پونا کے کرسٹا سیوا سنگ میں بھی چند اچھے انگریز ہیں جن کے مذہب نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ دوسروں کو سمجھیں اور ان کی سیوا کریں نہ کہ خواہ مخواہ مشیخت جتائیں اور جنھوں نے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو ہندستان کی بے غرض خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اور بھی بہت سے انگریز اہل کلیسا ہیں جن کی یاد ہندوستان میں زندہ رہے گی۔

کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب نے ۱۲ دسمبر ۳۳ء کو دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے ۱۷ء کے مانٹیگو چیمسفورڈ والی اصلاحات کے تمہیدی کلمات کا ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ بڑا اعلان ذرا عجلت میں کر دیا گیا اور گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی منجملہ ان دریا دلی کی عاجلانہ حرکتوں کے ہے جو جنگ کے بعد کی گئیں۔ لیکن اب جو منزل مقرر ہو گئی اسے واپس لینا تو ممکن نہیں"۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی کلیسا کا سردار ہندوستانی سیاست کے متعلق ایسا انتہائی قدامت پسندوں والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ قدم جسے ہندوستانی رائے عامہ نے بالکل ناکافی جانا تھا اور جسے ہم نے ۱۹۲۱ء سے عدم تعاون اور اس کے جملہ عواقب (بقیہ صفحہ ۱۶۴)

تونے کا سامان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حق بجانب ہی ہوتے ہیں ہیں ٹھیک نہیں جانتا کہ برابر حق بجانب ہونے کا یہ آرام دہ خیال کلیسا نے پیدا کرایا ہے یا خود کلیسا اس کی پیداوار ہے۔ بر اعظم یورپ اور امریکہ کی دوسری قومیں جو ذرا کم خوش حال ہیں انگریزوں پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں۔ اور البیون (انگریز) کی "دغابازی" کا طعن بہت پرانا ہے۔ مگر یہ الزام غالباً برطانوی کامیابی پر حسد کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے کہ بھلا کوئی اور سامراجی طاقت پر برطانیہ کیا پتھر پھینکے گی؛ خود اس کا اپنا نامۂ اعمال بھی تو اتنا ہی سیاہ ہو گا۔ جو قوم جان بوجھ کر ریاکاری کر رہی ہو وہ قوت کے ایسے محفوظ خزانے سے بر روئے کار نہیں لا سکتی جیسے کہ انگریز بار ہا لائے ہیں اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مذہب کا جو خاکہ انھوں نے اختیار کیا ہے اس نے ان کی بڑی مدد کی ہے یوں کہ جہاں خود ان کی اغراض کا معاملہ ہے وہاں اس نے ان کے اخلاقی حس کو کند کر دیا ہے۔ دوسرے لوگوں اور قوموں نے بارہا انگریزوں سے زیادہ بری طرح کام کئے ہیں لیکن اس میں انھیں کبھی اس قدر کامیابی نہیں ہوئی کہ اپنے فائدہ کی بات کو تو خیر اور نفس کی بھی مان لیں۔ یوں تو ہم سب کو اس میں بڑی آسانی ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھیں اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر انداز کر دیں۔ لیکن شاید انگریز

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۶) کے لئے راہ کھولی تھی اسے یہ لاٹ پادری صاحب عجلت اور دریادلی پر مبنی خیال فرماتے ہیں۔ انگریزی حکمران طبقہ کے نقطۂ نظر سے بیشک یہ تسکین دہ خیال ہے اور اپنی ایسی دریادلی کے یقین سے جو عاجلانہ بے احتیاطی کی حد تک پہنچتی ہو ضرور ان لوگوں میں اطمینان قلب کی ایک روحانی رو دوڑ جاتی ہو گی۔

اور سب سے بازی لے گیا ہے۔ ؎۱

پروٹسٹنٹ مذہب نے نئے حالات سے مطابقت کی کوشش کی اور اس کی تدبیر کی کہ دونوں دنیاؤں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے اسے بڑی کامیابی ہوئی لیکن دینی نقطہ نظر سے بحیثیت ایک منظم مذہب کے وہ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مذہب کی جگہ محض جذبات اور کاروبار نے لے لی۔ کلیسائے روما کے مذہب کا یہ حشر نہیں ہوا اس لئے کہ وہ یکسوئی سے اپنی پرانی جگہ پر جما رہا اور جب تک وہ جگہ مستحکم ہے یہ بھی پھلتا پھولتا رہے گا۔ اگر لفظ مذہب کے محدود معنی لیے جائیں تو آج مغربی دنیا میں بس کلیسائے روما کا مذہب ہی ایک زندہ مذہب ہے۔ قید خانہ میں ایک رومن کیتھولک دوست نے مجھے اپنے مذہب کی بہت سی کتابیں اور پاپائے روم کے گشتی اعلانات بھیجے تھے اور میں نے انہیں بڑے شوق سے پڑھا۔ اور ان کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد پر اس مذہب کا کتنا تسلط ہے۔ اسلام اور عام ہندومت کی طرح یہ بھی شک و شبہ اور ذہنی انتشار کے

؎۱۔ ہندوستانی سیاست پر کلیسائے انگلستان کے بالواسطہ اثر کی ایک مثال حال میں میرے علم میں آئی۔ صوبہ متحدہ کے عیسائیوں کی ایک کانفرنس نومبر ۳۴ع کو کانپور میں ہوئی تھی۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مسٹر ای۔ وی۔ ڈیوڈ نے فرمایا "عیسائی ہونے کی حیثیت سے ہم مذہباً ملک معظم کی وفاداری پر مامور ہیں کہ وہ ہمارے دین کے محافظ ہیں۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مدد دی جائے۔" آگے چل کر مسٹر ڈیوڈ نے سول سروس، پولیس اور کل مجوزہ دستور سیاسی کے متعلق انگلستان کے شدید قدامت پسند گروہ کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار فرمایا کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی اس جدید دستور سے احتمال ہے کہ ہندوستان میں مشن کا سارا کاروبار خطرہ میں پڑ جائے۔

طوفانی سمندر میں ایک محفوظ لنگر کا کام دیتا ہے اور آنے والی زندگی کا یقین دلاتا ہے جس میں اس زندگی کی خامیوں کی تلافی ہو جائے گی۔

مگر کیا کروں میرے لئے اس طرح پناہ ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ میں کھلے سمندر کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کے طوفان و طغیانی کو۔ نہ مجھے بعد والی زندگی میں اور موت کے بعد جو ہو گا اس میں کچھ بہت دلچسپی ہے۔ میرے ذہن کو مشغول رکھنے کے لئے تو اسی زندگی کے مسائل کافی ہیں چینیوں کا روایتی نقطہ نظر، جو اصولاً اخلاقی ہے مگر غیر مذہبی یا یوں کہیئے کہ مذہبی تشکیک سے متاثر، وہ مجھے بہت بھاتا ہے اگرچہ چینیوں نے جس طرح اسے زندگی پر نافذ کیا ہے اس سے میں متفق نہیں۔ مجھے دلچسپی ہے ان کے تاؤ، سے، ان کے طریق حیات سے، اس راستہ سے جس پر کہ ان کے نزدیک چلنا چاہیئے، زندگی کو سمجھنا چاہیئے، اسے رد نہ کرنا چاہیئے بلکہ قبول، اس سے مطابقت پیدا کرنی چاہیئے اور اس کو بہتر بنانا چاہیئے۔ لیکن معمولاً مذہبی رجحان کو اس دنیا سے کچھ سروکار ہی نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہ وضاحتِ فکر کا دشمن ہوتا ہے اس لئے ہی نہیں کہ بعض مقررہ اور ناقابل تغیر نظریوں اور عقیدوں کے بے چون و چرا تسلیم کرنے پر اس کی بنیاد ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ جذبات جلی و خفی پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ اس چیز سے بہت دور ہوتا ہے جسے میں روحانیت اور روح کی باتیں جانتا ہوں اور یہ یا تو جان بوجھ کر یا نادانستہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اس لئے کہ کہیں حقیقت اس کے تعصبات سے مطابقت کرنے سے معذور نہ ہو۔ یہ تنگ نظر ہوتا ہے اور دوسرے خیالات اور آراء کے ساتھ رواداری نہیں برتتا۔ یہ خود غرض اور برخود غلط ہوتا ہے، اور اکثر مطلبی لوگوں اور موقع شناسوں کو اپنے سے بیجا فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل دین کبھی کبھی اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی

زندگی کا نمونہ نہ تھے یا اب بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ مذہبی نقطۂ نظر کسی قوم کی اخلاقی و روحانی ترقی میں مدد نہیں دیتا بلکہ اس میں حائل ہی ہوتا ہے، اگر اخلاق اور روحانیت کو اس دنیا کے معیاروں سے جانچا جائے نہ کہ آخرت سے۔ عموماً تو مذہب خدا یا ذات مطلق کی غیر معاشرتی جستجو بن کر رہ جاتا ہے اور مذہبی آدمی کو سماج کی بھلائی سے کہیں زیادہ اپنی شخصی نجات کی فکر رہتی ہے۔ صوفی اپنے کو نفس سے رہا کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اکثر نفس اس پر چھا جاتا ہے۔ اخلاقی معیاروں کو جماعتی ضرریات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی بنیاد معصیت کے مافوق الطبیعت مسلک پر ہوتی ہے۔ اور منظم مذہب تو بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تبدیلی اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے شروع میں غلاموں کو اپنی معاشرتی حالت بہتر کرنے میں مدد نہیں دی۔ غلام لوگوں کو جو قرون وسطیٰ کے منصب داری نظام میں زرعی چاکر کی حیثیت ملی تو وہ معاشی اسباب سے۔ کلیسا کا نقطۂ نظر تو ابھی دو سو سال پہلے تک (۱۷۲۷ء تک) جو تھا اس کا پتہ ایک خط سے چلتا ہے جو لندن کے بڑے پادری نے امریکہ کی جنوبی نوآبادیوں کے غلاموں کے مالکوں کو لکھا تھا۔

پادری صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ "مسیحت سے یا کتاب مقدس کے قبول کرنے سے شہری حقوق ملکیت میں یا شہری تعلقات سے متعلق جو فرائض ہیں ان میں مطلق فرق نہیں پڑتا۔ ان سب حیثیات سے تو آدمی اسی حال میں رہتے ہیں جس میں وہ پہلے تھے۔ مسیحیت جو آزادی بخشتی ہے وہ تو گناہ سے، شیطان سے، اور انسان کے شہوات وجذبات اور بے جا خواہشات سے آزادی ہے

لیکن جہاں تک ان کی خارجی حالت کا تعلق ہے، وہ پہلے جو کچھ تھے، چاہے وہ آزاد تھے یا غلام، تو اس میں عیسائی ہو جانے یا بپتسمہ لینے سے یعنی کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

آج تو کوئی منظم مذہب اس صفائی سے اپنا یہ خیال ظاہر نہ کرے گا لیکن سچ پوچھئے تو تب بھی حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود خیالات کے منتقل کرنے کا بہت ناقص ذریعہ ہیں اور مختلف لوگ ان کے مختلف معنی سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید کسی زبان کے کسی اور لفظ کی مختلف لوگ اتنی مختلف تعبیریں نہ کرتے ہوں جتنی کہ لفظ مذہب، (یا دوسری زبانوں میں اس کے مرادف لفظ) کی۔ اس لفظ کو پڑھ کر یا سن کر شاید دو آدمیوں کے ذہن میں بھی خیالات و تصورات کا ایک سا مجموعہ سامنے نہ آتا ہو گا۔ جو خیالات اور تصورات اس لفظ سے ابھرتے ہیں وہ کہیں رسم و رواج کے ہیں، کہیں مقدس کتابوں کے، کہیں آدمیوں کی ایک جمعیت کے تو کہیں چند قطعی عقائد کے، کہیں اخلاق، احترام، محبت کے، کہیں خوف و نفرت کے، خیرات، قربانی، رہبانیت کے، روزہ رکھنے کے اور خوب کھانے پینے کے جشنوں کے، دعا و عبادت کے، قدیم تاریخ کے، شادی کے، موت کے، آنے والی دنیا کے بلووں کے اسر چھوٹنے کے، غرض طرح طرح کے۔ تعبیروں اور تصوروں کی اس بے حساب رنگا رنگی سے جو سخت انتشار پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ہمیشہ ایک تیز جذباتی تحریک بھی شامل ہوتی ہے جس میں ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کا امکان نہیں رہتا۔ لفظ مذہب کے کوئی واضح معنی اب باقی نہیں رہے ہیں (اگر کبھی تھے)، چنانچہ اس سے سخت

انتشار پیدا ہوتا ہے اور دلیل و بحث کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہیں ختم ہونے پر نہیں آتا اس لئے کہ مختلف لوگ اس کے بالکل ہی جدا جدا معنی لیتے ہیں۔ بہت بہتر ہوتا اگر اس لفظ کا استعمال ہی ترک کر دیا جاتا اور اس کی جگہ دوسرے لفظ استعمال کئے جاتے جن کے معنی زیادہ محدود و معین ہوتے مثلاً دینیات فلسفۂ اخلاق، اخلاقیات، روحانیت، مابعد الطبیعات، فرض، رسم وغیرہ۔ خود یہ الفاظ بھی خاصے مبہم ہیں لیکن ان کا مفہوم 'مذہب' سے کہیں محدود ہے۔ اور ایک بڑا فائدہ یوں ہوگا کہ ان لفظوں کے ساتھ وہ جذبات اس طرح وابستہ نہیں ہیں جن میں کہ لفظ مذہب چاروں طرف سے لپٹا ہوا ہے۔

پھر آخر مذہب ہے کیا؟ (اگر باوجود اس کے عیوب کے اسی لفظ کو استعمال کیا ہی جائے)۔ غالباً اس سے مراد فرد کی اندرونی نشوونما ہے، یعنی اس کے شعور کا ارتقا کسی ایسی سمت میں جسے اچھا سمجھا جاتا ہے پھر خود یہ بات موضوع بحث بن جاتی ہے کہ وہ سمت کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں مذہب اسی اندرونی تبدیلی پر زور دیتا ہے اور خارجی تبدیلی کو اسی داخلی نشوونما کا پرتو جانتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندرونی تبدیلی خارجی ماحول پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی صاف ہے کہ خارجی ماحول بھی اس اندرونی تبدیلی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب میں خارجی ترقی اندرونی نشوونما کی نسبت بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جیسا کہ مشرق کے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہم صنعت میں پیچھے ہیں اور ہماری خارجی ترقی سُست ہے اس لئے ہمارا اندرونی ارتقا کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی ان دھوکوں میں سے ایک دھوکہ ہے جن سے

ہم اپنے کو تسلی دے لیا کرتے ہیں اور اپنے ہیٹے پن کے احساس پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ افراد حالات اور ماحول سے بالاتر ہو کر اندرونی بلندیاں حاصل کریں۔ لیکن انسانوں کے بڑے گروہوں اور قوموں کے لئے تو اندرونی ارتقا شروع ہونے سے پہلے لازم ہے کہ خارجی نشوونما ایک خاص درجہ تک پہنچ چکا ہو۔ جو شخص معاشی حالات کا شکار رہا اور زندہ رہنے کی کشاکش اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو وہ مشکل ہی سے شعور داخلی کے کسی بلند مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے۔ جو طبقہ دوسروں کے قدموں تلے پس رہا ہو اور دوسرے جس سے بیجا فائدے اٹھا رہے ہوں وہ کبھی اندرونی ترقی نہیں کر سکتا۔ جو قوم سیاسی اور معاشی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی محکوم ہو اور ہر طرف سے گھری ہو، جس پر طرح طرح کی حد بندیاں ہوں جس سے دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہوں، اسے کبھی اندرونی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی۔ غرض خود اندرونی نشوونما کے لئے باہر کی آزادی اور مناسب ماحول لازم ہو جاتا ہے اس خارجی آزادی کے حاصل کرنے اور ماحول کو اس طرح بدلنے میں کہ اندرونی نشوونما کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ہٹ جائیں، پسندیدہ بات یہ ہے کہ جو وسائل اختیار کئے جائیں وہ ایسے ہوں کہ یہ مقصد فوت نہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب گاندھی جی فرماتے ہیں کہ وسائل مقصد سے زیادہ اہم ہیں تو ان کے خیال میں اسی قسم کی کوئی بات ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وسائل ایسے ہوں جو اس مقصد تک لے جا سکیں، ورنہ ساری کوشش ضائع ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبار سے حالت پہلے سے پست تر ہو جائے۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "کوئی آدمی مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا

بعض لوگ ہیں جو اپنی عقل کے غرور میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انھیں مذہب سے کچھ سروکار نہیں۔ مگر اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کہے کہ میں سانس لیتا ہوں مگر میرے ناک نہیں"۔ پھر کہیں وہ کہتے ہیں "حق وصداقت کے ساتھ میری شیفتگی مجھے سیاست میں گھسیٹ لائی ہے اور میں ذرا سے تامل کے بغیر اگرچہ بڑے عجز کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب ہے کیا"۔ زیادہ صحیح ہوتا اگر وہ یہ فرماتے کہ جو لوگ زندگی اور سیاست سے مذہب کو خارج کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ مذہب کے معنی اس سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ یہ بات تو صاف ہے کہ گاندھی جی اس لفظ کو ایک ایسے معنی میں استعمال کرتے ہیں (غالباً اور کسی معنی سے زیادہ اخلاقی معنی میں) جو مذہب کے نکتہ چینیوں کے معنی سے مختلف ہی۔ ایک لفظ کو یوں مختلف معنوں میں استعمال کرنے سے ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مذہب کی ایک بالکل نئی تعریف، جس سے اہل مذہب اتفاق نہ کریں گے پروفیسر جان ڈیوی کی تعریف ہے۔ ان کے خیال میں "مذہب سب کچھ ہے جس سے وجود کے منفرد اور متغیر حوادث و واقعات میں حقیقی توحید منظر پیدا ہو"۔ یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ "ہر وہ عمل جو کسی غیبی مقصد کے لئے موانع کے مقابلہ میں اور شخصی نقصانات کے ڈر کے باوجود کیا جائے اس لئے کہ اس کی عام اور مستقل قدر کا یقین ہے اپنی کیفیت میں مذہبی ہوتا ہے"۔ اگر مذہب یہ ہے تو پھر یقیناً کسی کو اس پر ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

رومیں رولاں نے بھی مذہب کے تصور کو پھیلا کر اسے وہ معنی دیئے ہیں جس سے شاید منظم مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھریں۔

سوانح رام کرشن میں کہتے ہیں: "بہت سی روحیں ہیں جو مذہبی عقیدہ سے آزاد ہیں یا سمجھتی ہیں کہ آزاد ہیں لیکن جو درحقیقت ہر لمحہ ایک فوق العقل شعور میں ڈوبی رہتی ہیں جس کا نام وہ اشتراکیت رکھ لیتی ہیں یا اشتمالیت، انسان دوستی یا قوم پرستی یا عقلیت تک خیال کی کیفیت سے اس کا منبع معین ہوتا ہے نہ کہ اس کے موضوع سے اور ایسی کیفیت کی بنا پر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے نکلا ہے یا نہیں۔ اگر وہ تلاش حق کی طرف بے خوف وخطر بڑھتا ہے، پھر چاہے جو بھی ہو اور یکسوئی اور خلوص کے ساتھ ہر قربانی کے لئے تیار ہے تو میں اسے ضرور مذہبی کہوں گا، اس لئے کہ وہ ضرور انسانی سعی کے لئے ایک ایسے مقصد پر یقین رکھتا ہے جو موجودہ معاشرہ کی زندگی سے بالا ہے بلکہ کل انسانیت کی زندگی سے بھی ارفع۔ خود تشکیک تک روح مذہبی کے لشکر بزرگ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے بشرطیکہ یہ تشکیک قوی اور کھری فطرتوں سے پیدا ہو اور کمزوری کا مظہر نہ ہو بلکہ قوت کا۔"

نہ جانے میں ان شرائط کو پورا بھی کرتا ہوں یا نہیں جو رومان رولان نے لگائی ہیں مگر ان حالات میں تو میں اس لشکر بزرگ کا ایک ناچیز پیادہ پیرو بننے کے لئے ضرور تیار ہوں۔

(۴۸)

برطانوی حکومت کی دورُخی پالیسی

ہریجن تحریک جاری تھی۔ گاندھی جی پہلے یرودا جیل سے اس کی رہنمائی کرتے رہے اور اب باہر سے کر رہے تھے۔ اس بات کے لئے سخت جدوجہد ہو رہی تھی کہ مندروں کے داخلے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور کر دی جائیں اور اس کا ایک مسودۂ قانون اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس وقت یہ حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ کانگرس کے ایک ممتاز لیڈر دہلی میں گھر گھر پھر رہے تھے اور اسمبلی کے ممبروں کو اس مسودۂ قانون کی تائید پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود گاندھی جی نے ان کے ذریعے سے اسمبلی کے ممبروں سے اپیل کیا تھا لیکن لطف یہ ہے کہ سول نافرمانی اب بھی جاری تھی اور لوگ جیل میں جا رہے تھے اور کانگرس نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا اور ہمارے سب ممبر استعفیٰ دے کر چلے آئے تھے۔ بچے کھچے ممبروں نے اور ان لوگوں نے جو کانگرسی ممبروں کی جگہ منتخب ہوئے تھے اس نازک زمانے میں ہمیشہ کانگرس کی مخالفت اور حکومت کی موافقت کی تھی۔ ان کی اکثریت نے حکومت کو اس جابرانہ قانون کے پاس کرنے میں مدد دی تھی جس کے ذریعے سے تعزیری ضابطوں کو ایک مستقل شکل دے دی تھی۔ انھوں نے اوٹاوہ کے معاہدے کو چپ چاپ قبول کر لیا تھا، شملہ اور لندن میں بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ دعوتیں اڑائی تھیں، ہندوستان کی برطانوی حکومت کی شکر گذاری کے گیت گائے تھے اور اس کی "دورخی پالیسی" کی کامیابی کے لئے دست بدعا تھے۔

مجھے ان حالات میں گاندھی جی کے اپیل پر حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ راج گوپال اچاریہ جو چند ہفتے پہلے کانگرس کے قائم مقام پریسیڈنٹ تھے ان حضرات کی

تائید حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سول نافرمانی کی جدوجہد کو نقصان پہنچا۔ میرے لئے اس کا اخلاقی پہلو اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میرے خیال میں گاندھی جی یا کسی کانگریس لیڈر کا یہ طرز عمل اخلاقاً ناجائز تھا اور ایک قسم کی بدعہدی تھی ان ہزارہا آدمیوں سے جو جیل میں تھے یا اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ گاندھی جی کا نقطۂ نظر دوسرا ہے۔

حکومت نے اس وقت اور اس کے بعد اصلاح مندر کے مسودۂ قانون کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اس کے حامیوں کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے، اس کو بار بار ملتوی کرتی رہی اور اس کے مخالفوں کو شہ دیتی رہی یہاں تک کہ آخر میں اس نے کھلم کھلا مخالفت کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ کم و بیش یہی رویہ وہ ہندوستان کی ہر سماجی اصلاح کے معاملے میں رکھتی ہے اور مذہب میں مداخلت نہ کرنے کے بہانے سے وہ معاشرتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ خود ہماری سماجی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتی ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتی ہے۔ اتفاق سے سارداایل جو بچپن کی شادی کو روکنے کے لئے پیش کیا گیا تھا منظور ہو گیا مگر اس بدنصیب ایکٹ کا جو حشر ہوا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حکومت کو اس قسم کی تجویزوں پر عمل کرنا کس قدر ناگوار ہوتا ہے۔ وہی حکومت جو راتوں رات تعزیری ضابطے بنا ڈالتی ہے جن میں نئے نئے جرم تراشے جاتے ہیں اور ایک شخص کے جرم کی سزا دوسروں کو دی جاتی ہے جو بیسیوں ہزار آدمیوں کو ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے پر جیل بھیج دیتی ہے وہ سارداایکٹ جیسے باقاعدہ قانون کو نافذ کرنے سے ڈرتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس ایکٹ کا اثر بالکل الٹا ہوا۔ اس لئے کہ اس میں از راہ حماقت لوگوں کو چھ مہینے کی مہلت دی گئی تھی جس سے بے شمار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ ایکٹ محض ایک مذاق ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی مطلق کوشش

نہیں کی گئی اور بہت سے گاؤں والوں کو آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس ایکٹ کا کیا منشا ہے۔ ان کے سامنے ہندو مسلمان مذہبی واعظ اس کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے جنھیں خود بھی صحیح واقعات کا علم نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کے معاملے میں جو رواداری کا برتاؤ کرتی ہے اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ ان کی مؤید ہے۔ بلکہ اس میں شک نہیں کہ اسے ان خرابیوں کے دور کرنے کی فکر نہیں کیونکہ ان سے اس کے کام میں یعنی ہندوستان پر حکومت کرنے میں اور اس کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں خلل پڑتا ہے۔ پھر یہ خطرہ بھی ہے کہ سماجی اصلاح کی تجاویز سے بعض لوگ ناراض ہو جائیں گے اور چونکہ حکومت کو ملک کی سیاسی مخالفت سے نپٹنا دشوار ہے اس لئے وہ نہیں چاہتی کہ اپنے لئے اور مشکلات پیدا کرے۔ مگر کچھ دنوں سے سماجی مصلحوں کے کام میں اور بھی سخت دشواری پیدا ہو گئی ہے اس لئے کہ حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب قسم کے حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں مگر سناتن دھرمی رجعت پسندی میں اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ جو مذہب کے معاملے میں ہر قسم کی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں اور اسی کے ساتھ برطانوی حکومت کے پکے وفادار ہیں یا کم سے کم زور شور سے وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر حکومت خاموش رہی اور اس نے ساردا ایکٹ کو ہر دل عزیز بنانے اور نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی تو کانگرس یا دوسری غیر سرکاری جماعتوں نے اس کے لئے پروپگنڈا

کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال برطانیہ کے اور دوسرے ملکوں کے نکتہ چینوں کی طرف سے اکثر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے وہ پچھلے پندرہ سال سے خصوصاً ۱۹۳۰ء سے برطانوی حکومت سے قومی آزادی کی شدید جنگ میں مصروف ہے جس پر اس کی موت اور زندگی کا دار و مدار ہے۔ رہیں دوسری انجمنیں تو ان میں نہ حقیقی قوت ہے اور نہ انھیں عام لوگوں سے تعلق ہے۔ وہ عورتیں اور مرد جو اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی قوت رکھتے ہیں اور عوام میں ہر دل عزیز ہیں سب کے سب کھنچ کر کانگرس میں چلے آئے ہیں اور زیادہ تر اپنا وقت قید فرنگ میں گزارتے ہیں۔

دوسری انجمنیں اس سے آگے نہیں بڑھتیں کہ چند منتخب لوگوں کو جمع کر کے رزولیوشن پاس کر دیں۔ عام لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کی ان میں جرأت نہیں۔ مردوں کی انجمنیں جنٹلمینوں کی طرح اور انجمن خواتین مہذب لیڈیوں کی شان سے کام کرتی ہیں اور جارحانہ پروپیگنڈا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ تعزیری ضابطوں اور ان قانونوں نے جو ہر قسم کی پبلک جد و جہد کو دبانے کے لئے بنائے گئے تھے ان انجمنوں کو بھی معطل کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ مارشل لا انقلابی جد و جہد کو کچل دے مگر اسی کے ساتھ وہ تمدن اور تمدنی جد و جہد کو بھی معطل کر دیتا ہے۔

مگر کانگرس اور دوسری غیر سرکاری انجمنوں کا سماجی اصلاح میں زیادہ حصہ نہ لینے کا اصلی سبب اس سے زیادہ گہرا ہے۔ ہم لوگ قوم پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر اسی کا خیال چھایا ہوا ہے اور اس وقت تک چھایا رہے گا جب تک ہمیں سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ برنارڈ شا کا یہ قول ہمارے حسب حال ہے "محکوم قوم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو۔ وہ دن رات اسی کی فکر میں رہتا ہے... ...... سچ پوچھئے تو کسی قوم کے لئے قومی تحریک سب سے بڑی مصیبت ہے۔ یہ ایک طبعی عمل کے روک دئے جانے کی تکلیف دہ علامت ہے۔ محکوم قومیں دنیا کی رفتار ترقی میں

پیچھے رہ جاتی ہیں اس لئے کہ ان کی ساری توجہ اس کوشش میں صرف ہوتی ہے کہ کسی طرح قومی آزادی حاصل ہو اور قومی تحریک سے پیچھا چھوٹے۔"

پچھلے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم موجودہ حالات میں سماجی ترقی نہیں کرسکتے۔ اگرچہ بظاہر حکومت کے بعض صیغے منتخب شدہ وزیروں کی طرف منتقل کر دئے گئے ہیں حکومت کے انتہائی جمود سے ہمیشہ قدامت پسندوں کو مدد ملتی ہے اور برٹش گورنمنٹ مدتوں سے ہماری روح عمل کو کچلتی رہی ہے اور ہم پر استبدادی یا بقول خود بزرگانہ حکومت کرتی رہی ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ غیر سرکاری لوگ کوئی غیر منظم تحریک شروع کریں اور اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت کچھ اور ہے۔ ہریجن تحریک اپنے چلانے والوں کی انتہائی احتیاط کے باوجود کبھی کبھی سرکاری ملازموں سے ٹکرا جاتی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر کانگرس سارے ملک میں یہ پروپیگنڈا کرے کہ صابون زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو بہت سے مقامات پر اس سے اور حکومت سے ٹکر ہو جائے گی۔

میرے خیال میں اگر ریاست سماجی اصلاح کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو عام لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہوگی مگر غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے لوگوں کو ہمیشہ شبہ رہتا ہے اور ان کو خیالات کے بدلنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی اگر غیر ملکی حکومت ہٹ جائے اور معاشی تبدیلیاں مقدم رکھی جائیں تو قابل اور مستعد حکام آسانی سے بڑی بڑی سماجی اصلاحیں کرسکتے ہیں۔

مگر جیل میں ہمیں سماجی اصلاح اور سارد ا ایکٹ اور ہریجن تحریک کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ مجھے تو یہ بات ناگوار تھی کہ ہریجن تحریک نے سول نافرمانی میں رکاوٹ ڈال دی شروع مئی ۱۹۳۳ء میں ہریجن تحریک چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی اور ہم کو یہ فکر تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ التوا کی وجہ سے تحریک کا رہا سہا زور ختم ہو گیا کیونکہ قومی لڑائی کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا شروع کر دیا اور جب چاہا بند کر دیا۔ التوا سے پہلے بھی تحریک کے

لیڈر بڑی کمزوری اور بودے پن کا ثبوت دے رہے تھے۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں ہو رہی تھیں اور طرح طرح کی افواہیں مشہور کی جاتی تھیں جن سے عملی کام میں خلل پڑتا تھا۔ کانگرس کے بعض قائم مقام پریسیڈنٹ بہت قابل قدر لوگ تھے مگر انھیں جنگ کا سپہ سالار بنانا ان پر بڑا ظلم تھا۔ وہ کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس مشکل سے کسی طرح پیچھا چھڑائیں۔ بڑے لیڈروں کی اس ہچکچاہٹ اور لیت و لعل سے کچھ لوگ بیزار تھے مگر وہ اپنی بیزاری کا اظہار منظم طریقے سے نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ تمام کانگرس کمیٹیاں خلاف قانون قرار دے دی گئی تھیں۔

اسی حالت میں گاندھی جی کا اکیس دن کا برت شروع ہوا۔ وہ جیل سے رہا کر دیے گئے اور سول نافرمانی چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ برت ختم ہو گیا اور گاندھی جی کو رفتہ رفتہ افاقہ ہونے لگا۔ وسط جون میں سول نافرمانی کے التوا کی میعاد چھ ہفتے اور بڑھا دی گئی۔ اس اثنا میں حکومت کے جبر و تشدد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جزیرۂ انڈمن میں سیاسی قیدی (بنگال کے انقلابی تشدد کے مجرم وہاں بھیجے گئے تھے) بدسلوکی کی وجہ سے بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ ان میں سے دو ایک فاقے کرتے کرتے مر گئے اور بہت سے قریب مرگ تھے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں انڈمن کے واقعات کے خلاف احتجاج کے جلسے کیے انھیں بھی گرفتار کر کے سزا دے دی گئی۔ حکومت کی مرضی یہ تھی کہ ہم تکلیف اٹھائیں اور اُف تک نہ کریں۔ چاہے سیاسی قیدی جن کے پاس بھوک ہڑتال کے سوا احتجاج کا کوئی ذریعہ نہ تھا، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ چند مہینے بعد ستمبر ۳۳ء میں (جب میں جیل سے رہا ہو چکا تھا) ایک اپیل شائع کیا گیا جس پر رابندر ناتھ ٹیگور، ج۔ ف۔ اینڈریوز اور بہت سے اور مشہور لوگوں کے دستخط تھے جن میں سے اکثر کانگرس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ انڈمن کے قیدیوں سے زیادہ انسانیت کا سلوک کیا جائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کر دیے جائیں۔ حکومت ہند کے ہوم ممبر

اس اپیل پر بہت خفا ہوئے اور جن لوگوں نے اس پر دستخط کئے تھے ان کو برا بھلا کہا کہ وہ تبدیلیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں تک مجھے یاد ہے ان تبدیلیوں سے ہمدردی کرنا بنگال میں قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔

سول نافرمانی کے التوا کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہمیں ڈیرہ دون جیل میں یہ خبر ملی کہ گاندھی جی پونا میں ایک بے ضابطہ کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ دو تین سو آدمی وہاں جمع ہوئے اور گاندھی جی کے مشورے سے عام سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی مگر انفرادی نافرمانی کی اجازت رہی اور ہر قسم کے خفیہ طریقوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ فیصلے حوصلہ افزا نہیں تھے مگر مجھے ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سول نافرمانی کو روکنے کے معنی صرف یہ تھے کہ موجودہ حالت کا اعتراف کیا جائے اور اس کو قائم رکھا جائے کیونکہ سچ پوچھئے تو عام تحریک پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خفیہ کام کرنا محض ایک بہانہ تھا کہ تحریک اب بھی جاری ہے اور ہماری تحریک کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اس کی ضرورت صرف اس حد تک تھی کہ لوگوں کو ہدایتیں بھیجی جا سکیں اور ان سے تعلق قائم رکھا جا سکے مگر خود سول نافرمانی کو پوشیدہ رکھنا ناممکن تھا۔

مجھے جس بات سے تعجب اور افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ پونا میں ہماری موجودہ حالت اور مقاصد کے متعلق صحیح معنوں میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔ کانگرس والے تقریباً دو سال کی شدید جنگ کے بعد جمع ہوئے تھے اور اس عرصے میں ساری دنیا میں اور ہندوستان میں بڑے بڑے اہم واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت کے وہائٹ پیپر میں دستور اساسی کی اصلاح کی تجاویز شائع کی گئی تھیں۔ ہم اس عرصے میں مجبوراً خاموش رہے تھے اور دوسری طرف سے مسلسل جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا تھا تاکہ اصل مسئلہ لوگوں کی نظر سے چھپ جائے۔ نہ صرف حکومت کے حامیوں بلکہ لبرل پارٹی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی بار بار یہ کہا جا چکا تھا کہ کانگرس نے اپنا کامل آزادی کا

مقصد ترک کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس موقع پر اور کچھ نہیں تو کم سے کم یہ ضرور کرنا چاہئے تھا کہ ہمارا سیاسی مقصد دوبارہ واضح کر دیا جائے اور ممکن ہو تو اس کے ساتھ سماجی اور معاشی مقاصد کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ساری بحث اس بات تک محدود رہی کہ عام سول نافرمانی بہتر ہے یا انفرادی نافرمانی اور خفیہ طریقوں سے کام لینا مناسب ہے یا نہیں اس کے علاوہ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حکومت سے "صلح" کرنے کا چرچا ہو رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی مگر وائسرائے نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے ایک اور تار بھیجا جس میں "باعزت صلح" کا ذکر تھا۔ بھلا اس وقت اس پر اسرار صلح کی تلاش کا کیا موقع تھا جب کہ حکومت بڑے زور شور سے قوم کو ہر طرح کچلنے کی کوشش کر رہی تھی اور انڈمن میں لوگ فاقے کر کے جان دے رہے تھے؟ مگر میں جانتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو گا گاندھی جی کا اصول یہی ہے کہ وہ صلح کی درخواست ضرور کرتے ہیں۔

حکومت کا جبر و تشدد زور شور سے جاری تھا اور پبلک جدوجہد کو روکنے کے لئے تمام خاص قوانین نافذ تھے۔ فروری سنہ ۳۳ میں میرے والد کے یوم وفات کا جلسہ ہونے والا تھا مگر پولیس نے اس کو بھی روک دیا حالانکہ اسے کانگریس سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے صدر سر تیج بہادر سپرو جیسے اعتدال پسند تجویز کئے گئے تھے۔ آئندہ جو عنایات ہمارے حال پر ہونے والی تھیں ان کی جھلک ہمیں وھائٹ پیپر میں دکھائی گئی تھی۔

یہ ایک عجیب و غریب تحریر تھی جسے پڑھ کر انسان دم بخود رہ جاتا تھا۔ اس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستان موجودہ ہندوستانی ریاستوں کا ایک نشان وار نمونہ بنا دیا جائے اور اس کی وفاقی حکومت میں ان ریاستوں کے قدامت پسند نمائندوں کا اثر غالب ہو۔ مگر خود ان ریاستوں میں باہر والوں کا کوئی اثر نہ ہو اور وہاں بدستور خالص استبداد کا دور دورہ رہے۔ شہنشاہی کی اصل کڑیوں یعنی قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہم ہمیشہ لندن کے صرافے کے

غلام رہیں اور ہماری سکے اور زر کی پالیسی، ریزرو بینک کے توسط سے بینک آف انگلینڈ کے ہاتھ میں رہے۔ تمام مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ اس میں کوئی دست اندازی نہ ہو سکے بلکہ نئے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا کیے جائیں۔ عظیم الشان امپیریل سروسیں جن سے ہمیں دلی محبت ہے، بدستور آزاد اور خود مختار رہیں تاکہ وہ ہمیں رفتہ رفتہ حکومت خود اختیاری کی تربیت دیں۔ صوبوں میں خود اختیاری حکومت ہو مگر گورنر ایک شفیق مختار کل کی حیثیت سے ہماری تادیب کرتا رہے۔ اور سب کے اوپر، حاکموں کا حاکم، مختاروں کا مختار، وائسرائے ہو جسے سفید و سیاہ کا اختیار حاصل ہو۔ سچ پوچھیے تو برطانیہ کے حکمران طبقے کو نوآبادیوں پر حکومت کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے اس کا کمال اس وھائٹ پیپر میں نظر آتا ہے اور اگر ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ ہندوستان کے وائسرائے پر رشک کریں تو کچھ بے جا نہیں۔

ہندوستان کو اس دستور کی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد اوپر سے "خاص ذمہ داریوں" اور تحفظات کی بیڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دی گئیں تاکہ یہ بدنصیب قیدی ہل جل بھی نہ سکے۔ بہ قول مسٹر نویل چیمبرلین کے "دو حکومت برطانیہ نے انتہائی کوشش سے ان تجویزوں کے ساتھ ان تمام تحفظات کو شامل کر دیا ہے جو انسان کی عقل سوچ سکتی تھی۔"

پھر ہمیں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ان عنایات کے بدلے میں ہمیں ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑے گی، چند کروڑ یکمشت اور پھر سالانہ قسطیں۔ ظاہر ہے کہ سوراج کی برکتیں بغیر معقول قیمت دیے ہوئے کیوں کر حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہم اس دھوکے میں تھے کہ ہندوستان غریب ملک ہے اور بھاری بوجھ میں دبا ہوا ہے اور ہمیں امید تھی کہ جب آزادی ملے گی تو یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر اب معلوم ہوا کہ نہیں۔ یہ تو اور بڑھ جائے گا۔

ہندوستان کے مسئلے کا یہ مضحک حل اس متانت کے ساتھ پیش کیا گیا جو برطانوی قوم کے حصے میں آئی ہے اور ہم سے کہا گیا کہ دیکھو تمہارے حکمران کس قدر فیاض ہیں۔ آج

تک کسی شہنشاہی حکومت نے کسی محکوم قوم کو اتنے اختیارات اور حقوق اپنی خوشی سے نہ دیے ہوں گے۔ انگلستان میں ان سخی داتاؤں میں اور ان لوگوں میں جو اس سخاوت کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے تھے اور اس کی مخالفت کر رہے تھے بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ اس آمد و رفت کا جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تین سال سے ہو رہی تھی، تین گول میز کانفرنسوں اور بے شمار کمیٹیوں کا یہ نتیجہ تھا۔

مگر انگلستان جانے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سیلکٹ کمیٹی وھائٹ پیپر کا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھی تھی اور ہندوستانی اسیسروں اور گواہوں کی حیثیت سے بلائے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور کمیٹیوں کا اجلاس لندن میں ہو رہا تھا اور ہمارے ملک میں پس پردہ لوگ، ان کمیٹیوں کی ممبری کے لئے لڑ رہے تھے تاکہ لندن کا ٹکٹ مفت میں مل جائے اور مرکز سلطنت کی زیارت کا موقع نصیب ہو۔ وھائٹ پیپر کی دلشکن تجویزیں ان سورماؤں کی ہمت کو پست نہیں کر سکیں اور وہ سمندر اور ہوا کے سفر کی جوکھم اٹھانے اور لندن کے قیام کے شدید خطروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوگئے تاکہ اپنی خطابت اور جادو بیانی کے زور سے ان تجویزوں کو بدلوانے کی کوشش کریں۔ وہ یہ جانتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ کام بڑا دشوار اور مایوس کن ہے مگر وہ میدان سے ہٹنے والے نہ تھے اور اس پہ تلے ہوئے تھے کہ کوئی سنے یا نہ سنے ہم اپنی کہے جائیں گے۔ ان میں سے ایک صاحب جو تعاونی پارٹی کے لیڈر تھے اور سب لوگوں کے واپس آنے کے بعد بھی جمے رہے اور لندن کے ارباب اقتدار سے ملاقاتیں کرتے رہے اور ان کے ساتھ ڈنر پر ڈنر کھاتے رہے تاکہ خوب اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیں کہ وہ کیا سیاسی تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ جب وہ خدا خدا کر کے وطن لوٹے تو انھوں نے پبلک سے جو ان کے انتظار میں بے چین تھی، یہ فرمایا کہ وہ مرہٹوں کی شہرۂ آفاق پارٹی کے ساتھ لندن میں ڈٹے رہے اور آخر وقت تک اپنے مطالبات کو دہراتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے تعاونی دوست ظرافت کی حسِ مطلق نہیں رکھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے مذاق میں کوئی بات کہی جس سے یہ حضرات محظوظ ہونے کے بجائے بگڑ بیٹھے اور والد کو اپنا مطلب سمجھانا پڑا اور ان کی تالیف قلوب کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سے انھیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مجھے یہ شکایت سن کر مرہٹوں کے قابلِ قدر سپاہیانہ جوش کا دھیان آتا تھا جس کا اظہار نہ صرف پچھلے زمانے میں ہوا بلکہ آج بھی ہماری قومی جنگ میں ہو رہا ہے اور تلک کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں ڈرتا تھا، جس کا سر کٹ جائے مگر جھکتا نہ تھا۔

لبرل وھائٹ پیپر کے دل سے مخالف تھے اور انھیں وہ جبر و تشدد بھی پسند نہ تھا جو آئے دن ہندوستان میں ہوتا رہتا تھا بلکہ ایک آدھ بار انھوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ وہ کانگرس اور اس کی جد و جہد کو برا سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ حکومت کو کسی بڑے کانگرسی لیڈر کی رہائی کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کی ہمدردی صرف چند افراد تک محدود تھی جن سے ان کی ملاقات تھی۔ لبرل اور تعاونی دونوں جو دلیل پیش کرتے تھے وہ یہ تھی کہ فلاں شخص رہا کر دیا جائے کیونکہ اب امن عامہ کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور پھر حکومت کو ہر وقت اختیار ہے کہ اگر وہ اور کوئی شرارت کریں تو انھیں دوبارہ گرفتار کرے۔ اس وقت حکومت کا یہ فعل زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ انگلستان کے بعض حضرات بھی از راہ عنایت ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں اور چند خاص افراد کی رہائی کی تحریک کرتے تھے اور یہی دلیلیں پیش کرتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم ان حضرات کے شکر گزار نہ ہوں جو اسیری میں ہمارے پرسان حال تھے مگر بعض وقت یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے یہ مہربان ع ہم پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا۔ ہمیں ان کے خلوص نیت میں مطلق شبہ نہ تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ یہ سراسر برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا خلیج حائل ہے۔

لبرل حکومت کی بہت سی کارروائیوں کو ناپسند کرتے تھے اور انھیں بہت رنج ہوتا تھا مگر وہ بے چارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ حکومت کے خلاف کوئی موثر جدوجہد کرنا تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اپنی جداگانہ حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے انھیں عام لوگوں سے اور عملی جدوجہد کرنے والوں سے دور ہٹنا پڑا اور اپنی پالیسی زیادہ معتدل کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ان کے اور حکومت کے خیالات میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ان کی تعداد بہت کم تھی اور عام لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں تھا اس لئے ان کے الگ رہنے سے قومی تحریک کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ مگر ان میں بعض مشہور اور ممتاز اشخاص تھے جن کی ذاتی حیثیت سے بڑی قدر ومنزلت تھی۔ ان بزرگوں نے اور بہ حیثیت مجموعی لبرل اور تعاونی پارٹی نے اس نازک وقت میں سرکاری پالیسی کی اخلاقی مدد کرکے برطانوی حکومت کی زبردست خدمت کی۔ حکومت کے جبر وتشدد اور بے آئینی کو بھی اس سے بڑی شہ ملی کہ ان لوگوں نے اس کی کوئی مؤثر مخالفت نہیں کی بلکہ لبرل پارٹی نے تو کبھی کبھی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ بعض لبرل اور تعاونی جماعت نے اس شدید جبر واستبداد کی جو ملک میں ہو رہا تھا اخلاقی تائید کی، جبکہ خود حکومت کے لئے اس کو جائز ثابت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

لبرل لیڈر یہ فرماتے تھے کہ وھائٹ پیپر برا ہے، بہت برا ہے۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں۔ لبرل فیڈریشن کا جو سلسلہ اپریل ۱۹۳۳ء میں کلکتے میں ہوا اس میں سب سے ممتاز لبرل لیڈر سری نواس شاستری صاحب نے اس پر زور دیا کہ دستور اساسی کی تبدیلیاں خواہ کتنی ہی ناقابل اطمینان کیوں نہ ہوں ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم ان کو عمل میں لائیں۔ انھوں نے کہا "یہ اس کا وقت نہیں ہے کہ ہم چپ چاپ کھڑے رہیں اور کچھ نہ کریں۔" ان کے ذہن میں عمل کا صرف ایک ہی تصور تھا اور وہ یہ تھا کہ جو کچھ ملے اسے قبول کرلیں اور اس پر عمل درآمد کریں۔ ان کے خیال میں دوسری صورت یہی ہوسکتی تھی کہ کچھ نہ کیا جائے۔ آگے چل کر انھوں نے فرمایا "اگر ہم عقل، تجربہ، اعتدال رکھتے ہیں، اگر ہم ہیں خاموشی سے دوسروں پر

اثر ڈالنے کی صلاحیت، ان کی رائے بدلنے کی قوت اور حقیقی قابلیت ہے تو یہی موقع ہے جب ہمیں اپنی خدمات کا پورا پورا ثبوت دینا چاہیئے۔" بقول کلکتے کے اخبار اسٹیٹسمین کے یہ پرزور "دلکش الفاظ کا ایک طلسم تھا۔"

خطابت مسٹر شاستری کا حصہ ہے۔ سب خطیبوں کی طرح انھیں بھی عمدہ عمدہ الفاظ کو خوش الحانی سے ادا کرنے کا شوق ہے۔ مگر وہ اکثر اپنے جوش کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور جو الفاظ کا طلسم وہ باندھتے ہیں اس میں معنیٰ اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ نہ انھیں پتہ چلتا ہے اور نہ دوسروں کو۔ اگر ہم ان کے اس اپیل پر جو انھوں نے اپریل ۱۹۳۰ء میں، سول نافرمانی کے دوران میں، کلکتے میں کیا تھا، تنقیدی نظر ڈالیں تو فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ بنیادی اصول و مقاصد سے قطع نظر کرکے مجھے دو باتیں قابل غور معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ان کے خیال میں خواہ برطانوی حکومت ہمیں کتنا ہی ذلیل کرے، کچلے، لوٹے ہمیں اس کی اطاعت سے انحراف نہیں کرنا چاہیئے۔ کوئی ایسی حد نہیں مقرر کی جاسکتی جس کے آگے ہمیں نہ بڑھنا چاہیئے۔ کمزور سے کمزور مظلوم بھی ایک وقت تنگ آکر ظالم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر مسٹر شاستری کے مشورے کے مطابق ہندوستانیوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیئے گویا ان کے نزدیک برطانوی حکومت کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے (یہ لفظ یہاں موزوں نہیں مگر مجھے مجبوراً استعمال کرنا پڑا) یہ نوشتہ تقدیر ہے جو ہمیں چار و ناچار پورا کرنا ہے۔

یہ یاد رہے کہ وہ یہ مشورہ کسی خاص صورت حال کے متعلق نہیں دے رہے تھے۔ "دستور اساسی کی تبدیلیاں،" ابھی تک زیر غور تھیں اگرچہ لوگوں کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بہت ناقص ہوں گی۔ وہ یہ کہتے تو ایک بات بھی تھی کہ گو وھائٹ پیپر کی تجاویز ناقص ہیں لیکن میں تمام حالات کے لحاظ سے یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر وہ قانون کی شکل اختیار کرلیں تو ہمیں چار و ناچار ان پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں خواہ ان کا مشورہ اچھا

سمجھا جاتا یا برا مگر وہ واقعات کے مطابق ہوتا مگر شاستری صاحب تو اس سے کہیں آگے بڑھ گئے۔ ان کا ارشاد تھا کہ خواہ یہ تبدیلیاں کتنی ہی بری کیوں نہ ہوں ہمیں بہرحال قبول کر لینی چاہئیں۔ وہ اس معاملے میں جو قومی نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت رکھتا تھا اور برطانوی حکومت کو سیاہ و سفید کا اختیار دینے کو تیار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوئی شخص یا جماعت نامعلوم مستقبل کے متعلق دوسروں کے فیصلے کو پہلے سے قبول کر سکتی ہے۔ یہ تو تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ مطلق کوئی اصول یا اخلاقی اور سیاسی معیار نہ رکھتی ہو اور اس کا دین و ایمان یہی ہو کہ حاکم کے حکم پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت مصلحت کا تقاضا کیا تھا۔ وھائٹ پیپر صرف پہلا مرحلہ تھا اور ابھی ان تجویزوں کے قانون بننے میں بہت سے مرحلے باقی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کے نقطۂ نظر سے وھائٹ پیپر کی منزل بہت اہم تھی مگر بہرحال ابھی اسے بہت سی منزلوں سے گزرنا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اس دوران میں اس میں اچھی یا بری تبدیلیاں ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلیاں اس بات پر منحصر تھیں کہ برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ پر مختلف فریقوں کی طرف سے کس حد تک دباؤ پڑتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ حکومت اس کش مکش میں ہندوستانی لبرل پارٹی کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے ان تجاویز کو کچھ بہتر بنا دے یا کم سے کم بدتر بنانے سے باز رہے۔ مگر ابھی اصلاحات کے قبول کرنے یا رد کرنے کا سوال اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مسٹر شاستری نے زور شور سے یہ اعلان کر دیا اور حکومت پر ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی لبرل پارٹی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں اپنی طرف کھینچنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہ خود بخود کھچے چلے آتے تھے اور اگر حکومت انھیں دھکے دے کر نکالنا چاہتی تب بھی نہ نکلتے۔ جہاں تک میں اس معاملے پر خود لبرل پارٹی کے نقطۂ نظر سے غور کر سکتا ہوں مجھے یہی نظر آتا ہے کہ مسٹر شاستری کی کلکتے کی تقریر بالکل خلاف مصلحت اور لبرل جماعت کے مقاصد کے لیے مضر تھی۔

میں نے مسٹر شاستری کی پرانی تقریر پر یہ تفصیلی بحث اس وجہ سے نہیں کی کہ بجائے خود یہ تقریر یا لبرل فیڈریشن کا جلسہ کوئی اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ میں لبرل لیڈروں کی ذہنیت کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ لائق اور قابل قدر لوگ ہیں مگر انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے یہ طرز عمل کیوں اختیار کیا ہے۔ مسٹر شاستری کی اور تقریر کا بھی جو میں نے جیل میں پڑھی تھی، مجھ پر بہت اثر ہوا۔ جون ۳۳ء میں وہ پونا میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے جلسے میں صدر کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انھوں نے یہ دکھایا کہ اگر برطانوی عمل داری ہندوستان سے یکایک اٹھ جائے تو کس قدر خطرے پیدا ہو جائیں گے اور سیاسی تحریکیں باہمی نفرت اور ایک دوسرے پر جبر و تشدد کر کے کیا آفت برپا کر دیں گی۔ بقول ان کے برطانیہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ رواداری پر مبنی رہی ہے اس لئے اگر ہندوستان کی آئندہ نشو و نما برطانیہ کے اتحاد عمل سے ہو تو یہاں رواداری پیدا ہونے کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔ جیل میں ہونے کی وجہ سے میرے پاس اس تقریر کا ماخذ صرف اس کا وہ خلاصہ تھا جو کلکتے کے اسٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ اس پر اسٹیٹسمین نے یہ لکھا کہ "یہ بڑا دل خوش کن نظریہ ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر مونجے نے بھی حال میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں۔" اپنی تقریر کے آخر میں مسٹر شاستری نے اس کا ذکر کیا کہ روس، اٹلی اور جرمنی میں رعایا کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور ان پر وحشیانہ مظالم ہو رہے ہیں۔

اس کو پڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں مسٹر شاستری کا خیال برطانیہ کی انتہائی قدامت پرست جماعت سے کس قدر حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں میں کچھ جزوی اختلافات ضرور ہیں مگر بنیادی خیال ایک ہی ہے۔ اگر مسٹر ونسٹن چرچل بھی بالکل انھیں الفاظ میں تقریر کرتے تو کوئی بات ان کے اصول کے خلاف نہ ہوتی۔ مسٹر شاستری ہماری لبرل پارٹی کے ترقی پسند فریق سے

تعلق رکھتے ہیں اور اس کے سب سے قابل لیڈر رہیں۔

افسوس ہے کہ میں مسٹر شاستری کے تاریخی نظریے اور ان خیالات سے جو وہ ممالک عالم خصوصاً برطانیہ اور ہندوستان کے متعلق رکھتے ہیں مطلق اتفاق نہیں کرسکتا۔ غالباً انگریزوں کے سوا کوئی شخص بھی ان کی تائید نہ کرے گا بلکہ بعض روشن خیال انگریز بھی ان سے متفق نہ ہوں گے۔ شاستری صاحب میں یہ کمال ہے کہ وہ دنیا کو اور خود اپنے ملک کو برطانوی حکمرانوں کی متعصبانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر میں ان غیر معمولی واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو پچھلے اٹھارہ مہینے میں ہندوستان میں پیش آ چکے تھے اور عین اس تقریر کے وقت پیش آ رہے تھے۔ انھوں نے روس، اٹلی اور جرمنی کے مظالم بیان کر ڈالے مگر خود اپنے ملک کے خوفناک جبر تشدد اور ہر قسم کی قانونی آزادی کی پامالی کا نام تک نہ لیا۔ ممکن ہے کہ انھیں صوبہ سرحد کے ہولناک واقعات اور بنگال کے حالات (جنھیں بابو راجندر پرشاد نے حال میں کانگرس کے خطبۂ صدارت میں "قیامت بنگال" سے تعبیر کیا تھا) نہ معلوم ہوں، اس لئے کہ ان پر احتساب کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر کیا انھیں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ہندوستان سخت مصیبت میں ہے اور ان کے ہم قوم ایک زبردست دشمن سے شدید جنگ میں مصروف ہیں جس پر ان کی موت اور زندگی کا انحصار ہے؟ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملک کے بڑے بڑے علاقوں میں پولس کا راج ہے، مارشل لا کی سی حالت ہے، تعزیری ضابطوں کی گرم بازاری ہے، لوگ جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں؟ کیا انھیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس آزادی اور رواداری کے لئے وہ برطانیہ کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے اسے خود برطانیہ ہندوستان میں کچل رہا ہے؟

اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کانگرس سے متفق تھے یا نہیں تھے۔ انھیں اس کا پورا حق تھا کہ وہ کانگرس کی پالیسی پر تنقید کریں اور اسے برا کہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایک ہندوستانی، ایک محب آزادی، ایک ذی حس انسان کی حیثیت سے ان پر اپنے ملک کے

مردوں اور عورتوں کی حیرت انگیز بہادری اور قربانی کا کچھ اثر نہیں ہوا؟ کیا انھیں یہ دیکھ کر مطلق تکلیف نہیں ہوئی کہ ہمارے حکمراں ہندوستان کے دل پر آرے چلا رہے ہیں؟ کیا انھیں اس پر کوئی جوش نہیں آیا کہ بیسیوں ہزار آدمی ایک زبردست سلطنت کی قوت کے آگے جھکنے اور اپنی روح کو ہلاک کرنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے جسم روند ڈالے جائیں، ان کے گھر برباد ہو جائیں اور ان کے پیارے دنیا بھر کی تکلیفیں سہیں؟ ہم لوگ جیل میں اور جیل سے باہر صبر کا اظہار کرتے تھے، ہنستے تھے اور مسکراتے تھے مگر اکثر تبسم کے ساتھ ہماری آنکھوں میں آنسو جھلک آتے تھے اور کبھی کبھی ہمارا ہنسنا رونے سے مشابہ ہوتا تھا۔

ایک بہادر اور فراخ دل انگریز مسٹر وریر ایلوین نے ان تاثرات کا ذکر کیا ہے جو اس منظر سے ان کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۳۰ء کے متعلق لکھتے ہیں "ایک قوم کی قوم کو اپنی ذہنی غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے اور عزم و استقلال کی بلندی پر چڑھتے ہوئے دیکھنا ایک عجیب و غریب تجربہ تھا" اور ایک موقع پر "ستیاگرہ کی تحریک میں کانگرس کے اکثر والنٹیروں کا وہ حیرت انگیز انضباط جس کا ایک صوبے کے گورنر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے ...."

مسٹر سری نواس شاستری ایک فاضل اور زود حس آدمی ہیں، اور ان کے ہم وطن ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہوا اور انھیں اس تحریک میں اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی نہ تھی۔ ان سے یہ توقع تھی کہ ان کی آواز اس جبر و تشدد کے خلاف اٹھے گی جس کے ذریعے سے حکومت تمام قانونی حقوق کو پامال کر رہی تھی اور ہر قسم کی پبلک جد و جہد کو روک رہی تھی۔ یہ امید تھی کہ وہ اور ان کے رفیق خود مصیبت زدہ علاقوں (یعنی صوبہ سرحد اور بنگال) میں جائیں گے اس لئے نہیں کہ کانگرس یا سول نافرمانی کو مدد دیں بلکہ اس لئے کہ حکام اور پولیس کی زیادتیوں کا پردہ فاش کر کے انھیں روکیں۔ دوسرے ملکوں میں سیاسی اور مدنی آزادی کے حامی عموماً یہی کرتے ہیں مگر

بجائے اس کے کہ وہ عاملہ کے استبداد کو روکتے جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو کچل رہا تھا اور جس نے انھیں معمولی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا، یا کم سے کم حقیقت حال سے واقفیت حاصل کرتے، انھوں نے برطانوی قوم کو حمایت، آزادی اور رواداری کی سند دے دی، عین اس وقت جب یہ خوبیاں ہندوستان کی برطانوی حکومت میں نام کو بھی نہ تھیں۔ اپنی اخلاقی تائید سے انھوں نے حکومت کی ہمت افزائی کی اور اس کے استبداد کو تقویت پہنچائی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی نیت یہ نہ ہوگی اور انھیں اپنے طرز عمل کے نتائج کا اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کی تقریر کا یہی اثر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان کے یہ خیالات اور یہ عمل کیوں ہے؟

مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا سوا اس کے کہ لبرل پارٹی نے اپنے ہم وطنوں سے اور جدید خیالات سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ جو فرسودہ کتابیں انھوں نے پڑھی ہیں ان کی بدولت ہندوستانیوں کے حالات اور خیالات ان کی نظر سے چھپ گئے ہیں اور وہ خود پرستی میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم جیل میں گئے اور ہمارے جسم کال کوٹھری میں بند رہے مگر ہمارے ذہن قید سے آزاد، ہماری روحیں ہیبت اور دہشت سے بری رہیں۔ مگر انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ایک ذہنی قید خانہ بنا لیا جس میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں مگر نجات کی کوئی صورت نہیں پاتے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جیسی اب ہے ویسی ہی رہنی چاہیئے۔ مگر جب حالات بدلے، جیسا کہ اس بدلنے والی دنیا کا دستور ہے، تو ان کی بے پتوار کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ جسمانی اور ذہنی حیثیت سے بے بس ہو کر رہ گئے۔ نہ ان کا کوئی نصب العین رہا اور نہ اخلاقی معیار۔ ہم میں سے ہر شخص کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنی ہے یا خود قدم بڑھائے یا دھکے دے کر آگے بڑھایا جائے۔ اس حرکت پذیر دنیا میں کوئی ساکن نہیں رہ سکتا۔ ہمارے لبرل حرکت اور تغیر سے ڈرتے تھے

اس لئے وہ اس طوفان کو دیکھ کر جو چاروں طرف سے اُٹھ رہا تھا بدحواس ہو گئے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ موجوں کو چیر کر آگے بڑھیں اس لئے ڈبکیاں کھانے لگے اور جو تنکا سامنے آگیا اس کا سہارا ڈھونڈھنے لگے۔ ہندوستان کی سیاست میں ان کی حیثیت شیکسپیر کے ہملٹ کی سی ہو گئی ”جس کے چہرے پر فکر کی زردی چھائی رہتی تھی“ اور وہ شک، ہچکچاہٹ اور تذبذب کا شکار ہو کر رہ گئے۔

”زمانے کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ برا ہو تقدیر کی ستم ظریفی کا
جس نے مجھے اس کے سمیٹنے کے لئے پیدا کیا۔“

سرونٹ آف انڈیا نے، جو لبرل جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے، سول نافرمانی کے آخری دنوں میں کانگرس والوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ خود ہی جیل جاتے ہیں، اور پھر چاہتے ہیں کہ رہا کر دئے جائیں۔ وہ اس پر خفا تھا کہ کانگرس کی لے دے کے یہی ایک پالیسی رہ گئی ہے۔ اور لبرل جماعت کی پالیسی کیا تھی؟ برطانوی وزیروں کی خدمت میں ڈپوٹیشن بھیجنا اور دعائیں مانگتے رہنا کہ انگلستان میں حکومت بدل جائے۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ کانگرس کی پالیسی ان دنوں زیادہ تر یہی تھی کہ لوگ تعزیری ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے جیل جائیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوم ایک مدت تک لڑتے لڑتے پست ہو گئی تھی اور حکومت پر کچھ زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی۔ مگر یہ پالیسی اخلاقی اور عملی مصلحتوں پر مبنی تھی۔

کھلا ہوا استبداد، جو ان دنوں ہندوستان میں ہو رہا تھا، حکومت کو بہت مہنگا پڑتا تھا۔ خود اس کے لئے بھی یہ بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن آزمایش تھی، اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ پالیسی آخر میں اس کی قوت کی بنیادوں کو کمزور کر دے گی۔ اس سے نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ ساری دنیا کے سامنے اس کے طرزِ حکومت کا پردہ فاش ہو رہا تھا۔ وہ لسے بدرجہا بہتر سمجھتی تھی کہ اس کا آہنی پنجہ مخمل کے دستانے میں چھپا رہے۔ حکومت

کے لئے اس سے زیادہ ناگوار اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں کہ اسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو کسی حال میں بھی اس کی مرضی کے آگے سر نہ جھکائیں۔ اس لئے استبدادی قوانین کی خلاف ورزی کی متفرق اور منتشر کوششیں بھی فائدے سے خالی نہ تھیں۔ ان سے قوم کو تقویت پہنچتی تھی اور حکومت کی ہمت پست ہوتی تھی۔

اخلاقی مصلحت اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ تھورو کا مشہور مقولہ ہے "جب مرد اور عورتیں بے انصافی سے قید کی جا رہی ہوں تو ہر انصاف پسند مرد اور عورت کو قید خانے جانا چاہیئے۔" ممکن ہے کہ یہ مشورہ لبرل حضرات اور دوسرے بزرگوں کو پسند نہ آئے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں "اخلاقی زندگی" ناقابل برداشت ہے، جب کہ سول نافرمانی کے علاوہ یوں بھی ہمارے اکثر رفیق قید فرنگ میں گرفتار رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کا نظام ہمیں ہر وقت دباتا اور ذلیل کرتا رہتا ہے اور ہماری قوم کو لوٹتا رہتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں مشتبہ لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، ہر وقت ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہتی ہے، ہر لفظ جو ہماری زبان سے نکلتا ہے قلم بند کر لیا جاتا ہے کہ کہیں اس میں ہمہ گیر قانون بغاوت کی خلاف ورزی نہ ہو، ہمارے خطوط کھول لئے جاتے ہیں، اور ہمیں ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ عاملانہ حکم امتناعی، یا گرفتاری کا پروانہ نہ آ رہا ہو۔ ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں ـــ یا تو حکومت کی قوت کے آگے سر جھکا دیں، روحانی ذلت اختیار کر لیں، اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیں، اپنی اخلاقی دولت کو ادنےٰ اغراض کے بدلے بیچ ڈالیں یا مخالفت کریں اور اس کی سزا بھگتیں۔ کوئی شخص خوشی سے جیل جانا یا تکلیف اٹھانا نہیں چاہتا۔ مگر اکثر جیل جانا ذلت کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ بہ قول برنارڈ شا کے "زندگی کی حقیقی مصیبت یہ ہے کہ انسان مطلب پرستوں کے ہاتھوں میں ان اغراض کا آلۂ کار بن کر رہے جن کو وہ ادنیٰ اور ذلیل جانتا ہے۔ اور جتنی مصیبتیں ہیں وہ زیادہ سے زیادہ بدقسمتی اور تقدیری حوادث کا حکم رکھتی ہیں۔

یہی ایک چیز ہے جو شامت، غلامی اور دنیا کا دوزخ ہے۔"

(۴۹)

طویل سزا کا خاتمہ

میری رہائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ "نیک چلنی" کی بنا پر مجھے حسب معمول چھوٹ ملی تھی اس لئے میری دو سال کی سزا میں ۳½ مہینے کی تخفیف ہو گئی تھی۔ رہائی کی توقع نے میرے سکون قلب میں خلل ڈال دیا تھا یا یوں کہیے کہ وہ عام بے حسی جو جیل میں پیدا ہو جاتی ہے دور ہو گئی تھی۔ باہر نکل کر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا اور چونکہ اس کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لئے رہائی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر یہ ایک عارضی کیفیت تھی جو بہت جلد گذر گئی میرا مدتوں کا دبا ہوا جوش عمل اُبھر آیا اور میں بے چینی سے رہائی کا انتظار کرنے لگا۔

جولائی ۱۹۳۳ء کے آخر میں یہ دردناک خبر آئی کہ ج۔ م۔ سین گپتا کا یکایک انتقال ہو گیا۔ ہم دونوں نہ صرف کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں برسوں سے ساتھ ساتھ کام کرتے رہے تھے بلکہ میرے ان کے اس زمانے کے تعلقات تھے جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ وہیں پہلے پہل میری ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ جب میں وہاں داخل ہوا تو وہ سند حاصل کرکے فارغ ہو چکے تھے۔

سین گپتا کا انتقال نظر بندی کے دوران میں ہوا۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں جب وہ یورپ سے واپس آئے تو ابھی اُنھوں نے ساحل بمبئی پر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کر لئے گئے۔ اس وقت

سے وہ برابر قید یا نظر بند رہے اور ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ حکومت نے انھیں بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن مرض برابر بڑھتا گیا۔ ان کی آرتھی کے موقع پر کلکتہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ ہوا۔ اور بے شمار آدمیوں نے نذر عقیدت پیش کی۔ گویا مظلوم بنگال کے گھٹے ہوئے جذبات کو کم سے کم عارضی طور پر نکاس کا ایک راستہ مل گیا۔

غرض سین گپتا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ سوبھاس بوس بھی شاہی قیدی تھے اور ان کی صحت بھی مدتوں قید اور نظر بند رہنے سے خراب ہو گئی تھی خدا خدا کر کے حکومت نے انھیں علاج کی غرض سے یورپ جانے کی اجازت دی۔ ہمارے پرانے اور آزمودہ کار لیڈر وٹھل بھائی پٹیل بھی یورپ میں بیمار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے جیل کی مصیبتوں اور باہر کی پیہم مصروفیتوں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے سدھار گئے، یا اپنی صحت کھو بیٹھے۔ پھر کتنے ایسے تھے جنھیں اگرچہ بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن اس غیر طبعی زندگی کی وجہ سے ان کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا اور ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔

سین گپتا کی موت نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ سارا ملک خاموشی سے انتہائی مصیبتیں اٹھا رہا ہے مجھ پر افسردگی اور اداسی چھا گئی۔ اور میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کس لئے؟

صحت کے معاملے میں میں بڑا خوش قسمت ہوں اگرچہ کانگریس کے کام میں مجھے سخت محنت کرنا پڑی اور میں نے نہایت بے ترتیب زندگی گزاری لیکن میری صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میرے قوے خلقی طور پر بہت اچھے تھے دوسرے یہ کہ میں اپنے جسم کی بڑی نگہداشت

کرتا تھا۔ جس طرح میں بیماری اور کمزوری کو برا سمجھتا تھا اسی طرح موٹاپے کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس لیئے کافی ورزش، تازہ ہوا۔ اور سادہ غذا کے ذریعہ سے میں ان دونوں سے محفوظ رہا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اوسط طبقے کی بہت سی بیماریوں کی وجہ غلط قسم کی غذا ہے۔ اس میں چکنائی اور ثقیل اجزا بہت ہوتے ہیں اور مقدار میں بھی زیادہ ہوتی ہے (یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس اسراف کی مقدرت رکھتے ہیں) لاڈ کرنے والی ماں اپنے بچوں کو مٹھائیاں اور طرح طرح کی "چیزیں" ٹھونس ٹھونس کر کھلاتی ہے اور ابتدا سے سوء ہضمی کا بیج بو دیتی ہے جو پھر تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ بچوں پر بہت سے کپڑے بھی لاد دیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان آکر انگریزوں کی خوراک بھی بہت بڑھ جاتی ہے اگرچہ ان کی غذا میں چکنائی اور ثقیل چیزوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوتی غالباً اب وہ اپنے اجداد کے مقابلے میں کچھ سنبھل گئے ہیں جو بہت بڑی مقدار میں گرم اور ثقیل غذا کھایا کرتے تھے۔

میں کبھی غذا کی اصلاح کے وہم میں نہیں پڑا صرف ثقیل غذاؤں سے اور زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا رہا، قریب قریب تمام کشمیری برہمنوں کی طرح ہمارا خاندان بھی گوشت کھاتا تھا اس لیئے بچپن سے میں بھی گوشت کھاتا رہا اگرچہ مجھے اس کا شوق نہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے گوشت کھانا ترک کر دیا اور نباتی غذا کا پابند ہو گیا۔ چھ برس تک میں نے گوشت نہیں کھایا لیکن یورپ جا کر کھانے لگا۔ ہندوستان آکر پھر چھوڑ دیا اور اس وقت سے اب تک میں کم و بیش نباتی غذا کا پابند رہا ہوں گوشت مجھے موافق آتا ہے لیکن اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی ہے بلکہ کراہت معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں جیل خانے میں کئی مہینہ تک مجھے روزانہ حرارت رہا کی اس قسم کی خفیف علالتیں مجھے بہت ناگوار ہوتی تھیں کیونکہ مجھے اپنی صحت پر جو گھمنڈ تھا اسے صدمہ پہنچتا تھا، قوت حیات اور جوش عمل کا جو تصور میرے پیش نظر رہا کرتا تھا وہ اب قائم نہیں رہا اور ضعف اور انحطاط کا خیال مجھے ستانے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کے مجھے موت کا کچھ زیادہ خوف نہیں ہے لیکن دماغ اور جسم کا آہستہ آہستہ گھلنا بالکل دوسری چیز تھی۔ لیکن میرا وہم غلط ثابت ہوا، میری طبیعت سنبھل گئی اور میں نے اپنی صحت پر پھر قابو پا لیا۔ جاڑوں میں دیر تک "دھوپ کا غسل" کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا اور مجھے پھر تندرستی کا احساس ہونے لگا۔ جس زمانے میں میرے جیل کے ساتھی کوٹ پہنے اور شال اوڑھے سردی سے کانپتے رہتے تھے میں ننگا دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا اور سورج کی خوشگوار گرمی کا لطف اٹھاتا تھا۔ یہ چیز صرف جاڑے کے موسم اور وہ بھی شمالی ہند میں ممکن ہے کیونکہ اور جگہ تو بہت سخت دھوپ پڑتی ہے۔

ورزشوں میں شرش آسن میں مجھے خاص لطف آتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ سر کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں گونتھ کر ان سے گردن کو سہارا دیا جائے اور کہنیاں زمین پر ٹکی رہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ورزش جسمانی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ لیکن میں اس لئے اسے زیادہ پسند کرتا تھا کہ مجھ پر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا تھا۔ اس کرتب سے جو کسی قدر مضحک تھا، تفریح ہوتی تھی اور زندگی کی خفیف الحرکاتی سے طبیعت زیادہ مانوس ہو جاتی تھی۔

افسردگی اور اداسی کے دوروں میں جو جیل میں لازمی طور پر ہوتے

ہیں، صحت اور تندرستی کا یہ احساس بہت کام آتا تھا اور اسی کی بدولت میں جیل کے اندر اور جیل کے باہر، نت نئے حالات کے ساتھ نبھاتا رہا۔ مجھے بہت سے دھچکے پہنچے، جو اُس وقت نا قابل برداشت معلوم ہوتے تھے، لیکن مجھے خود حیرت ہے کہ میں خلاف توقع ان سے بہت جلد سنبھل گیا۔ میرے دل و دماغ کی صحت اور اعتدال کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نہ تو آج تک میرے سر میں درد ہوا، اور نہ کبھی بے خوابی کی شکایت ہوئی۔ تہذیب جدید کی ان عام بیماریوں سے اور ضعف بصارت سے بھی میں محفوظ رہا۔ اگرچہ میں کثرت سے لکھتا پڑھتا رہا ہوں اور وہ بھی بعض اوقات جیل کی دھندلی سی روشنی میں، مگر میری نظر اب تک کمزور نہیں ہوئی۔ پچھلے سال ایک امراض چشم کے ماہر کو اس پر سخت تعجب ہوا۔ آٹھ سال پہلے اُنھوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دو ایک سال کے اندر ہی تمہیں عینک کی ضرورت پڑ جائے گی۔ لیکن ان کی رائے غلط نکلی اور آج بھی میں بغیر عینک کے اچھی طرح سب کام کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان باتوں سے لوگ مجھے نہایت معتدل اور محتاط سمجھنے لگیں۔ اس لیے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے جو کسی وقت اعتدال اور احتیاط کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

ادھر میں جیل میں اپنی رہائی کا منتظر تھا اور ادھر ملک میں سول نافرمانی کی نئی صورت یعنی انفرادی نافرمانی شروع ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے خود اس کی ابتدا کی اور حکام کو پہلے سے اطلاع دینے کے بعد یکم اگست کو گجرات کے کسانوں کو سول نافرمانی کی تلقین کرنے کے ارادے سے روانہ ہوگئے۔ انھیں فوراً گرفتار کر کے ایک سال کی سزا کر دی گئی اور پھر یروادا جیل بھیج دیے گئے

مجھے ان کے دوبارہ جیل جانے سے خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ گاندھی جی نے اصرار کیا کہ مجھے جیل میں بھی ہریجن ادّھار کا کام کرنے کی وہی سہولتیں ملنی چاہئیں جو باہر حاصل تھیں۔ لیکن حکومت نے صاف انکار کر دیا۔ یکایک ہمیں اطلاع ملی کہ گاندھی جی نے پھر اس سلسلے میں برت شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو یہ بات عجیب و غریب معلوم ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لئے اتنا بڑا اقدم اٹھایا جائے۔ چاہے حکومت کے مقابلے میں ان کی دلیلیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں پھر بھی ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن ہم بالکل بے بس تھے۔ اور حیرت کے عالم میں حالات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد ان کی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی اس لئے وہ جیل سے اسپتال پہنچا دئے گئے لیکن یہاں بھی وہ قیدی کی حیثیت سے تھے اور حکومت انھیں ہریجن اُدّھار کے کام میں کوئی سہولتیں بہم پہنچانے کو تیار نہ تھی۔ پچھلے برتوں میں انھوں نے عزم حیات کو نہیں چھوڑا تھا مگر اب کی بار انھوں نے بالکل کندھا ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بس چند دن کے مہمان ہیں۔ انھوں نے سب کو الوداع کہا اور ان چند چیزوں کے متعلق جو اسپتال میں ان کے پاس تھیں وصیت بھی کر دی۔ ان میں سے بعض چیزیں نرسوں کو دیں۔ لیکن حکومت کب چاہتی تھی کہ ان کی موت کا الزام اس کے سر آئے اس لئے اسی روز شام کو یکایک وہ رہا کر دئے گئے۔ یہ رہائی عین وقت پر ہوئی۔ اگر ایک دن بھی دیر ہو جاتی تو بس کام تمام تھا۔ ان کی جان بچانے کا سہرا اصل میں سی۔ ایف۔ انڈریوز کے سر ہے جو گاندھی جی کے حکم کے خلاف ہندوستان بھاگے ہوئے آئے۔

اسی عرصہ میں میں ۲۳ اگست کو دہرہ دون جیل سے نینی جیل تبدیل

یا۔ کوئی ڈیڑھ برس دوسرے جیلوں میں رہنے کے بعد میں یہاں واپس آیا تھا، اسی وقت مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں سخت بیمار ہیں اور اسپتال پہنچا دی گئی ہیں۔ چونکہ ان کی حالت نازک تھی اس لئے میں ۳۰ اگست کو رہا کر دیا گیا۔ ویسے میری میعاد ۱۲ ستمبر کو ختم ہوتی تھی۔ غیر معمولی حالات کی وجہ سے صوبے کی حکومت نے میرے ساتھ ۱۳ دن کی اور رعایت کر دی۔

(۵۰)

گاندھی جی سے ملاقات

رہائی کے بعد میں سیدھا اپنی بیمار ماں کے پاس لکھنؤ گیا اور چند روز ان کے پاس رہا۔ میں بہت عرصے کے بعد جیل سے باہر نکلا تھا اس لئے اپنے ماحول سے بیگانگی سی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ صدمہ سا ہوا کہ دنیا رنگ بدلتی ہوئی بہت آگے بڑھ گئی تھی اور میں جیل میں پڑا سڑتا رہا۔ جیل سے باہر نکل کر سب پر یہی کیفیت گذرتی ہے۔ ہم باہر آکر دیکھتے ہیں کہ وہ ننھے بچے، لڑکے اور لڑکیاں جنھیں ہم بہت چھوٹا چھوڑ گئے تھے اب ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں۔ بہت سی شادیاں ولادتیں اور موتیں ہو چکی ہیں۔ دنیا محبت اور نفرت، کام اور کھیل، الم و راحت کے بہت سے منظر دیکھ چکی ہے۔ زندگی کی نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہو گئی ہیں بحث کے نئے نئے موضوع اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ غرض جو کچھ میں سنتا یا دیکھتا تھا اس میں میرے لئے حیرت کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی مجھے جہالت کے گڑھے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ کوئی خوشگوار خیال نہ تھا۔ یہ ممکن تھا کہ میں بہت جلد اپنے ماحول سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لیتا لیکن میں نے اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے خیال کیا کہ مجھے صرہ زجیل کے باہر رہنا ہے۔ اس کے بعد پھر وہیں جانا پڑے گا۔ اس لئے ول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کیوں کروں، جو مجھ سے بہت پائیں گی۔ سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں کم و چھائی ہوئی تھی

پبلک جد و جہد کو حکومت دبا رہی تھی۔ اور کبھی کبھی گرفتاریاں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت ہندوستان کی یہ خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔ یہ وہ منحوس خاموشی تھی جو خوفناک تشدد کے بعد چھا جاتی ہے۔ وہ خاموشی جو زبان حال سے بہت کچھ کہتی۔ لیکن تشدد کرنے والی حکومتیں اسے سن نہیں سکتیں۔ اس وقت ہندوستان اس ریاست کا مکمل نمونہ تھا جو محض پولیس کا کام کرتی ہو۔ پولیس کی ذہنیت حکومت کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرح کی مخالف آواز دبا دی جاتی تھی۔ خفیہ پولیس والوں، جاسوسوں اور مخبروں کا سارے ملک میں ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ عام طور پر لوگوں پر خوف و ہراس طاری تھا اور ساری فضا میں اخلاقی پستی کے آثار نمایاں تھے حکومت ہر طرح کی سیاسی جد و جہد کو فوراً دبا دیتی تھی خصوصاً دیہاتی علاقوں میں مختلف صوبوں کی حکومتیں اس کی کوشش کر رہی تھیں کہ میونسپلٹی اور لوکل بورڈ کی ملازمت سے کانگرس والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ ان کی نظر میں وہ شخص جو سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل ہو آیا تھا، میونسپل مدارس میں تعلیم دینے یا میونسپلٹی میں اور کوئی کام کرنے کی قطعاً اہلیت نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ میونسپلٹیوں پر بہت دباؤ ڈالا گیا اور انھیں دھمکی دی گئی کہ اگر کانگرس والوں کو برخاست نہ کیا تو سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ اس جبر اور زیادتی کی سب سے نمایاں مثال کلکتہ کارپوریشن میں دیکھنے میں آئی میرا خیال ہے کہ آخر میں حکومت بنگال نے ایسا قانون بنا دیا کہ جو شخص کسی سیاسی جرم میں سزایاب ہو چکا ہو وہ کارپوریشن میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔

جرمنی میں نا ڈتیاں کر رہے تھے، ہندوستان کے برطانوی
فسروں اور ان کے یر اس کا عجیب و غریب اثر پڑتا تھا۔ اسے وہ اپنے
عمل کے جواز میں ے تھے اور اپنی نیکی پر ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ
ازی تمھارے حا تمھاری کیا گت بنتی۔ نازیوں سے تشدد کے عجیب عجیب

طریقے ایجاد کئے تھے اور جبر کی حد کر دی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ ممکن ہے ان کی حکومت میں ہماری حالت اس سے بھی بدتر ہوتی لیکن میں اس کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گذشتہ پانچ سال میں خود ہندوستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ حکومت ہند اس نیک اصول کی قائل ہے کہ سیدھا ہاتھ جو کچھ کرے اُلٹے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونا چاہئے چنانچہ وہ غیر جانب دارانہ تحقیقات کی تجویزوں کو رد کر دیتی ہے۔ حالانکہ اس قسم کی تحقیقات میں ہمیشہ اسی کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام انگریز وحشیانہ مظالم سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نازیوں کی طرح کھلم کھلا "بہیمیت" پر فخر کریں اور اس کا وظیفہ پڑھیں۔ اگر وہ کبھی بہیمیت سے کام بھی لیتے ہیں تو انھیں خود اس پر شرم آتی ہے۔ لیکن چاہے جرمن ہوں یا انگریز، یا ہندوستانی، سبھی پر تہذیب کا ملمع اتنا ہلکا ہے کہ جذبات کی رگڑ سے فوراً اتر جاتا ہے اور پھر اندر سے وہ چیز نکل آتی ہے جسے دیکھ کر کراہت آتی ہے۔ جنگ عظیم نے انسانوں میں خوفناک بہیمیت پیدا کر دی۔ اس کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، یعنی صلح کے بعد بھی جرمنی کا بحری محاصرہ جاری رہا اور اشیائے خوردنی کے دستیاب نہ ہونے سے لوگوں کو فاقے کرنے پڑے۔ اس کے متعلق ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ "دنیا کی کسی قوم نے ایسا احمقانہ، خوفناک اور وحشیانہ ظلم نہ کیا ہوگا"۔ ہندوستان میں بھی ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۹ء کی یاد دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ جب کبھی کسی کے مفاد اور حقوق خطرے میں ہوتے ہیں تو پھر شرافت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ کا نام پروپگنڈا پڑ جاتا ہے بہیمیت کو "سائنٹفک تشدد" اور "امن وانصاف کا تحفظ" کہنے لگتے ہیں۔ اس میں افراد یا کسی خاص قوم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان حالات میں ہر شخص کا کم وبیش یہی طرز عمل ہوتا ہے۔ ہر محکوم ملک کی طرح

ہندوستان میں بھی ہمیشہ حکمراں قوت کی مخالفت کا ایک دبا ہوا جذبہ موجود رہتا ہے کبھی کبھی یہ بھڑک اٹھتا ہے اور خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اس مخالفت سے حکمراں قوم میں اچھی بری ہر طرح کی فوجی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ گذشتہ چند سال میں ہمیں ہندوستان میں ان فوجی صفات کا بہت اچھی طرح تجربہ ہوا۔ کیونکہ ہم حکومت کی جو مخالفت کر رہے تھے۔ وہ بہت قوی اور موثر ہوگئی تھی۔ لیکن ہندوستان کو تو ہمیشہ سے اس فوجی ذہنیت سے (جو حقیقی سپاہیانہ روح سے خالی ہے) سابقہ رہا ہے۔ یہ شہنشاہی کا لازمی نتیجہ ہے اور اس میں حاکم اور محکوم دونوں کی ذلت ہے۔ ہندوستانیوں کی ذلت تو کھلی ہوئی ہے لیکن انگریزوں کی ذلت اس قدر آسانی سے محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ جب نازک وقت آتا ہے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جس کے حصے میں بدقسمتی سے دونوں قسم کی ذلتیں آتی ہیں۔

جیل میں مجھے اتنی کافی فرصت تھی کہ میں نے اعلیٰ افسروں کی تقریریں، ان کے اسمبلی اور کونسلوں کے سوالات کے جواب اور حکومت کے اعلانات سب تفصیل سے پڑھے مجھے اندازہ ہوا کہ گذشتہ تین برس میں ان میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور یہ تبدیلی رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ان کا لہجہ زیادہ درشت اور تحکمانہ ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سرجنٹ میجر اپنے سپاہیوں کو حکم دے رہا ہو۔ اس کی ایک دلچسپ مثال وہ تقریر ہے جو مدناپور (بنگال) کے کمشنر نے نومبر یا دسمبر ۱۹۳۳ء میں کی تھی۔ یہ چنگیز خانی شان تمام سرکاری تقریروں میں یکساں پائی جاتی ہے غیر سرکاری یورپی خصوصاً بنگال میں سرکاری افسروں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تقریر اور عمل دونوں میں بالکل فاشستی ذہنیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

بہیمیت کی ایک دوسری مثال سندھ میں دیکھنے میں آئی۔ حال ہی میں

وہاں چند مجرموں کو منظر عام پر پھانسی دی گئی چونکہ سندھ میں جرائم بڑھ رہے تھے اس لئے افسروں نے یہ طے کیا کہ ان مجرموں کو سب کے سامنے پھانسی دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہ دہشتناک منظر دیکھنے کے لئے عام لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ سنا ہے کہ اس وقت ہزاروں آدمی جمع ہو گئے تھے۔

غرض رہائی کے بعد میں نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ ان کو میں نے کچھ خوشگوار نہیں پایا۔ میرے بہت سے ساتھی جیل میں تھے۔ اور گرفتاریاں ابھی جاری تھیں۔ تمام تعزیری ضابطے ابھی تک نافذ تھے۔ احتساب اخباروں کا گلا گھونٹ رہا تھا، اور اس نے ہماری خط و کتابت میں ابتری ڈال رکھی تھی۔ میرے ایک رفیق کار، رفیع احمد قدوائی، سنسر کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ ان کے خط روک لئے جاتے تھے، دیر سے ملتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے جس سے ان کے کاموں میں بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سنسر سے درخواست کریں کہ اپنا فرض ذرا معقولیت سے انجام دے لیکن مشکل یہ تھی کہ لکھیں کسے۔ کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ سنسر کون ہے۔ غالباً وہ کوئی خفیہ پولیس کا افسر ہوتا ہے جو پوشیدہ طور پر اپنی خدمت انجام دیتا ہے اور اس کا وجود اور کام تسلیم ہی نہیں کیا جاتا لیکن رفیع احمد نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ سنسر کے نام خط لکھا اور لفافے پر اپنا پتہ لکھ دیا۔ چنانچہ واقعی یہ خط منزل مقصود پر پہنچ گیا اور اس کے بعد سے رفیع احمد کے خطوں کے معاملے میں زیادہ احتیاط برتی جانے لگی۔

مجھے پھر جیل جانے کی آرزو نہ تھی کیونکہ اتنے دن قید رہتے رہتے میرا جی بھر گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس سے بچ نہیں سکتا بجز اس کے کہ سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا اور حکومت سے ٹکر ہونا ناگزیر تھا۔ وہ جب چاہتی حکم نامہ بھیج دیتی کہ فلاں کام کرو۔

یا فلاں کام نہ کرو۔ اور میری طبیعت اس قسم کی ہر کہ زبردستی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی سارے ملک میں ہندوستانیوں کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں اس معاملے میں بے بس تھا اور وسیع پیمانے پر کوئی جد و جہد کرنا میرے امکان سے باہر تھا۔ بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ خود نہ ڈر دوں اور دب کر اطاعت نہ کروں۔

جیل جانے سے پہلے مجھے کئی کام نبٹانے تھے۔ میری ماں بیمار تھیں اور سب سے پہلے مجھے ان کی خدمت کرنی تھی۔ انھیں رفتہ رفتہ صحت ہو رہی تھی مگر اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ تقریباً ایک سال تک وہ صاحب فراش رہیں۔ پھر میں گاندھی جی سے بھی ملنا چاہتا تھا جو پونا میں اپنے نئے برت کے ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر رہے تھے۔ مجھے ان سے ملے دو برس سے زیادہ ہو گئے تھے اس کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ اپنے صوبے کے زیادہ سے زیادہ رفیقوں سے ملوں اور نہ صرف ہندوستان کی سیاسی حالت بلکہ دنیا کی عام حالت اور ان خیالات کے متعلق گفتگو کروں جو میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اس وقت میرا خیال تھا کہ دنیا سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی تیزی کے ساتھ ہلاکت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اپنا قومی پروگرام بناتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

میرے خانگی معاملات بھی میری توجہ کے محتاج تھے۔ اب تک میں ان سے انتہائی بے پروائی برتتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد میں نے ان کے کاغذات بھی نہیں دیکھے تھے۔ ہم نے اپنے اخراجات بہت گھٹا دئے تھے مگر اب بھی وہ ہماری موجودہ حیثیت سے زیادہ تھے۔ تاہم جب تک ہم اپنے پرانے گھر میں رہتے ان کا اور گھٹانا مشکل تھا۔ موٹر اب ہمارے پاس نہیں تھی کیونکہ ہم اس کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت جب چاہے گی اس پر قبضہ کر لے گی

ایک طرف تو یہ مالی مشکلات درپیش تھیں اور دوسری طرف سینکڑوں خط آتے تھے جن میں لوگ مجھ سے مالی امداد طلب کرتے تھے (سنسر ان خطوں کو نہیں روکتا تھا) سارے ملک میں اور خصوصاً جنوبی ہند میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ میں بڑا مالدار آدمی ہوں۔

میری رہائی کے بعد ہی میری چھوٹی بہن کرشنا کی منگنی ہوگئی اور میں چاہتا تھا کہ جیل بھیجے جانے سے پہلے اس کی شادی کردوں۔ کرشنا خود بھی ایک سال کی سزا بھگتنے کے بعد ابھی چند مہینے ہوئے جیل سے آئی تھی۔

جوں ہی میری ماں کی طبیعت سنبھلی میں فوراً گاندھی جی سے ملنے کے لئے پونا روانہ ہوگیا۔ مجھے ان سے مل کر اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گو وہ ابھی تک کمزور تھے مگر ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی تھی۔ ہم دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ سیاست۔ معاشیات اور زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن میں ان کی اس شفقت کا ممنون ہوں کہ حتی الامکان انھوں نے میرے خیالات کی رعایت مدنظر رکھی۔ میری ان کی خط و کتابت میں (جو بعد میں شائع ہوگئی) بہت سے وسیع مسائل پر جن پر میں ان دنوں غور کر رہا تھا، بحث کی گئی تھی اور اگرچہ ان کا ذکر مبہم الفاظ میں تھا لیکن منشا، بالکل واضح تھا میں گاندھی جی کا یہ اعلان سن کر بہت خوش ہوا کہ مستقل حقوق کو منسوخ کردینا چاہئے۔ اگرچہ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہئے۔ چونکہ میرے نزدیک ان کے بعض طریقے مہذب اور معقول قسم کے جبر کے مترادف ہیں اس لئے میں دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔

مجھے پہلے کی طرح اب بھی ان سے یہ توقع تھی کہ اگرچہ وہ مبہم نظریوں پر غور کرنے کے مخالف ہیں لیکن واقعات کی منطق انھیں رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرے گی کہ بنیادی سماجی تبدیلی ناگزیر ہے۔ وہ بھی عجیب و غریب شخص ہیں ایک طرف وہ (بہ قول مسٹر ویریر

ایلون سے) قرون وسطیٰ کے کیتھولک اولیا کی طرح ہیں اور دوسری طرف وہ عملی رہنما ہیں اور ان کا ہاتھ ہمیشہ ہندوستانی کسانوں کی نبض پر رہتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وقت آنے پر وہ کدھر جھکیں گے۔ لیکن یقینی بات ہے کہ جدھر بھی وہ جھکیں گے وہی پلہ بھاری ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ ہمارے نزدیک غلط راستہ اختیار کریں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کھلا ہوا راستہ ہوگا۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنا سب سے بہتر ہے لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو پھر دوسری راہ اختیار کرنی پڑے گی۔

میرے خیال میں اس وقت تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہم اپنی قومی جدوجہد میں مصروف تھے اور اصولاً کانگریس کا پروگرام اب تک سول نافرمانی تھا اگرچہ وہ افراد تک محدود کر دی گئی تھی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمیں موجودہ صورت پر قناعت کرنی چاہئے اور اشتراکی خیالات عام لوگوں میں خصوصاً کانگریس کے ان کارکنوں میں جو سیاسیات میں کچھ دخل رکھتے ہیں پھیلانے چاہئیں تاکہ آئندہ جب کبھی ہماری پالیسی کے تعین کا موقع آئے تو ہم کافی پیش قدمی کے لئے تیار رہیں۔ اس وقت تو کانگریس خلاف قانون جماعت تھی اور حکومت برطانیہ اسے کچل ڈالنا چاہتی تھی اس لئے ہمیں اس کے حملے کی مدافعت کرنی تھی۔

گاندھی جی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود انھیں کیا کرنا چاہئے؟ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں تھے۔ اگر وہ جیل جاتے تو پھر ہریجن ادھار کی سہولتوں کا سوال درپیش ہوتا اور غالباً حکومت اپنی پہلی رائے سے نہ ہٹتی۔ اس لئے انھیں پھر برت رکھنا پڑتا۔ کیا یہ چکر اسی طرح چلتا رہے؟ وہ اس بلی چوہے کے کھیل کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر اب ان سہولتوں کے لئے میں نے برت رکھا تو چاہے میں رہا بھی کر دیا جاؤں برت جاری رہے گا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ وہ برت رکھ کر جان دیدیں گے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنی سزا کی باقی میعاد میں (جس میں ابھی ۱۰ ماہ ۱/۲ مہینے باقی تھے) جیل جانے کی کوشش نہ کریں صرف ہریجن ادھار کا کام کرتے رہیں، البتہ کانگریس کے کارکنوں سے ملتے رہیں اور جب ضرورت ہو انہیں مشورہ دیتے رہیں۔

تیسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ عارضی طور پر کانگریس سے کنارہ کش ہوجائیں اور سارا کام (بقول خود) "نئی پود" کے ہاتھ میں دے دیں۔

پہلی صورت کی ہم میں سے کوئی بھی تائید نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس میں بظاہر ان کی موت یقینی تھی۔ تیسری صورت اس وقت جب کہ کانگریس ہنوز خلاف قانون جماعت تھی بہت نامناسب تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا تو سول نافرمانی اور ہر قسم کی عملی جدوجہد فوراً ملتوی ہوجاتی اور آئینی کارروائی شروع ہوجاتی یا کانگریس بے یارو مددگار رہ جاتی اور حکومت اسے اور زیادہ کچل ڈالتی۔ اس کے علاوہ اس خلاف قانون ادارے پر جس کا نہ جلسہ ہوسکتا تھا اور نہ اس کی پالیسی پر بحث، کوئی جماعت قبضہ کیونکر کرتی۔ غرض پہلی اور تیسری شکل کو رد کرکے ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ دوسری شکل مناسب ہے۔ ہم میں اکثر کو یہ صورت بھی پسند نہیں تھی اور ہم جانتے تھے کہ سول نافرمانی کا رہا سہا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اگر لیڈر خود جنگ سے کنارہ کش ہوجائے تو پھر کیا توقع ہوسکتی تھی کہ کانگریسی کارکنوں میں ایسے باہمت لوگ زیادہ تعداد میں نکل آئیں گے جو اس آگ میں کودنا گوارا کریں گے لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس مضمون کا بیان شائع کردیا۔

گاندھی جی اور میں اس معاملے میں متفق تھے (اگرچہ ہمارے وجوہ مختلف تھے) کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اور چاہے کمزور حالت میں سہی لیکن اسے جاری رکھنا چاہیئے۔ اپنے لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اشتراکی اصولوں اور واقعات عالم کی طرف توجہ دلاؤں۔

واپسی پر میں چند روز بمبئی ٹھہرا۔ میری خوش قسمتی کہ اس زمانے میں اودے شنکر وہاں موجود تھے۔ اس لئے مجھے ان کا ناچ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جس سے میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ برسوں سے میں تھیٹر، موسیقی، سنیما، ناطق فلم، ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ وغیرہ سے محروم تھا کیونکہ میں عموماً جیل میں رہتا تھا اور جب تھوڑے عرصے کے لئے باہر آتا بھی تھا تو دوسرے مشاغل میں منہمک رہتا تھا۔ شاید ایک مرتبہ میں نے ناطق فلم دیکھا ہے اور سنیما کے بڑے بڑے ایکٹروں کے صرف نام ہی سنے ہیں۔ تھیٹر دیکھنے کو خاص طور پر میرا بہت دل چاہتا ہے اور میں بڑی حسرت کے ساتھ ان نئے نئے ناٹکوں کی خبریں پڑھا کرتا ہوں جو دوسرے ملکوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں تو اعلیٰ معیار کے ناٹک ہوتے ہی نہیں اس لئے جب میں جیل سے باہر بھی ہوتا تب بھی اچھے ناٹک دیکھنے کا موقع نہ ملتا میرا خیال ہے کہ بنگالی۔ مرہٹی اور گجراتی ناٹک نے خاصی ترقی کر لی ہے لیکن ہندوستانی زبان کا تھیٹر ابھی بہت پیچھے ہے مجھے تازہ ترین حالات تو معلوم نہیں لیکن پہلے تو ہندوستانی کے ناٹک بڑے بھدے اور بھونڈے ہوتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ ناطق اور خاموش دونوں قسم کے ہندوستانی فلم فنی لطافتوں سے کورے ہوتے عموماً ہلکی قسم کے غنائی یا جذبات پرستانہ فلم دکھائے جاتے ہیں اور ان کا قصہ عموماً ہندوستان کی قدیم تاریخ یا دیومالا سے ماخوذ ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان میں وہ چیز پیش کی جاتی ہے جو شہر والے پسند کرتے ہیں۔ ان بھدے اور پرتکلف تماشوں سے گاؤں والوں کے گیت اور ناچ بلکہ پرانے سوانگ بھی جو کہیں کہیں اب تک باقی ہیں بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔ بنگال، گجرات اور جنوبی ہند میں کبھی کبھی اچانک یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ گاؤں والے غیر شعوری طور پر کتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ اوسط طبقے کے لوگوں میں یہ

بات نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی جڑوں سے الگ ہوگئے ہیں اور فنی روایات سے بالکل کورے ہیں۔ وہ ان ادنیٰ قسم کی نامعقول تصویروں سے لطف اٹھاتے ہیں جو جرمنی اور اسٹریلیا میں ڈھیروں چھپتی ہیں، ان کی زیادہ سے زیادہ پرواز روی ورما کی تصویروں تک ہے۔ ہارمونیم ان کا محبوب ساز ہے۔ (میں اسی امید میں بسر کرتا ہوں کہ سوراج کی حکومت پہلا کام یہی کرے گی کہ اس نامعقول باجے کی ممانعت کر دے) لیکن شاید است تکلیف دہ بے تکے پن اور بدمذاقی کی انتہا لکھنو یا دوسری جگہ کے بڑے بڑے تعلقہ داروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کے پاس خرچ کرنے کو روپیہ ہے اور انھیں نمود ونمائش کا شوق ہے۔ وہ دل کھول کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی ان کے یہاں جائے اُسے بے تکلیف دہ منظر دیکھنے پڑتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے سے ٹیگور کے نامور خاندان کی سرکردگی میں آرٹ کے صحیح مذاق کو بیدار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کا اثر سارے ملک میں صاف نظر آرہا ہے لیکن جس ملک کے لوگ ہر قدم پر دبائے اور کچلے جارہے ہوں اور دہشت کی فضا میں زندگی بسر کرتے ہوں وہاں کوئی آرٹ کیسے پنپ سکتا ہے۔

بمبئی میں، میں بہت سے دوستوں اور ساتھیوں سے ملا جن میں سے بعض ابھی قید سے چھوٹ کر آئے تھے۔ وہاں اشتراکیت کا عنصر قوی ہے اس لئے کانگریس کے اونچے حلقے میں جو تازہ ترین واقعات ہوئے تھے ان پر وہاں بہت کچھ ناراضگی کا اظہار کیا جارہا تھا۔ گاندھی جی پر سخت نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ وہ سیاست کو الٰہیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں مجھے بہت سے اعتراضوں سے اتفاق تھا لیکن یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ کہ ہم اسی طرح کام چلنے دیں۔ سول نافرمانی ملتوی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ

حکومت کا تشدد بدستور جاری رہتا اور اگر کوئی مؤثر جد و جہد کیجاتی تو پھر وہی جیل کی منزل سامنے تھی۔ ہماری قومی تحریک اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ یا تو حکومت اسے دبا تی ورنہ خود حکومت کو اس کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا یعنی وہ اتنی قوی ہوگئی تھی کہ ہر حال میں اس کا خلاف قانون قرار دیا جانا لازمی تھا۔ اور اگر سول نافرمانی ملتوی بھی کردی جاتی تب بھی تحریک کا پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا۔ غرض سول نافرمانی کے جاری رہنے یا نہ رہنے سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اصولاً یہ حکومت کے مقابلے کے لیے ایک اخلاقی حربے کی حیثیت رکھتی تھی اور اس لحاظ سے قابل قدر تھی۔ جنگ کے زمانے میں نئے خیالات کی اشاعت کرنا آسان تھا بمقابلہ اس زمانے کے جب کہ جنگ عارضی طور پر روک دی گئی ہو اور سستی کا دور شروع ہو گیا ہو۔ جنگ کے علاوہ دوسری صورت یہی تھی کہ حکومت سے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے اور کونسلوں میں آئینی جد و جہد شروع کی جائے۔

معاملہ بہت پیچیدہ تھا اور دونوں صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کی ذہنی کش مکش کو خوب سمجھتا تھا کیونکہ مجھے خود اس سے سابقہ پڑچکا تھا لیکن بمبئی میں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی میں نے یہ دیکھا ہے کہ بعض لوگ جو کچھ کرنا نہیں چاہتے اشتراکی اصولوں کی آڑ لیتے ہیں یہ دیکھ کر غصہ آتا تھا کہ یہ لوگ خود تو کچھ کرتے نہیں اور دوسروں کو جنھوں نے جنگ کی مصیبتیں جھیلیں، رجعت پسند کہتے ہیں۔ یہ شیر قالین اشتراکی سب سے زیادہ گاندھی جی کے مخالف ہیں اور انھیں رجعت پسندوں کا قبلہ گاہ کہتے ہیں۔ ان کی دلیلیں منطق کے لحاظ سے تو بالکل درست ہیں لیکن وہ ایک چھوٹی سی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ "رجعت پسند" ہندوستان کو جانتا ہے، سمجھتا ہے، بلکہ بذات خود ہندوستان کے کسانوں کا مجسمہ ہے اور اس نے سارے ملک کو

ہلا کر رکھ دیا جو آج تک کسی نام نہاد انقلابی سے نہ ہو سکا۔ اس کی نئی ہریجن ادھار کی سرگرمیوں نے بھی بڑی نرمی سے، مگر اس زبردست قوت کے ساتھ جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا، کٹر ہندو دھرم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ کٹر سنیتیوں کی ساری جماعت اس کی مخالف ہو گئی ہے اور اسے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتی ہے حالانکہ وہ ہمیشہ ان سے بڑی نرمی اور شرافت سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بے اندازہ قوتوں کا خزانہ کھول دیتا ہے۔ جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی موجوں کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں اور کروڑوں آدمیوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔
وہ رجعت پسند ہو یا انقلابی مگر اسی کی ذات تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا ایک پست اور دبو قوم کو عزم و وقار بخشا، عام لوگوں میں بیداری اور قوت پیدا کر دی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔ پر امن عدم تعاون یا سول نافرمانی کے مقصد اور فلسفیانہ نتائج سے قطع نظر اس کا طریق کار ایک عجیب و غریب قوی اور مؤثر حربہ ہے جو اس شخص نے ہندوستان کے اور ساری دنیا کے ہاتھوں میں دے دیا ہے اور ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے حالات کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایمانداری کے ساتھ جو نکتہ چینی کی جائے ہمیں اس کی قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کو موقع دینا چاہئے کہ وہ ہمارے معاملات پر دل کھول کر بحث کریں۔ یہ بات ضرور قابل افسوس ہے کہ گاندھی جی کے اقتدار نے ایک حد تک بحث مباحثے میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ لوگ ہر معاملے میں ان کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور ہر بات کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ طریقہ صریحی طور پر غلط ہے۔ قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب وہ مقصد اور طریق کار کو سمجھ بوجھ کر قبول کرے اور اس کا عمل اور انضباط کورانہ اطاعت پر نہیں

بلکہ فرض شناسی پر مبنی ہو۔ کوئی شخصیت بھی خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو تنقید سے بالاتر نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن اگر تنقید اپنی بے عملی کو چھپانے کے لئے کی جائے تو وہ یقیناً ناجائز ہے۔ اشتراکی اگر اس قسم کی حرکتیں کریں گے تو وہ بدنام ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوگ تو ہر شخص کو عمل کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ لینن نے لکھا ہے "جو شخص مستقبل کے سہل کاموں کے خواب دیکھتا ہے اور حال کے مشکل کاموں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا وہ ابن الوقت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے عمل کی بنا ان واقعات پر نہیں رکھتا جو اس وقت حقیقی زندگی میں پیش آ رہے ہیں بلکہ اس سے بچنے کے لئے خواب وخیال کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔"

ہندوستان کے اشتراکیوں اور اشتمالیوں کا ذہنی سرمایہ لے دے کر وہ کتابیں ہیں جو صنعتی مزدوروں کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ بعض مخصوص علاقوں مثلاً بمبئی یا کلکتے کے قرب وجوار میں کارخانہ کے مزدوروں کی کثرت ہے مگر اصل میں ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اس لئے ہمارے مسائل صنعتی مزدوروں کے نقطۂ نظر سے نہ پوری طرح سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں قوم پرستی اور دیہی معیشت دو زبردست عنصر ہیں اور یورپی اشتراکیت ان سے بہت کم بحث کرتی ہے۔ روس کی جنگ سے پہلے کے حالات ہندوستان سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ لیکن وہاں غیر معمولی حادثات پیش آئے اور یہ توقع رکھنا کہ دوسری جگہ بھی ایسا ہی ہو گا حماقت ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اشتمالیت کا فلسفہ ہمیں ہر ملک کے موجودہ حالات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور آئندہ کے لئے ترقی کی راہ بھی دکھاتا ہے۔ لیکن یہ اس فلسفے کے ساتھ بڑی زبردستی اور بے انصافی ہو گی کہ حالات اور واقعات کا لحاظ کئے بغیر آنکھ بند کر کے اس سے کام لیا جائے۔

بہر حال زندگی بڑی پیچیدہ چیز ہے اور اس کے اختلاف اور تضاد کو دیکھ کر بعض اوقات انسان ہمت ہارنے لگتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں میں اختلاف رائے ہو بلکہ ایک ہی جماعت کے لوگ جو اکثر مسائل کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں مختلف نتیجوں پر پہنچیں لیکن وہ شخص جو اپنی کمزوری کو رعب دار فقروں اور شاندار اصولوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرے شبہ سے کیسے بچ سکتا ہے۔ جو لوگ استعفیٰ نامے لکھ کر یا حکومت سے وعدے کرکے، یا اور مشتبہ طریقوں سے خود جیل سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتے ہیں اس مقصد کو نقصان پہنچاتے ہیں جس کے وہ علمبردار بنتے ہیں۔

بمبئی ایک بہت بڑا آفاقی شہر ہے اور اس میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں لیکن وہاں کے ایک ممتاز بزرگ اپنی سیاسی۔ معاشی۔ سماجی اور مذہبی خیالات کے اعتبار سے عجیب معجون مرکب واقع ہوئے ہیں۔ مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت سے تو وہ اشتراکی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہندو سبھا کے ہیٹھو بھی ہیں۔ اور اس سے انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ قدیم مذہبی اور سماجی رسم ورواج کی حفاظت کریں گے اور مجلس واضع قوانین کو ان میں مداخلت کرنے سے باز رکھیں گے۔ انتخاب کے موقع پر وہ سناتنی طبقے کے نمائندے بن گئے جو قدیم رسوم کے مندر کا پجاری ہے۔ جب یہ پیچ رنگی اور دلچسپ زندگی بھی کافی نہ ہوئی تو انھوں نے اپنی فالتو قوت کو کانگریس پر نکتہ چینی کرنے اور گاندھی جی کو رجعت پسند کہہ کر بدنام کرنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد چند اور شخصوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ڈیموکریٹک کانگریس پارٹی قائم کی جسے حقیقت میں جمہوریت سے دور کا رشتہ بھی نہ تھا اور کانگریس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ یہ اس پر حملے کیا کرتی تھی۔ اب انھیں اپنی تگ و تاز کے لئے نئے میدانوں کی تلاش

ہوئی۔ چنانچہ وہ مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے جنیوا کی لیبر کانفرنس میں جا پہنچے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی حکومت کے وزیر اعظم بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔
جو انگلستان میں "قومی حکومت" کہلاتی ہے۔

اس قسم کے رنگ برنگے خیالات اور سرگرمیاں بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ پھر بھی کانگریس کے معترضین میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو مختلف میدانوں میں گھوڑے دوڑا چکے تھے اور اب بھی ہر طرح کی تحریکوں میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے آپ کو اشتراکی بھی کہتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اشتراکیت بدنام ہوتی ہے۔

(۵۱)

لبرل ذہنیت

جب میں گاندھی جی سے ملنے پونا گیا تو ایک روز ان کے ساتھ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں بھی گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک سوسائٹی کے بعض اراکین ان سے سیاسی مسائل پر سوالات پوچھتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں نہ سری نواس شاستری صاحب تھے جو اس سوسائٹی کے صدر ہیں اور نہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جو صدر کے بعد اس انجمن کے سب سے لایق رکن ہیں مگر بعض پرانے اراکین موجود تھے۔ ہمارے خیال کے تھوڑے سے آدمی جو اس گفتگو کو سن رہے تھے ان کی حیرت ہر بات کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی اس لئے کہ سوالات اس وقت کے نہایت ادنیٰ واقعات کے متعلق تھے اور ان کا موضوع بیشتر وہ درخواست تھی جو گاندھی جی نے بہت دنوں پہلے وائسرائے سے ملاقات کے لئے کی تھی اور جسے وائسرائے نے منظور نہیں کیا تھا۔ کیا بس یہی ایک اہم سوال رہ گیا تھا جو ان لوگوں کے ذہن میں آسکتا تھا جبکہ دنیا میں جدھر دیکھئے اہم سے اہم مسائل درپیش تھے؟ جب ان کا اپنا ملک آزادی کے لئے ایک ہمت آزما جنگ میں جٹا ہوا تھا اور سینکڑوں ادارے خلاف قانون قرار دیئے جاچکے تھے؟ اس وقت کاشتکاروں کے مسئلہ کی حالت نازک ہوگئی تھی صنعتی کساد بازاری کے سبب سے ہر طرف بے روزگاری پھیل رہی تھی۔ بنگال اور سرحد پر جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خیال کرکے کلیجہ دھڑکنے لگتا تھا خیالات

کی، تقریر کی، تحریر کی اور اجتماع کی آزادی کا سر کچلا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کیا جانے کتنے قومی اور بین الاقوامی مسائل تھے۔ مگر لبرل حضرات نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق سوالات کر رہے تھے۔ اور جاننا چاہتے تھے کہ اگر گاندھی جی نے پہل کی تو اس کا وائسرائے اور حکومت ہند پر کیا اثر ہوگا
مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں ایک خانقاہ میں پہنچ گیا ہوں جس کے رہنے والوں کا مدتیں گذریں کہ بیرونی دنیا سے کوئی ربط ضبط ہی نہیں رہا ہے اور یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ لطف یہ کہ ہمارے یہ دوست عملی سیاسیات میں حصہ لے رہے تھے، ہوشیار لوگ تھے اور ان کی قومی خدمت اور ایثار کی کارگذاریاں بھی کچھ کم نہ تھی۔ یہ اور ان کے چند ساتھی لبرل پارٹی کی روح رواں تھے باقی پارٹی ایک مبہم اور بے شکل سی جماعت تھی جسکے رکن کبھی کبھی بس اس احساس کا لطف اٹھانا چاہتے تھے کہ ہم بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصاً بمبئی اور مدراس والے تو ایسے تھے کہ ان میں اور سرکاری ملازموں میں بس نام کا فرق تھا۔

کسی ملک کے لوگ جس طرح کے سوالات کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی نشو ونما کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ اکثر ان کی ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں پوچھتے جو اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری سیاسی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم پر اپنا وقت اور اپنی قوت ضایع کرتے ہیں اور جی برا کیا کرتے ہیں یا فرقہ وارانہ فیصلہ کی مخالفت یا موافقت میں پارٹیاں بناتے ہیں اور ان مسائل کو نظر انداز کرکے جن پر ہماری زندگی اور موت کا دار و مدار ہے اس کے متعلق لاحاصل بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ سوالات جو اس روز سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی

کے مرکز میں پوچھے گئے اس سوسائٹی اور لبرل پارٹی کی عجیب دماغی حالت کا آئینہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے کوئی سیاسی یا معاشی عقاید ہی نہیں ہیں ان کی نظر میں وسعت نہیں ان کی سیاست بس اسی قسم کی ہے جس کا ڈرائنگ روم یا دربار میں چرچا رہتا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں بڑے عہدہ دار کیا کریں گے اور کیا نہ کریں گے؟

لبرل پارٹی کا نام غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے، اور جگہ خصوصاً انگلستان میں اس جماعت کی ایک خاص معاشی سیاست تھی یعنی آزاد تجارت اور کاروبار کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا اصول اور شخصی آزادی اور شہری حقوق کا ایک خاص فلسفہ۔ انگلستان کی لبرل پارٹی کی تعلیم اور عقاید کی بنیاد معاشیات پر تھی اور تجارتی آزادی حاصل کرنے اور شاہی اجاروں اور بے ضابطہ محصولوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش نے سیاسی آزادی کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔ ہندوستان کی لبرل پارٹی کے عقاید ایسا کوئی پس منظر نہیں رکھتے۔ ہندوستانی لبرل آزاد تجارت کے قائل نہیں حال کے واقعات نے اچھی طرح روشن کر دیا ہے کہ وہ سیاسی آزادی اور شہری حقوق کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ دیسی ریاستوں میں قریب قریب منصب داری نظام رائج ہے، ان کی حکومت مطلق العنانی پر مبنی ہے، اور وہاں جمہوریت اور شخصی آزادی کا ابھی تک ذکر بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ لبرل ان سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور عموماً ان کی حمایت کرتے ہیں یہ بھی ایک صفت ہے جو انھیں یورپ کے لبرلوں سے ایک جدا قسم بنا دیتی ہے۔ لبرل کے معنی ہیں حریت پسند۔ بہر حال اس لفظ کے جو معنی بھی لیجئے ہندوستانی لبرل حریت پسند نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حریت پسندی ان کے کہیں نہیں چھو گئی ہے

یہ ٹھیک ٹھیک بتانا کہ وہ چاہتے کیا ہیں بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ ان کے خیالات کی کوئی مضبوط اثباتی بنیاد نہیں اور اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ پھر بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ ان کی طاقت صرف نفی میں ہے۔ انھیں ہر طرف غلطیاں ہی دکھائی دیتی ہیں، وہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اس طرح حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔ سچ پوچھئے تو ان کے لئے حقیقت ہمیشہ دو انتہائی مسلکوں کے بیچ میں کہیں پر ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز جس میں انھیں انتہا پسندی نظر آتی ہے اعتراض کرتے ہیں، اور اس طرح وہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ ہم نیک۔ اعتدال پسند اور اچھے ہیں۔ یہ طرز عمل انھیں غور و فکر کے تکلیف دہ اور دشوار سلسلوں میں الجھنے سے بچائے رہتا ہے، اور وہ اس پر بھی مجبور نہیں ہوتے کہ اپنی طرف سے کوئی تعمیری خیال پیش کریں۔ بعض کو ایک طرح سے خیال ہوتا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی ہے، اور اب مصیبت میں پڑی ہے لیکن دوسری طرف ان کے نزدیک یہ بات بھی کھلی ہوئی ہے کہ اشتراکیت بُری چیز ہے، اس لئے کہ وہ مستقل حقوق اور اغراض پر حملہ کرتی ہے۔ ممکن ہے آگے چلکر کوئی پراسرار تدبیر سمجھ میں آجائے کوئی بیچ کی منزل! اس لئے اس درمیان میں تو مستقل شخصی حقوق املاک وغیرہ کا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اگر کبھی یہ بحث چھڑے کہ دنیا گول ہے، تو غالباً یہ لوگ ان دونوں خیالات کو جن سے انتہا پسندی ظاہر ہوتی ہے رد کرکے کام چلانے کے لئے یہ کہدیں کہ وہ شاید چوکور یا بیضاوی ہو۔

یہ لوگ فضول اور غیر اہم باتوں پر خاصے برانگیختہ ہو جاتے ہیں، اور ایسی چیخ و پکار مچاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جان بوجھ کر اور اس لئے بھی کہ یہ خصوصیت ان کے شعور کی تہ میں بیٹھ گئی ہے وہ بنیادی مسائل سے پہلو

بچاتے ہیں کیوں کہ ایسے مسائل بنیادی اصلاح اور مردانہ مصلحت اندیشی اور عمل کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لیے لبرلوں کی ہار جیت دونوں یکساں بے اثر ہوتی ہے۔ ان کا کسی اصول سے تعلق نہیں ہوتا۔ گویا اس پارٹی کی سب سے بڑی خصوصیت (اور اگر ایسے ہیولے میں یہ بات ممکن ہو تو اس کی خاص علامت) ہر بری اور اچھی چیز میں اعتدال ہے۔ یہ ایک فلسفہ حیات ہے اور اس پارٹی کا پرانا نام یعنی موڈریٹ ہی شاید اس کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھا

میں میانہ روی اپنی خاص شان سمجھتا ہوں،
وِگ مجھے ٹوری سمجھتے ہیں اور ٹوری وِگ خیال کرتے ہیں(۱)
(الیکسینڈر پوپ)

لیکن میانہ روی چاہے جتنی قابل تعریف چیز ہو، وہ ایک روشن یا درخشاں صفت نہیں ہے۔ وہ مزاج میں خشکی پیدا کرتی ہے، اور اس طرح بدقسمتی سے ہندوستانی لبرل رونی صورت والوں کی فوج بن گئے ہیں، ان کے چہرے افسردہ اور روکھے، ان کی تحریر اور بات چیت بے رس ہوتی ہے اور وہ زندہ دلی سے بالکل ناآشنا ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سبھی ایسے نہیں، اور ان لوگوں میں جنھیں مستثنیٰ کرنا ضروری ہے سر تیج بہادر سپرو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ شخصی طور پر سر تیج بہادر ہرگز غیر دلچسپ آدمی نہیں ہیں، ان میں ظرافت کی کمی نہیں اور خود ان پر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو اس کا بھی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر لبرل جماعت کا فلسفہ تن پروری اور دولت پرستی کے ٹھس پن اور ٹھوس پن کا معراج ہے۔ الٰہ آباد کے اخبار "لیڈر" نے جو لبرل اخبار ہے

---

(۱) وِگ انگلستان کی پرانی حریت پسند اور ٹوری قدامت پسند پارٹی کا نام تھا۔

میں سب سے ممتاز ہے، پارسال ایک ایڈیٹوریل لکھا تھا جس سے اصل صورت حال خوب ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ بڑے اور غیر معمولی صفات کے لوگ ہمیشہ دنیا کے سر بلائیں لائے ہیں، اور اس لئے معمولی اوسط قابلیت کے آدمیوں کو ان پر ترجیح دینا چاہیئے۔ کس دیدہ دلیری سے یہاں کند ذہنی اور سست روی کا جھنڈا لہرایا گیا ہے!

میانہ روی، قدامت پسندی، خطرے اور اچانک تبدیلی سے بچنے کی خواہش ایسی خصوصیتیں ہیں جو بڑھاپے کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، اور اکثر کے لئے ان میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے۔ نوجوانوں میں ان کا ہونا اتنا مناسب نہیں لیکن ہمارا ملک پرانا ہے، اور کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بچے تک تھکے ماندے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر پھیکا پن اور بڑھاپے کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن اس پرانے ملک کو بھی وہ قوتیں جو زندگی کو بدلتی ہیں متھے دے رہی ہیں، اور میانہ روی کا فلسفہ حیات درہم برہم ہو گیا ہے۔ پرانی دنیا دم توڑ رہی ہے، اور لبرل لوگوں کی ساری میٹھی میٹھی معقول پسندی سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، طوفان، سیلاب اور زلزلے کسی کی دلیلیں نہیں سنتے۔ لبرلوں نے اب تک جن تصورات پر اپنے عقیدے اور عمل کو مبنی کیا تھا وہ سب جواب دے رہے ہیں، اور ان میں اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ڈاکٹر اے۔ ان۔ وائٹ ہیڈ یورپ کی تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "ان تمام روایات کو اس مضر فرضیے نے ناقص کر دیا ہے کہ ہر نسل کم و بیش اسی ماحول میں اپنی زندگی گذارے گی جس میں کہ پچھلی نسلوں نے گذاری تھی، اور اس ماحول کو اسی قوت تشکیل کے ساتھ اپنی اولاد کی زندگی پرانے سانچے میں ڈھالنے کے لئے چھوڑ جائے گی

ہم انسانی تاریخ کے اس دور میں رہتے ہیں جب کہ پہلی بار یہ فرضیہ غلط ثابت ہوا ہے۔" ڈاکٹر وائٹ ہیڈ نے اپنی تشریح میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیا ہے، اس لئے کہ یہ فرضیہ ایک ہمارے زمانہ کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ غلط رہا ہے۔ اگر یورپی روایات میں قدامت پسندی ہے، تو ہماری روایات میں قدامت پسندی سے بھی اور کچھ زیادہ ہے۔ لیکن جب تغیرات کا وقت آتا ہے تو زندگی کی تشکیلی قوتیں ان روایات کا ذرا بھی خیال نہیں کرتی ہیں۔ ہم بے بس کھڑے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے منصوبوں کی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں۔ اور یہ کیفیت، کہ مسٹر جیرلڈ ہرڈ نے دکھایا ہے، "خود فریبی کی سب سے تباہ کن صورت ہے، یہ اس تصور کو ذہن میں قائم کر دیتی ہے کہ ہماری تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو یہ ہماری تدبیروں کا قصور نہیں بلکہ کسی دوسرے کا جان بوجھ کر ہمارے کام کو بگاڑنے کا نتیجہ ہے۔"

ہم سب اس افسوسناک خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے بالکل بچے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کی حقیقتوں سے غافل نہ ہو جائیں، ہمارے تجربے اور ہماری غلطیاں کبھی کبھی اس خود فریبی کے زور کو کم کر دیتی ہیں اور ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن لبرلوں میں یہ مرض ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید ہے۔ وہ غلطی کرنے کے ڈر سے کچھ کرتے ہی نہیں، گرنے کے ڈر سے جگہ ہی سے نہیں ہلتے، عوام کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کرتے جو دماغ اور حوصلے کی درستی کے لئے ضروری ہیں، اور اپنے تصورات کی کوٹھریوں میں اس طرح بیٹھے رہتے ہیں گویا ان پر کسی نے جادو کیا ہے یا خود انھوں نے اپنے آپ کو ہلنے جلنے کی قوت

سے محروم کر دیا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال ہوا سری نواس شاستری صاحب نے
اپنے لبرل بھائیوں کو خبردار کرنے کے لئے کہا تھا کہ "یہ نہ ہو کہ آپ الگ کھڑے
رہیں اور بس جو کچھ ہوتا ہو اسے ہونے دیں۔" اس آگاہی کا پورا مطلب شاید
سری نواس شاستری صاحب خود بھی نہیں سمجھے۔ ان کا غور و فکر حکومت کی
کارروائیوں تک محدود ہے، اور وہ دراصل ان دستوری تغیرات کی طرف اشارہ
کر رہے تھے جنھیں مختلف سرکاری کمیٹیاں عمل میں لانے کی تدبیریں کر رہی تھیں
لیکن لبرلوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب ان کی اپنی قوم کے لوگ قدم بڑھائے
آگے چلے جا رہے تھے تب بھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ وہ اپنے
ملک کے عوام سے ڈرتے تھے، انھوں نے اپنے اور عوام کے درمیان
غیریت کا پیدا ہونا گوارا کیا مگر حاکموں سے نہیں بگاڑی۔ پھر کیا تعجب ہے
کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی بن گئے، زندگی کا قافلہ گذر گیا اور انھیں الگ
کھڑے چھوڑ گیا۔ اس وقت جب ان کے ملک والے جان اور آزادی کے لئے
جی توڑ کر لڑ رہے تھے تو اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ لبرل دمدمے کے کس
طرف ہیں دمدمے کی دوسری طرف سے وہ ہمیں اچھے اچھے مشورے دے
رہے تھے، اور بڑی سنجیدگی سے ایسے اخلاقی اصول بیان کر رہے تھے جنھیں
ہر کوئی جانتا ہے اور جنھیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گاڑھا لیسدار روغن
ہمارے منہ پر لیس رہا ہے۔ گول میز کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ
ان کے اتحاد عمل نے حکومت کو جو اخلاقی تقویت پہنچائی اس کا خاصہ اثر
ہوا اگر وہ اتحاد عمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ یہ بات قابل
غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں سے ایک میں برطانیہ کی لیبر پارٹی شریک
نہیں ہوئی، مگر ہمارے لبرلوں کو بھلا کون چیز روک سکتی تھی۔ ان سے بعض

انگریزوں نے بھی درخواست کی کہ آپ شریک نہ ہوں، پر وہ نہ مانے۔ ہم سب میانہ رو یا انتہا پسند ہوتے ہیں، کوئی کم کوئی زیادہ، کبھی کسی غرض کے لئے کبھی کسی کے لئے اگر ہمارا دل کسی بات میں لگا ہے تو اس کا ہمارے جذبات پر اثر ہوگا ہر معاملہ میں جہاں اس سے بحث ہوگی ہم نرمی کی بہ نسبت گرمی کی طرف مائل ہوں گے۔ جب ایسا نہ ہو تو ہمارا اس میں کوئی نقصان نہیں اگر ہم خوشی کے ساتھ رواداری برتیں اور ایک فلسفیانہ میانہ روی اختیار کریں جس کا اصل مقصد بے تعلقی پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نرم سے نرم موڈریٹ نہایت انتہا پسند اور لڑنے پر بالکل آمادہ ہو گئے ہیں جب یہ تجویز پیش ہوئی ہے کہ ملک کے کوئی مستقل حقوق املاک وغیرہ مٹا دیئے جائیں ہمارے لبرل دوست ایک حد تک خوش حال اور دولتمند لوگوں کے نمائندے ہیں۔ ان کا سوراج کے لئے انتظار کرنے میں کوئی ہرج نہیں، اس لئے وہ سوراج کے معاملہ میں برانگیختہ نہیں ہوتے۔ لیکن بنیادی معاشرتی اصلاح کی ہر تجویز انھیں بہت ہی گڑبڑا دیتی ہے، وہ اپنی میانہ روی بھول جاتے ہیں اور دوسرے کی بات ماننے پر خوشی سے آمادہ بھی نہیں ہوتے۔ یعنی ان کی میانہ روی در اصل اس رویہ تک محدود ہے جس کا تعلق برطانوی حکومت ہند سے ہے، اور وہ اپنے دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ اگر وہ ادب سے بات کرتے اور سمجھوتہ پر آسانی سے راضی ہوتے رہے تو شاید انھیں اس نیک چلنی کے بدلے میں شنوائی کا شرف بخشا جائے۔ ان کے لئے انگریزوں کی رائے تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ وہ نیلی کتابوں[1] کا شوق اور انہماک سے مطالعہ کرتے

---

[1] پارلیمنٹ میں جو تجویزیں اور قانون منظور ہو جاتے ہیں وہ نیلے سرورق کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ Blue books اس طرح ایک خاص اصطلاح ہو گئی ہے۔

ہیں، ارسکن مے کی تصنیف "پارلیمنٹ کے رواج" اور اسی قسم کی دوسری کتابیں ہر وقت ان کے پاس رہتی ہیں، اور کوئی نئی سرکاری رپورٹ شایع ہوتی ہے تو ان کے یہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے اور خیالی گھوڑے دوڑائے جانے لگتے ہیں۔ لبرل لیڈر جب انگلستان سے واپس آتے ہیں تو ایک عجیب پراسرار انداز سے وائٹ ہال کے بڑے آدمیوں کی کارروائیوں کا حال بیان کرتے ہیں، کیونکہ وائٹ ہال لبرلوں جوابی تعاونیوں اور ایسی جماعتوں کا بیکنٹھ ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ جب نیک امریکن مرتے ہیں تو ان کی روحیں پیرس پہنچتی ہیں، اور اب ممکن ہے اچھے لبرلوں کی روحیں وائٹ ہال کے گرد و نواح میں گشت لگاتی رہتی ہوں۔

میں لکھ تو رہا ہوں لبرلوں کے متعلق، لیکن یہ سب ہم لوگوں کے متعلق بھی، جو کانگریس میں ہیں کہا جا سکتا ہے۔ جوابی تعاون والوں کی نسبت یہ اور بھی زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ میانہ روی میں لبرلوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ معمولی لبرل اور معمولی کانگریسی میں بہت بڑا فرق ہے لیکن دونوں کی ایسی حد بندی نہیں کی جا سکتی جو صاف ہو اور مغالطے کی گنجائش نہ چھوڑے، کیونکہ خیالات اور تصورات کو دیکھیے تو ان لبرلوں میں جو اپنی جماعت میں سب سے زیادہ آزاد خیال ہیں اور میانہ رو کانگریسیوں میں ایک کو دوسرے پر بہتر ثابت کرنا مشکل ہے۔ لیکن گاندھی جی کی بدولت یہ تو ہو گیا ہے کہ ہر کانگریسی کا اپنی سرزمین اور ملک کے رہنے والوں سے تھوڑا بہت تعلق ہو گیا ہے، اس نے سیاسیات کے میدان عمل میں ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ مبہم اور ناقص تصورات کے چند برے نتیجوں سے بچ گیا ہے۔ لبرلوں کا حال کچھ اور ہے۔ ان کا رشتہ پرانی دنیا سے بھی ٹوٹ گیا ہے اور نئی دنیا سے بھی۔ مجموعی حیثیت سے، وہ انسان کی ان قسموں میں سے ہیں جو اب ناپید ہو رہی ہیں

میں سمجھتا ہوں ہم میں سے اکثر ان احساسات کو کھو چکے ہیں جو مذہبوں کے عروج سے پہلے انسان کی رہبری کرتے تھے، اور بصیرت کی نئی شکل ہمیں حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہماری قسمت میں نہ "پروٹیس[1] کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھنا ہے" نہ "بوڑھے ٹریٹن[1] کو اپنا پیچدار سنکھ بجاتے سننا" اور بس تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہیں کہ

ریت کے ذرے میں ایک دنیا دیکھ سکیں
اور ایک جنگلی پھول میں فردوس کا سماں
فضائے لامحدود کو ہتھیلی پر رکھ سکیں
اور ایک گھڑی میں ابدیت محسوس کریں۔"

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں سے اکثر فطرت کی رگوں میں خون کو دوڑتے پھرتے نہیں محسوس کر سکتے، نہ اپنے کان کے پاس اس کے دھیمے بول سن سکتے ہیں، نہ اس کے چھونے سے ہمارے جسم میں مسرت کا لرزہ آتا ہے۔ وہ دن تو گئے۔ لیکن اگر ہم پہلے کی طرح فطرت میں عظمت کے آثار نہیں دیکھ سکتے تو ہم نے نوع انسانی کی فتح اور شکست میں، اس کے زبردست خوابوں اور اندرونی طوفانوں میں اس کے تڑپا دینے والے درد اور اس کی ناکامیوں میں اس کی کشمکش اور اس کی مصیبتوں میں اور اس یقین میں، جو ان سب کیفیتوں پر چھایا رہتا ہے کہ اس کا عظیم الشان مقصد اور اس کی آرزوئیں پوری ہوں گی وہی چیز دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک طرح سے معاوضہ ہے ان تمام دلشکنیوں کا جو ایسی کوشش اور جستجو کے ساتھ لگی ہوتی ہیں، اور اس نے ہمیں اکثر حقیر حوصلوں کو

---

[1] پروٹیس اور ٹریٹن یونانیوں کے دریائی دیوتا تھے۔

بھلا کر بلندی کی طرف مائل کیا ہے۔ لیکن بہتیرے ایسے ہیں جنھوں نے انسانی سرگذشت میں حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، اور چونکہ انھوں نے پرانی وضع کو چھوڑ دیا ہے، انھیں اب کسی طرف کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ وہ نہ بہتر زندگی کے خواب دیکھتے ہیں نہ ان میں عمل کی صلاحیت ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فرانس کے بڑے انقلاب میں اور روسی انقلاب میں نوع انسانی نے کس طرح بے تاب ہو کر پلٹے کھائے، نوع انسانی کی وہ خواہشیں جو مدتوں سے دبی ہوتی ہیں جب اپنی تمام پیچیدگیوں سمیت کوہ آتش فشاں کی طرح اچانک اور بیدردی کے ساتھ آگ برسانے لگتی ہیں تو وہ ڈر جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک نوع انسانی نے اپنے قیدخانہ کی ایک دیوار بھی نہیں گرائی ہے۔

لوگ خود پسندی کے غصے میں اکثر کہتے ہیں کہ "وطن پرستی کانگریسیوں کا اجارہ نہیں ہے"۔ یہی فقرہ اس طرح بار بار دہرایا جاتا ہے کہ آدمی نئی بات سننے سے مایوس ہو کر پریشان ہو جاتا ہے مجھے امید ہے کہ کسی کانگریسی نے اس جذبہ میں اکیلے دوئی کا حصہ دار ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہوگا۔ بہرحال میں اسے ہرگز کانگریس کا اجارہ نہیں سمجھتا، اور جو کوئی بھی چاہتا ہو میں خوشی سے اسے اس کے حوالے کر دوں گا۔ وطن پرستی اکثر ان لوگوں کی جائے پناہ ہوتی ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا یا اپنی حیثیت بنانا چاہتے ہیں، اور ہر مذاق اور غرض اور طبقے کے لوگوں کے لیے اس کی ایک مناسب قسم مل جاتی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ کا وہ چیلا جس نے انھیں دغا دی تھی آجکل ہوتا تو وہ بھی وطن پرستی کی آڑ لیتا۔ وطن پرستی اب کافی نہیں رہی ہے۔ ہمیں اب اس سے برتر اس سے وسیع تر اور بلند تر مسلک درکار ہے۔

میانہ روی بذات خود بھی کافی نہیں۔ ضبط اچھی چیز ہے اور ہماری

شائستگی کا اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ضبط کے ساتھ وہ بھی تو چاہئے کہ جسے روکئے اور قابو میں رکھئے۔ انسان کی قسمت میں ازل سے مقرر ہے کہ وہ عناصر قدرت کو قابو میں لائے، بجلی پر سوار ہو، آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں اور پانی کے تیز اور ابلتے دھاروں کو اپنے کام میں لائے، لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ مشکل ان جذبات کی روک تھام کرنا اور انھیں قابو میں لانا ہے جو اس کے اندر امنڈتے اور اسے جلاتے رہتے ہیں جب تک وہ انھیں اپنے قبضہ میں نہ رکھے وہ انسانیت کے پورے ورثہ کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان ٹانگوں کو آگے نہ بڑھائیں جو خود ہلنے سے معذور ہیں، ان ہاتھوں سے کام نہ لیں جن پر فالج گرا ہے؟

اس موقع پر رائے کیمبل کے چار مصرعے لکھے بغیر نہیں رہا جاتا جو اس نے جنوبی افریقہ کے چند ناول نویسوں پر کہے تھے یہ ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں پر بھی اس طرح پورے اترتے ہیں۔

لوگ اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ تمھارے ضبط پر کوئی جذبہ غالب نہیں آ سکتا
اس معاملہ میں مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔
تم لگام اور دہانے کو تو خوب استعمال کرتے ہو۔
مگر یہ تو بتاؤ کہ گھوڑا کمبخت کہاں ہے؟

ہمارے لبرل دوست کہتے ہیں کہ وہ اعتدال کے تنگ راستہ پر چلتے ہیں اور کانگریس اور حکومت ہند کے دونوں کناروں کے بیچ میں اپنی کشتی کو چلاتے ہیں۔ انھوں نے اس کا فیصلہ کرنا اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اس میں یا اس میں کون سی خامی ہے، اور اس بات پر اپنی پیٹھ ٹھوکتے ہیں کہ ان میں نہ اس کے عیب ہیں نہ اُس کے۔ وہ ترازو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے

ہیں، اور انصاف کی دیوی کی طرح شاید وہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں یا ان پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ کیا یہ میرا خیال ہی ہے جو مجھے صدیوں پیچھے لے جاتا ہے اور مجھے یہ مشہور کلمے سناتا ہے:

"عالمو اور خود پسند عابدو! . . . تم اندھے رہبر ہو کہ ایسے گناہ سے جو اونٹ کے برابر ہو چشم پوشی کر سکتے ہو اور ذرا ذرا سی بات تمہاری نظروں میں کھٹکتی ہے!"

(۵۲)

درجہ نوآبادی اور کامل آزادی

پچھلے سترہ برس میں جن لوگوں نے کانگریس کی سیاست طے کی ہے وہ بیشتر متوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ خواہ وہ لبرل ہوں یا کانگریسی، وہ تھے ایک ہی طبقہ کے لوگ اور انھوں نے ایک سے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ ان کی زندگی، ان کا میل جول، ان کے تعلقات ایک ہی رنگ کے تھے، اور بورژوا[1] نصب العین کی دو قسمیں جن سے انھیں الگ الگ عقیدت تھی ابتدا میں یوں سمجھیے کہ ایک ہی سے تھے۔ مزاج اور طبیعت کے اختلاف نے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا، اور ان کے نقطۂ نظر کو بدل دیا، ایک گروہ کی نگاہ حکومت اور متوسط طبقہ کے سربرآوردہ، مالدار آدمیوں کی طرف اُٹھی، دوسرے کی متوسط طبقہ کے کم حیثیت والے حصے کی طرف جھکی۔ ان کے خیالات دراصل ایک سے تھے، ان کے مقاصد میں کوئی فرق نہ تھا، لیکن دوسرے گروہ کو بازار کے ادنی پیشوں کے لوگوں اور تعلیم یافتہ مگر بے روزگار آدمیوں کی کثیر تعداد پیچھے سے ڈھکیلنے لگی، ان کا لہجہ بدل گیا

---

[1] بورژوا (Bourgeois) کے اصل معنی ہیں متوسط طبقہ کے لوگ، لیکن اشتراکی ادب میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چاہے خود بڑے سرمایہ دار نہ ہوں مگر سرمایہ داری کے معاشرتی نظام اور تہذیب کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، اور اسی طرح وہ ہر اس شخص کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو اشتراکی نہ ہو۔

انھوں نے مراتب کا لحاظ اور ادب سے بات کرنا چھوڑ دیا، اور زور سے اور بڑھ بڑھ کر بولنے لگے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عمل میں تاثیر پیدا کریں، اس لئے انھوں نے سخت کلامی کرکے کچھ تسکین حاصل کی۔ سیاسیات کو اس طرح کروٹ بدلتے دیکھ کر اعتدال پسند (موڈریٹ) ڈر گئے انھوں نے اس دوڑ میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دیا اور تنہائی کو سلامتی جانا۔ اس حالت میں بھی کانگریس کے اندر متوسط طبقہ کے اونچے درجہ کے نمائندوں کی تعداد بہت تھی، اگرچہ اکثریت انھیں کی رہی جو ادنیٰ درجہ کے تھے۔ ان کو ادھر بھی ایک حوصلہ کھینچ کر نہیں لایا کہ قوم کو جنگ میں کامیابی ہو، بلکہ وہ اس جنگ کے ذریعہ اپنے دل کی ایک خواہش بھی پوری کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس کی بدولت اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور خودداری حاصل کرنا اور اپنی بگڑی حیثیت کو بنانا چاہتے تھے۔ قومیت کا جذبہ عام طور سے اسی طرح ابھرتا ہے، اور اگرچہ خصوصیات ہر خیال کے لوگوں میں یکساں پائی جاتی تھیں، اعتدال اور انتہا پسندوں کے مزاج کا فرق یہیں پر ظاہر ہوا۔ آہستہ آہستہ متوسط طبقہ کا ادنیٰ درجہ کانگریس پر حاوی ہوگیا، اور اس کے بعد کسانوں کا اثر بھی محسوس ہونے لگا۔

جیسے جیسے کانگریس دیہاتی آبادی کی نمائندگی کرنے لگی اس کے اور لبرلوں کے درمیان جو خلیج حائل ہوگئی تھی وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ لبرلوں کے لئے کانگریس کا نقطہ نظر سمجھنا یا اس کی قدر پہچاننا ناممکن سا ہوگیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے بڑے آدمی کے لئے پھونس یا مٹی کے جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے والے کی بات سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود دونوں کا فلسفہ قومی اور بورژوا تھا یا فرق جو تھا وہ قسم کا نہیں تھا، شدت کا تھا۔ بہت سے لوگ جو لبرل جماعت میں بے تکلفی سے کھپ سکتے تھے آخر وقت تک کانگریس میں رہے۔

کئی پشتوں تک انگریز ہندوستان کو اسی وضع کا ایک بہت بڑا

زمینداروں کا گھر سمجھتے رہے جیسے کہ اگلے زمانہ میں انگلستان میں ہوتے تھے۔ وہ گویا میاں لوگ تھے جو اس مکان کے مالک تھے اور اس کے سب سے اچھے حصوں میں رہتے تھے، اور ہندوستانی ملازموں کی طرح شاگرد پیشے، برتن دھونے کے کمرے اور باورچی خانہ میں رکھ دئے گئے تھے۔ ہر باضابطہ زمیندار گھرانے کی طرح جس میں ملازموں کے مراتب مقرر ہوتے ہیں یعنی خانساماں منتظم، باورچی، خادمہ، سائیس وغیرہ، ویسے ہی یہاں کا بھی قاعدہ تھا، اور اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ کس کا درجہ بڑا ہے کس کا کم۔ لیکن اس گھرانے کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے درمیان معاشرتی اور سیاسی تفاوت تھا جس کا مٹنا ناممکن تھا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ برطانوی حکومت نے ایسے انتظام کو ہمارے اوپر مسلط کیا، تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم نے یا ہم میں سے ایک بڑی تعداد نے اسے منظور کرلیا، اور اسے اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کا ایک قدرتی اور لازمی نظام سمجھا۔ ہم میں وہی ذہنیت پیدا ہوگئی جو ایک زمیندار گھرانے کے اچھے نوکر کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں یہ انوکھی عزت بخشی جاتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں چائے کی ایک پیالی پینے کو دے دی جاتی تھی، اور ہمارے حوصلے کی انتہا یہ تھی کہ شریف سمجھے جائیں اور فرداً فرداً ترقی کرکے اعلیٰ طبقہ میں پہنچ جائیں۔ انگریزوں کا ہماری طبیعتوں کو اس طرح قابو میں کرلینا ایک کارنامہ تھا جس کی عظمت ان کے تدبّر اور ان کی فوج کی کامیابیوں سے زیادہ تھی جیسا کہ اگلے زمانہ کے حکما نے کہا ہے غلام کے دماغ میں غلامی سرایت کرگئی، وہ غلام ہی کی طرح سوچنے بھی لگا۔

زمانہ بدل گیا ہے، اب اس وضع کی تہذیب جس کا نمونہ انگریز زمینداروں کا گھرانا تھا، نہ انگلستان میں خوشی سے تسلیم کی جاتی ہے، نہ ہندوستان میں پھر بھی ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو شاگرد پیشہ ہی میں گھُسے رہنا چاہتے ہیں اور

ست کی سنہری پیٹیوں اور وردیوں پر ناز کرتے ہیں۔ دوسرے ہیں جو لبرلوں
ج اس زمینداروں کے گھر اور اس کی تمام لوازمات کو قابل قبول سمجھتے ہیں،
رت اور طرز تعمیر کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس کی امید رکھتے ہیں کہ ایک ایک
کے خود اس کے مالکوں کی جگہ لے لیں گے۔ اسے وہ "ہندوستانی بنانا" یا "ہندیانا"
تے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظام حکومت کا رنگ بدل جائے
یادہ سے زیادہ کوئی نیا انتظام قایم کیا جائے۔ بالکل نئی ریاست قایم کرسکنے کا
مور بھی یہ نہیں کرسکتے۔

ان کے لئے سوراج کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز پہلے کی سی حالت پر قائم رہے
ں رنگ زیادہ گہرا ہو جائے۔ مستقبل کا یہی ایک نقشہ ان کے ذہن میں
ملتا ہے کہ وہ یا انھیں کے سے لوگ سیاسی ڈرامہ کا خاص پارٹ کریں، اور
، انگریز عہدہ داروں کے عہدے حاصل کرلیں، ملازمتوں، سرکاری محکموں،
ن ساز مجلسوں، تجارت، صنعت، سب کی صورت یہی رہے۔ سول سروس
لے اپنے کام میں لگے رہیں، راجہ مہاراجہ اپنے محلوں میں براجتے رہیں، اور
ئی کبھی فینسی ڈریس یا ناچ رنگ کے لباس میں جواہرات کی چمک سے اپنی
ایا کو مرعوب کرنے کے لئے جلوہ افروز ہوں یا زمیندار ایک طرف خاص تحفظ
طالبہ کرتے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ستاتے رہیں، یا ساہوکار اپنی
یسوں کی تھیلیاں لئے زمیندار اور کاشتکار دونوں کی زندگی دوبھر کرتا رہے
ن اپنی فیس وصول کرے اور خدا اپنے آسمان پر رہے۔

اصل میں ان لوگوں کے فلسفہ کی بنیاد موجودہ صورت حال قائم رہنے
ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں وہ بس شخصی ہیں۔ ان
یلیوں کو وہ انگریزوں کی رضامندی سے آہستہ آہستہ عمل میں لانا چاہتے

ہیں، جیسے کوئی چیز چھن کر قطرہ قطرہ آتی ہے۔ ان کی سیاسیات اور معاشیات کا دارومدار برطانوی سامراج کے استحکام اور بقا پر ہے۔ ان کے نزدیک اس سامراج کو کم از کم ایک بڑی مدت تک زوال نہیں آسکتا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لیا ہے، اور وہ اس کے سیاسی اور معاشی فلسفہ ہی کو بجا تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے اخلاقی معیار کو بھی مانتے ہیں جو برطانوی تسلط کے قیام کو مدنظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔

اس رویہ سے کانگریس کا رویہ بالکل مختلف ہے، اس لئے کہ کانگریس انتظام حکومت کو بدلنا ہی نہیں بلکہ ایک نئی ریاست کی طرح ڈالنے کی فکر میں ہے۔ اس نئی ریاست کا نقشہ اوسط قابلیت کے کانگریسیوں کے ذہن میں بالکل صاف نہیں ہے، اور لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔ مگر سوا چند لوگوں کے جو ایک سرے پر ہیں اور میانہ روی کے قائل ہیں، کانگریسی عام طور سے اس پر متفق ہیں کہ موجودہ حالات اور طرز عمل نہ جاری رہ سکتا ہے اور نہ رہے گا، اور بنیادی تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہے۔ اسی میں سمجھئے درجہ نوآبادی اور کامل آزادی کا فرق ظاہر ہوتا ہے درجہ نوآبادی میں پرانے معاشرتی نظام کا باقی رہنا اور انگلستان کے معاشی نظام سے ہمارا ظاہری اور پوشیدہ زنجیروں سے جکڑے رہنا فرض کیا جاتا ہے آزادی میں ہمیں اس کا اختیار ہوگا یا ہونا چاہیے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعمیر کریں۔

اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انگلستان یا انگریزی قوم سے ایسی عداوت برتی جائے جسے کم یا دور کرنے کی گنجایش نہ ہو، اور نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان سے قطع تعلق کرنے کی خواہش کو ہر طرح کا نقصان اٹھا کر پورا کریں۔ گذشتہ واقعات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تعلقات کا ٹھیک

کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ "بے سلیقہ طاقت کنجی کو خراب کرکے کلہاڑی سے تالا کھولتی ہے"۔ ہمارے دلوں کی کنجی مدتیں ہوئیں کہ توڑ ڈالی گئی، اور انگریزوں سے ہمیں اس بنا پر رغبت ہو نہیں سکتی تھی کہ انھوں نے اس کنجی کی جگہ بے تکلف کلہاڑی سے کام لیا۔ لیکن اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ چھوٹی باتوں سے گذر کر ہندوستان اور نوع انسان کی بڑی خدمات انجام دیں تو ہمارے لیے اس کا موقع نہیں ہے کہ اپنے آپ کو وقتی جوش کے حوالے کردیں۔ اور اگر ہم اس طرف مائل بھی ہوں تو وہ سخت تربیت جو گاندھی جی پندرہ برس سے دے رہے ہیں ہمیں روک لے گی۔ میں یہ باتیں انگریزوں کے بنائے ہوئے جیل خانہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں سات مہینے سے میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اور جتنی تکلیف مجھے اس قید تنہائی میں ہوئی اتنی جیل میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات سے میرا دل غصہ اور عداوت سے بھر آیا ہے۔ لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈھتا ہوں تو وہاں مجھے انگلستان یا انگریزوں سے عداوت کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ مجھے برطانوی ملوکیت سے نفرت ہے۔ اور مجھے اس پر غصہ آتا ہے کہ ہندوستان اس کا شکار ہوا ہے۔ مجھے سرمایہ داری کے نظام سے نفرت ہے، اور جس طرح برطانیہ کے حاکم طبقے ہندوستان کا خون چوستے ہیں اس سے مجھے اور بھی نفرت ہے اور اس پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ لیکن میں انگلستان یا تمام انگریزی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیراتا، اگر میں ایسا کرتا بھی تو اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلتا، اس لئے کہ پوری قوم کی قوم سے خفا ہو جانا یا اسے ملزم قرار دینا کسی قدر حماقت کی بات ہے۔ وہ بھی حالات سے اتنی ہی مجبور ہوتی ہے جتنے کہ ہم۔

اپنی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ انگلستان کا میری ذہنی ساخت پر اتنا زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے کبھی بھی پوری غیریت نہیں برت سکتا۔ میں چاہے جتنی کوشش کروں میں ان ذہنی عادتوں، اس معیار اور دوسری قوموں اور عام زندگی کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے ان طریقوں سے جو میں نے انگلستان کے اسکول اور کالج میں سیکھے تھے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ سیاسی معاملات کے سوا میرے ذہنی میلانات بھی مجھے انگلستان کی طرف مائل کرتے ہیں، اور اگر میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کا ایسا کٹر مخالف ہو گیا ہوں جو کسی مصالحت پر راضی نہیں ہو سکتا تو اس میں میری تربیت اور طبیعت کا کوئی قصور نہیں۔ انگریزوں کی قوم نہیں بلکہ یہ حکومت، یہ تسلط اصل چیز ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے اور اسی سے ہم خوشی سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہیں تو انگریزوں سے اور دوسری غیر قوموں سے ضرور گاڑھا میل جول رکھ سکتے ہیں، ہندوستان میں ہم کو تازی ہوا چاہیئے، تازے اور جان بخش خیالات اور ایسا اتحاد عمل جس سے ہماری سیرت کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ ہم سٹھیا گئے ہیں، ہمارے خیالات بوسیدہ ہیں۔ لیکن اگر انگریز شیر بن کر آنا چاہیں تو انھیں دوستی یا اتحاد عمل کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ ملوکیت کے شیر کا اسی کی سی بیدردی سے مقابلہ کیا جائے گا، اور آج ہمارے ملک کا اس خونخوار جانور سے سابقہ ہے جنگل کے وحشی چیتے کو سدھانا اور اس کی خلقی خونخواری کو تربیت کے جادو سے دور کرنا ممکن ہے، لیکن جب سرمایہ داری اور ملوکیت مل جائیں اور کسی بدقسمت ملک پر جھپٹا ماریں تو انھیں قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ وہ یا اس کی قوم مصالحت نہ کرے گی ایک معنی میں بیوقوفی ہے، کیونکہ دنیا ہمیں ہر وقت مصالحت کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ ۱۰۱

جب یہ بات کسی اور قوم یا ملک کے بارہ میں کہی جائے تب تو وہ صریحی حماقت ہے۔ لیکن لوگ اس پر اڑ جائیں کہ ہم فلاں نظام کو تسلیم نہ کریں گے یا فلاں صورت حال کو گوارا نہ کریں گے تو اس میں صداقت ہو سکتی ہے اور تب انھیں کوئی انسانی قوت اس پر مجبور نہیں کر سکتی کہ مصالحت کر لیں۔ ہندوستانی آزادی اور برطانوی ملوکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور انھیں نہ فوجی عملداری ہم آہنگ اور یکجا کر سکتی ہے نہ مدبروں کی ساری لیپ پوت۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سچے اتحاد عمل کے لئے موافق حالات اسی وقت پیدا ہوں گے جب ہندوستان سے برطانوی ملوکیت مٹا دی جائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ آجکل کی دنیا میں جب ہر روز ایک ملک کو دوسرے کی ضرورت روز بروز زیادہ ہو رہی ہے کامل آزادی کا عقیدہ رکھنا تنگ نظری ہے، اور ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو گویا زمانہ کی گھڑی کو پیچھے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لبرل اور امن پرست اور برطانیہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں سب یہی دلیل پیش کر کے ہماری تنگ نظر قومیت پر ہماری سرزنش کرتے ہیں اور ضمناً یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے مکمل قومی زندگی کا ذریعہ "برطانوی اقوام کی کامن ویلتھ Commonwealth ہے"۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگلستان میں ہر رنگ کی حکمت عملی (لبرل، امن پرست، اشتراکی وغیرہ) سامراج کے قیام کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ٹروٹسکی نے لکھا ہے کہ "حاکم قوم کی یہ خواہش کہ ہر چیز بس اپنے حال پر قائم رہے اکثر ایک خاص انداز اختیار کرتی ہے جو اپنے کو "قومیت" کے خیال پر برتر جتاتا ہے۔ بالکل جیسے فاتح قوم مال غنیمت کو قبضہ میں رکھنے کے لئے بڑی آسانی سے امن پرست بن جاتی ہے۔ اسی طرح تو گاندھی کے مقابلہ میں میکڈونلڈ اپنے آپ کو بین الاقوامی

میل جول کا حامی سمجھتا ہے !"

مجھے معلوم نہیں کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کیا کرے
اور اس کا کیا حال ہو گا۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہی لوگ جو آج قومی آزادی
چاہتے ہیں وہی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا
چاہتے ہیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک تو قومیت کے کوئی معنی ہی نہیں، لیکن
وہ لوگ جو اشتراکی نہیں اور کانگریس کی اگلی صفوں میں ہیں وہ بھی بین الاقوامی
میل ملاپ سے پختہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر آج ہم کامل آزادی کا مطالبہ کرتے
ہیں تو اس سے ہمارا مطلب دنیا سے قطع تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف
ہم تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی اس آزادی کے ایک حصہ سے
دست بردار ہو جائیں تاکہ ایک بین الاقوامی نظام قایم کیا جا سکے۔ ملوکیت
کوئی نظام، اس کا نام چاہے جتنا شاندار ہو، ایسی تنظیم کا دشمن ہو گا، اور اگر
دنیا میں اتحاد عمل اور امن چاہتے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے ملوکیت
نظام کبھی کام نہ آئے گا۔

حال کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے تمام سامراجی نظا
خود کفائتی اور معاشی سامراج کے ذریعہ اپنے آپ کو روز بروز دوسروں سے
جدا کر رہے ہیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ قوموں کا تعلق زیادہ گہر
ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل خلاف ہو رہا ہے۔ اس کے اسب
دریافت کرنا کچھ مشکل نہیں، اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ معاشی ن
کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حکمت عملی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اس
میں جو خود کفیل ہوا اتحاد عمل بڑھ جاتا ہے، وہاں دوسری طرف باقی د
سے علیحدگی بھی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اوٹا وا اور دوسرے فیصلوں کا ا

یہ ہوا ہے کہ برطانوی سامراج کے سوا اور ملکوں سے ہمارے تعلقات اور میل جول میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم پہلے سے بھی زیادہ برطانوی صنعت کے دست نگر ہو گئے ہیں اور ان نقصانات کے علاوہ جو ہم برداشت کر چکے آگے چل کر اس حکمت عملی کے خطرے بھی ظاہر ہیں۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ درجہ نوآبادی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بڑھانے کی جگہ ہمیں الٹا اوروں سے جدا کر دے گا۔

مگر ہمارے لبرل دوستوں میں یہ حیرت انگیز صفت ہے کہ وہ دنیا اور خصوصاً اپنے ملک کو برطانیہ کی خالص قومی رنگ کی عینکوں سے دیکھتے ہیں وہ یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کانگریس کیا کہتی ہے اور کیوں کہتی ہے بس انگریزوں کے اس پرانے اعتراض کو کہ آزادی درجہ نوآبادی کے مقابلہ میں تنگ ہے اور روح کو اس سے اتنا فروغ نہیں ہو سکتا دہراتے رہتے ہیں ان کی بین الاقوامی دنیا بس وائٹ ہال ہے، اس لئے کہ دوسرے ملکوں کے بارہ میں کچھ تو زبان کی دشواری کے سبب سے مگر زیادہ تر اسی وجہ سے کہ وہ دوسرے ملکوں کو اطمینان کے ساتھ نظر انداز کر سکتے ہیں۔ انھیں مطلق کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے اندر تو وہ ہر اس طرز عمل کے خلاف ہوتے ہی ہیں جس میں حکومت کی براہ راست مخالفت ہو یا جس سے جنگجوئی ظاہر ہوتی ہو لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے بعض لیڈروں کو اس وقت کوئی اعتراض نہیں ہوتا جب کسی دوسرے ملک میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسی چیزوں کو دور سے سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قدر بھی کر سکتے ہیں اور مغربی ملکوں کے کئی حاکم مطلق ہیں جنھیں ان سے ذہنی احترام اور عقیدت کا خراج ملتا رہتا ہے۔

ناموں سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ ہمارے مد نظر ایک نئی ریاست ہے یا صرف ایک بدلا ہوا

انتظام حکومت ۔ لبرل اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ صاف ہے ۔ انھیں ایک بدلے ہوئے انتظام حکومت سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیئے، اور یہ بھی ان کے نزدیک ایک ایسی منزل مقصود ہے جہاں تک ہم ایک لمبا سفر کر کے بتدریج ہی پہنچیں گے ۔ وہ کبھی کبھی درجہ نوآبادی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن فی الحال جو چیز دراصل ان کے مدنظر ہے وہ "مرکز میں ذمہ داری" کے پراسرار الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہے ۔ ایسے جوشیلے لفظ: جیسے کہ طاقت، خودمختاری، حریت، آزادی انھیں نہیں بھاتے، ان کی تو آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرناک ہیں قانون دانوں کی زبان اور بحث کا طریقہ انھیں بہت پسند ہے، اگرچہ اس سے عوام کے دلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی ۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ افراد اور جماعتوں نے عقیدے اور آزادی کے لئے خطروں کا سامنا کیا اور جان کو بھی داؤں پر لگا دیا ۔ مگر اس میں شک ہے کہ "مرکز میں ذمہ داری" یا ایسی کسی قانونی اصطلاح کی خاطر کوئی شخص کبھی بھی جان بوجھ کر ایک وقت کا کھانا چھوڑ دے گا یا کسی کی گہری نیند ہلکی ہو جائے گی ۔

تو یہ ہے ان کا مطمح نظر، اور یہ مقصد حکومت کی کھلم کھلا مخالفت یا کسی طرح کی پیش قدمی کر کے حاصل نہ کیا جائے گا، بلکہ جیسا کہ سری نواس شاستری صاحب نے فرمایا ہے، "دانشمندی، تجربہ کاری، میانہ روی، دوسرے کو قائل کرنے کی قوت، خاموش اثر اور سچی مستعدی" کی خوبیوں کو نمایاں کر کے ۔ امید اس کی کی جاتی ہے کہ ہمارا نیک چلن اور ہمارے اچھے کام آخر کار ہمارے حاکموں کو اس پر آمادہ کریں گے کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دے دیں ۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے حاکم آجکل ہماری مخالفت یا تو اس سبب سے کرتے ہیں کہ ہمیں لڑائی پر تلے ہوئے دیکھ کر انھیں غصہ آتا ہے یا اس وجہ سے کہ انھیں ہماری

متعدد پر شبہ ہے یا ممکن ہے یہ دونوں باتیں یکساں ان کے ردیے پر
ثر ڈال رہی ہوں ۔ ملوکیت کی اور موجودہ حالات کی اس توضیح سے کسی قدر
مادہ لوحی ظاہر ہوتی ہے ۔ پروفیسر آر ۔ ایچ ۔ ٹونی نے ، جو ایک تیز نظر انگریز مصنف
ہیں ، اس خیال کے متعلق کہ اقتدار درجہ بدرجہ اور حاکم طبقوں کی مدد سے
حاصل کیا جا سکتا ہے ایک جگہ بڑی اچھی اور چبھتی ہوئی بحث کی ہے ۔ انھوں نے
لکھا تو ہے برطانوی لیبر پارٹی کے متعلق ، لیکن جو کچھ وہ کہتے ہیں ہندوستان
پر اور بھی پورا اترتا ہے ، کیونکہ انگلستان میں کم از کم جمہوری ادارے تو ہیں
جن کے ذریعہ سے اصولاً اکثریت کا ارادہ ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔ پروفیسر ٹونی
لکھتے ہیں :

"پیاز تو پرت پرت کر کے کھائی جا سکتی ہے ، لیکن آپ چاہیں کہ زندہ شیر
کی کھال کھینچیں ، پہلے ایک پنجہ کی اور پھر دوسرے کی ، تو یہ نہیں ہو سکتا چیر پھاڑ
تو خود شیر کا پیشہ ہے ، وہ پہلے کھال اتار لیتا ہے "۔

دنیا میں شاید کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے سربرآوردہ اور حاکم طبقہ
کے لوگ سب بدھو ہیں ، لیکن انگلستان تو ہرگز ایسے ملکوں میں نہیں ۔ یہ
خیال کہ لیبر پارٹی کے مطالبات پیش کرنے میں موقع شناسی اور دوستانہ انداز
سے کام لیا جائے تو یہ لوگ اس دھوکے میں ڈالے جا سکتے ہیں کہ یہ ان کے
اپنے مطالبات ہیں ایسا ہی فضول ہے جیسے یہ کوشش کہ ایک چلتے ہوئے
وکیل سے ایسی جائداد دھوکہ دھڑی سے حاصل کر لی جائے جس کی دستاویز
حقیقت اس کے قبضہ میں موجود ہے ۔ ہمارے یہاں کے وہ لوگ جن کے ہاتھ
میں دولت اور اقتدار ہے خوشگوار اخلاق کے ، ہوشیار ، زوردار اور
اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں اور جب یہ زچ ہوتے ہیں تو پھر

توکسی اخلاقی اصول کا لحاظ بھی نہیں کرتے ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ "روٹی پر مکھن کس طرف لگا ہے"، اور وہ اس پر بھی تلے ہوئے ہیں کہ مکھن کی فراہمی میں کمی نہ ہو ... اگر انھوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں دیکھا تو وہ ہر سیاسی اور معاشی چال چلیں گے اور ہر ہتھیار سے کام لیں گے ۔ ایوان امرا، بادشاہ، اخبار فوج میں بدامنی، مالی دشواریاں، بین الاقوامی پیچیدگیاں، اور جیسا کہ وہ حملہ جو اخباروں نے ۱۹۳۱ء میں پاؤنڈ پر کیا تھا ظاہر کرتا ہے، وہ دیس تیاگیوں کی اس چال تک سے نہ چوکیں گے جس میں اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی خاطر ملک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے ۔"

برطانوی لیبر پارٹی کا ایک زبردست نظام ہے ۔ مزدوروں کے یونین، جس کے لاکھوں چندہ دینے والے اراکین ہیں، اور جنھوں نے ایک نہایت مکمل امداد باہمی کا نظام مرتب کر لیا ہے اس کی پشت پر ہیں، اور اعلیٰ پیشوں کے بہت سے لوگ اس کے رکن اور ہمدرد ہیں ۔ برطانیہ میں جمہوری مشاورتی ادارے ہیں جن کی بنیاد عام حق رائے دہندگی پر ہے، اور سیاسی آزادی کا رواج صدیوں سے قائم ہے ۔ ان سب باتوں کے باوجود مسٹر ٹونی کی رائے ہے اور حال کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا ہے کہ ان کی رائے درست ہے کہ لیبر پارٹی خالی مسکرانے اور نرمی سے بات سمجھانے سے اصل اقتدار حاصل نہیں کر سکتی، اگرچہ یہ دونوں طریقے اپنی جگہ مفید اور پسندیدہ ہیں ۔ مسٹر ٹونی کہتے ہیں کہ اگر ایوان عام میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہو گئی تب بھی اسے بنیادی اصلاحیں عمل میں لانے کا ذرا بھی اختیار نہ ہو گا ۔ کیونکہ سربرآوردہ اور مقتدر طبقے کے لوگ جو ان کے مقابلہ میں صف آرا ہیں، بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مالی اور فوجی قلعوں پر اپنا

قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ہندوستان کی حالت بالکل اور ہے۔ یہاں نہ جمہوری ادارے ہیں نہ روایات، بلکہ اس کے برخلاف آرڈیننس اور حکومت مطلق کا رواج پرانا اور مستند ہو گیا ہے۔ یہاں آئے دن شخصی اور تقریر، تحریر، اجتماع اور پریس کی آزادی کا سر کچلا جایا کرتا ہے۔ لبرلوں کی پشت پر کوئی مضبوط نظام نہیں ہے۔ اس لئے انھیں بس اپنے تبسم ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

لبرل ہر تحریک کی جو دستور یا قانون کے خلاف ہو سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں کا دستور جمہوری ہو، "دستور" کے معنی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ قانون سازی پر حاوی ہوتا ہے، آزادی کا تحفظ کرتا ہے، عاملہ کی روک تھام کرتا ہے، اور سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلیاں کرنے کے جمہوری طریقے معین کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی دستور نہیں اور یہاں یہ اصطلاح ایسے کوئی معنی نہیں رکھتی[1]۔ اسے استعمال کرکے ہم صرف ایک تصور کو اپنی سیاسی بحث میں داخل کرتے ہیں جس کے لئے ہماری موجودہ زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ لفظ اکثر عاملہ کی کم و بیش بے ضابطہ کارروائیوں کی تائید کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، یا اس سے مراد

---

[1] مسٹر سی وائی چنتامنی نے جو ایک ممتاز لبرل لیڈر اور اخبار "لیڈر" کے صدر مدیر ہیں یوپی کونسل میں پارلیمنٹری جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں کسی قسم کی دستوری حکومت نہیں: "بہتر یہ ہے کہ ہم موجودہ غیر دستوری حکومت کے ماتحت رہیں بہ نسبت اس آئندہ کی حکومت کے جو اور بھی رجعت پسند اور بہت زیادہ غیر دستوری ہو گی۔"

فقط "قانونی" ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بہت بہتر ہے اگر ہم "قانون" اور "خلاف قانون" پر اکتفا کریں، اگرچہ یہ اصطلاحیں بھی مبہم ہیں اور ان کے معنی آج کچھ ہوتے ہیں تو کل کچھ اور۔

ایک نیا قانون یا نیا آرڈیننس نئے جرم قائم کر دیتا ہے۔ کسی پبلک جلسہ میں شریک ہونا جرم ٹھہرایا جا سکتا ہے، یا بائسکل پر چڑھنا، یا کوئی خاص کپڑے پہننا، یا مغرب سے پہلے گھر کے اندر نہ پہنچ جانا، یا تھانہ میں روز حاضری نہ دینا، ہندوستان کے بعض حصہ ہیں جہاں آجکل یہ سب باتیں قانون کی خلاف ورزی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ملک کے ایک حصہ میں کوئی بات جرم مانی جائے اور دوسرے میں نہ مانی جائے۔ جب کوئی غیر ذمہ دار عاملہ مختصر سے مختصر اطلاع کے بعد ایسے قانون جاری کر سکتی ہے تو "قانون" سے مراد اس عاملہ کے ارادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ معمولاً ایسے قانون کی خوشی سے یا منہ پھلا کر تعمیل کی جاتی ہے، اس لئے کہ نافرمانی کے نتیجے ناگوار ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی کہے کہ وہ ہمیشہ قانون کی فرماں برداری کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مطلق حکومت یا غیر ذمہ دار قوت کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتا ہے، اپنے ضمیر کو اس کے حوالے کر دیتا ہے، اور جہاں تک کہ اس کے اپنے عمل کا تعلق ہے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آجکل ان ملکوں میں جہاں کی حکومت جمہوری ہے اس پر بحث ہو رہی ہے کہ معاشی نظام میں ان ذریعوں کی بدولت جو دستور نے مہیا کئے ہیں بنیادی تبدیلیاں معمولی کارروائی کے طور پر عمل میں لائی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا، اور کوئی غیر معمولی انقلابی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔ ہمارے لئے تو یہ دیکھنا بیکار ہے کہ اس بحث سے کیا نتیجہ نکلتا ہے،

کیونکہ ہم جو تبدیلیاں چاہتے ہیں انھیں عمل میں لانے کے لئے دستور نے کوئی ذریعے مقرر ہی نہیں کئے ہیں۔ اگر وائٹ پیپر White Paper والی یا ایسی ہی کسی اور تجویز نے قانون کی شکل پائی تو ہماری دستوری نشو و نما کی طرف بالکل بند ہو جائے گی اور انقلاب یا غیر قانونی کارروائی کے سوا اس قید سے آزاد ہونے کا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ تو پھر کرنا کیا چاہئیے؟ کیا اصلاح کا خیال چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو بیٹھیں؟

آجکل جو صورت ہے وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ عاملہ کو اس کا اختیار ہے۔ اور یہ اختیار کام میں بھی لایا جاتا ہے کہ ہر قسم کی پبلک کام کو بالکل بند کر دے یا اس میں رکاوٹیں پیدا کر دے۔ ہر کام جو اس کی رائے میں اس کے لئے خطرناک ہے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے، اور اس طرح، جیسے کہ پچھلے تین سال میں ہوتا رہا ہے، قوم کی ہر نتیجہ خیز جد و جہد بند کی جا سکتی ہے۔ اس صورت کو گوارا کرنے کے معنی ہیں کہ ہر قومی کام چھوڑ دیا جائے۔ اور اس کا مان لینا تو ایک ناممکن سی بات کو مان لینا ہے۔

اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ اور بلا استثنا قانون کے مطابق عمل کرے گا۔ جمہوری ریاستوں میں بھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جب انسان کا ضمیر اسے قانون کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے جس ملک کی حکومت استبدادی یا غیر ذمہ دارانہ ہو ایسے موقعے بہت کثرت سے آتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی ریاست میں قانون اخلاقاً حق بجانب رہتا ہی نہیں۔

لبرل کہتے ہیں کہ "براہ راست سیاسی عمل حکومت مطلق سے ملتی جلتی چیز ہے، جمہوریت سے نہیں، اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت کو

فتح ہوا انھیں براہ راست سیاسی عمل کا یہ اصول چھوڑ دینا چاہیئے، یہ بات الجھے ہوئے خیالات اور مبہم عبارت کا ایک نمونہ ہے۔ کبھی کبھی یہ براہ راست سیاسی عمل مثلاً مزدوروں کی ہڑتال۔ قانونی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں غالباً صرف سیاسی کارروائیوں سے بحث ہے۔ جرمنی میں آجکل کس طرح کا عمل ممکن ہے؟ ہٹلر کی ذلت آمیز فرماں برداری یا کوئی انقلابی یا خلاف قانون کارروائی۔ جمہوریت کی وہاں اور کس طرح خدمت کی جا سکتی ہے؟

ہندوستانی لبرل اکثر جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں، مگر ان میں بہت سے اس کے قریب بھی جانا نہیں چاہتے۔ سر سی۔ پی رشو سوامی آئیر نے جو ہندوستان کے سب سے ممتاز لیڈروں میں سے ہیں، مئی ۱۹۳۴ء میں کہا تھا" کانگریس کا یہ مطالبہ کہ ایک دستور ساز مجلس طلب کی جائے عوام کی سوجھ بوجھ پر بہت زیادہ بھروسا کرنا ہے۔ اور ان لوگوں کے خلوص اور قابلیت کے ساتھ ظلم ہے جنھوں نے مختلف گول میز کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے۔ مجھے اس میں بہت شک ہے کہ دستور ساز مجلس اس سے کچھ بہتر کر دکھاتی" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوریت کا جو تصور سر شِو سوامی آئیر کے ذہن میں ہے وہ "عوام" سے ایک جدا چیز ہے اور ایسے "مخلص اور قابل" لوگوں کا اجتماع جنھیں برطانوی حکومت نے نامزد کیا ہو اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب موصوف وائٹ پیپر کی تجویزوں کو دعائیں دیتے ہیں، اس لئے کہ گو وہ ان سے "پورے طور پر مطمئن نہیں"، وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کا ساری کی ساری تجویزیں رد کر دینا عقلمندی کی بات نہیں،" ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت برطانیہ اور سر شِو سوامی آئیر کے درمیان پورا اتحاد عمل نہ ہو۔

کانگریس نے جب سول نافرمانی بند کر دی تو لبرل ظاہر ہے بہت خوش

ہوئے ۔ اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس حماقت آمیز اور خلاف مصلحت تحریک سے الگ اور دور رہنے پر انھوں نے اپنی عقلمندی کی داد بھی لینا چاہی "دیکھو ہم نے کہا تھا نا؟" وہ اکثر ہم سے کہا کرتے تھے۔ یہ دلیل بھی نرالی ہے چونکہ ہم لڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور لڑے بھی خوب تھے، ہم گرا دئے گئے اس لئے ہم کو یہ نصیحت کی گئی کہ کھڑا ہونا برا ہے۔ سب سے اچھی اور محفوظ چال پیٹ کے بل گھسٹنا ہے۔ آدمی اس طرح پڑا ہو تو نہ گرایا جا سکتا ہے نہ گر سکتا ہے۔

(۵۳)

پرانا اور نیا ہندستان

یہ ایک قدرتی اور لازمی بات تھی کہ قوم پرست ہندوستانیوں کو غیروں کی حکومت پر غصہ آئے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانی شعوری یا غیر شعوری طور پر سلطنت کے برطانوی تصورات کو تسلیم کرتے رہے۔ وہ اپنی دلیلیں انھیں تصورات پر قائم کرتے تھے، اور انھیں صرف ان کے چند خارجی نتائج پر اعتراض کرنے کی ہمت ہوتی تھی۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اور معاشیات کی جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نقطۂ نظر بالکل برطانوی ملوکیت کا تھا، اس میں ہماری پچھلی اور موجودہ خامیاں جتائی جاتی تھیں اور انگریزوں کے اوصاف اور ان کی بلند اقبالی۔ ہم حالات کی اس بگڑی تصویر کو کسی حد تک صحیح مانتے تھے، اور جہاں طبیعت اسے قبول نہ کرتی وہاں بھی ہم پر اس کا اثر ضرور پڑتا۔ پہلے تو ذہن کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی، کیونکہ ہم اور واقعات یا دلیلوں سے واقف ہی نہ تھے۔ اس لئے ہم نے مذہبی قومیت کے دامن میں پناہ لی اس خیال سے کہ کم سے کم مذہب اور فلسفہ کے میدان میں ہم کسی قوم سے ہیٹے نہیں۔ مصیبت اور ذلت میں ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے رہے کہ اگرچہ ہم میں مغرب کی سی ظاہری شان اور چمک دمک نہیں ہے پھر بھی ہم اس باطنی دولت کے مالک ہیں جو اصل چیز ہے جس کی قدر وقیمت بہت زیادہ ہے اور جس کا حاصل

نا بہت بہتر ہے۔ ایک طرف سوامی دویکا نند اور ان جیسے اور لوگوں نے،
سری طرف اس دلچسپی نے جو مغربی عالم ہمارے قدیم فلسفوں سے رکھتے تھے
ں پھر کسی قدر خود دار بنایا، اور گذشتہ زمانہ پر فخر کرنے کے جذبہ کو
دار کیا۔

آہستہ آہستہ ہم ان باتوں پر جو انگریز ہمارے ماضی اور موجودہ حالات
ے متعلق کہتے تھے شبہہ کرنے لگے ہم نے ان کی تنقید شروع کر دی لیکن اب بھی
راخیال اور عمل انگریزوں کے قائم کئے ہوئے تصورات کے دائرے میں محدود
۔کوئی بری بات ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ انگریزوں کی فطرت کے خلاف ہے ہندوستان
ے کوئی انگریز بدتمیزی کرتا تو یہ قصور برطانوی نظام کا نہ ٹھہرایا جاتا بلکہ اس شخص کا
ن برطانوی حکومت پر تنقیدوں کا مواد جمع ہونا لکھنے والوں کی اعتدال پسندی
ے باوجود ایک انقلاب کا کام کر گیا اور اس نے ہماری قومیت کی سیاسی اور
صادی بنیاد ڈال دی۔ دادا بھائی نوروجی کی تصنیف "ہندوستان کا افلاس
۔برطانوی فطرت کے خلاف حکومت" اور رمیش دت، ولیم ڈگبی وغیرہ کی کتابوں
قومیت کی نشو و نما میں ایک انقلابی عنصر پیدا کر دیا۔قدیم تاریخ ہند کی تحقیق کی
ں تو ایسے درخشاں دوروں کا انکشاف ہوا جن میں تہذیب و تمدن عروج
پہنچ گیا تھا، اور ان کا حال پڑھ کر ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ہمیں یہ بھی
وم ہو گیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے کارنامے اس سے بہت مختلف
جو ہم ان کی تاریخ کی کتابیں پڑھ کر سمجھا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ، معاشیات اور نظام حکومت کے متعلق انگریزوں
جو بیانات تھے ان کی ہم تردید کرتے رہے، لیکن اسی حلقہ کے اندر جو ان کے
ورات نے کھینچ دیا تھا۔جب نئی صدی شروع ہوئی تو مجموعی حیثیت سے

ہندوستانی قومیت کا یہ رنگ تھا۔ اب بھی لبرل جماعت، چند اور چھوٹی پارٹیوں اور اعتدال پسند کانگریسیوں کی ایک تعداد کا یہی حال ہے۔ ان کے جذبات وقتاً فوقتاً انھیں آگے بڑھاتے ہیں، مگر خیالات کے اعتبار سے ان کی زندگی انیسویں صدی میں بسر ہو رہی ہے۔ اسی کے سبب سے ہندوستان کی آزادی کا تصور کسی لبرل کے دماغ میں سما ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس تصور اور انیسویں صدی کے طرز خیال میں بنیادی اختلاف ہے، اور ان دونوں میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ لبرل یہ سوچتا ہے کہ وہ قدم بہ قدم اونچے عہدوں پر پہنچتا جائے گا اس کے سامنے جو مسئلیں پیش ہوں گی وہ زیادہ موٹی اور زیادہ اہم ہوتی جائیں گی حکومت کا دربار اسی طرح جما رہے گا بس اتنا فرق ہو جائے گا کہ صدر میں وہ خود رونق افروز ہوگا اور ایک گوشہ میں برطانوی فوج ادب سے کھڑی رہے گی کہ ضرورت کے وقت اس کی حفاظت کرے۔ لبرل کے نزدیک برطانوی سامراج کے اندر درجہ نوآبادی حاصل کرنے سے مراد یہ صورت حال ہے۔ یہ سادہ لوحی کا ایک خواب ہے جسے حقیقت کا روپ کبھی نصیب نہ ہوگا، کیونکہ انگریز حفاظت اسی وقت تک کریں گے جب تک ہندوستان غلام رہ کر حفاظت کی قیمت ادا کرے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ بات ہمارے عظیم الشان ملک کے لئے باعث ننگ ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ سر فریڈرک وائٹ، جو ہرگز ہندوستانی قومیت کے حامی نہیں ہیں، اپنی ایک تازہ تصنیف[لہ] میں لکھتے ہیں: وہ (یعنی ہندوستانی) اب تک سمجھتا ہے کہ انگلستان مصیبت میں اس کے آڑے آئے گا اور جب تک وہ اس خیال خام میں مبتلا ہے، وہ اس سوراج کی، جو کہ اس کا

لہ۔ The future of East and West

نصب العین ہے، بنیاد نہیں رکھ سکتا"۔ یہاں پر بظاہر مصنف کا اشارہ لبرل یا رجعت پسند اور فرقہ پرست ہندوستانیوں کی طرف ہے کیونکہ جب وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر رہے تھے تو انھیں لوگوں سے ان کا زیادہ سابقہ رہا ہوگا۔ کانگریس کا یہ عقیدہ نہیں ہے، اور جو دوسری ترقی پسند جماعتیں ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں۔ مگر سر فریڈرک کے اس خیال سے انھیں اتفاق ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کا یہ خیال خام نہ مٹ جائے اور ہندوستان مفروضہ مصیبت کا سامنا کرنے کو اکیلا نہ چھوڑ دیا جائے، تب تک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی برطانیہ کے فوجی تسلط کا بالکل دور ہو جانا ہندوستانی آزادی کا پہلا قدم ہوگا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انیسویں صدی میں تعلیم یافتہ ہندوستانی برطانوی تصورات کے قائل تھے حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے جوش دلانے والے واقعات اور تغیرات کے بعد بھی بعض لوگ اس دام فریب میں گرفتار ہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے حکمراں طبقے اپنی دولت، کامیابی اور اقتدار کی روایات کی بنا پر دنیا میں امرا کی شان رکھتے تھے۔ ان روایات کے سائے میں تربیت پانے سے ان میں امارت کے کچھ اوصاف اور کچھ خامیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم ہندوستانی اس بات سے تسلی حاصل کر سکتے ہیں کہ پچھلے پونے دو سال میں ہم نے انھیں اس اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے وسائل اور مواقع بہم پہنچائے۔ جیسا کہ پہلے بھی بہت سی نسلیں اور قومیں کر چکی ہیں، انگریز اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے اور اپنی سلطنت کو خدا کی حکومت سمجھنے لگے۔ جب تک ان کا یہ مرتبہ تسلیم کیا گیا اور ان کے دعوائے فضیلت کی تردید نہیں ہوئی وہ لطف و کرم سے کام لیتے رہے مگر بس یہاں تک جہاں تک — ان کا کوئی نقصان نہ تھا۔ لیکن ان کی

مخالفت حکومت الٰہی کی مخالفت تھی اور یہ صریحی کفر تھا جس کا توڑنا لازم ہو گیا۔

موسیو رآندرے ژیدنے انگریزی سیرت کے اس پہلو پر بہت دلچسپ طریقہ سے لکھا ہے[۱]:

"اقتدار اور دولت کی موروثی روایات نے رفتہ رفتہ ان میں ایک امارت کی شان پیدا کر دی اور وہ اس کے مدعی بن گئے کہ ان کی قوم کو حکومت کا خدا داد حق حاصل ہے۔ ان کا یہ زعم اس حالت میں بھی بڑھتا ہی گیا جب لوگ ان کے دعوائے فضیلت کی تردید کرنے لگے یہاں تک کہ پچھلی صدی کے آخری حصہ کے نوجوان ...... غیر شعوری طور پر سمجھنے لگے کہ ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہم واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اس طرز خیال پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں، کیونکہ اس سے انگریزوں کی نفسیات کے ایک باریک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تو سبھی نے محسوس کیا ہو گا کہ انگلستان سمجھتا ہے کہ اس کی مشکلات کا سرچشمہ خارجی اسباب میں ہر وہ ہر معاملہ میں یہی کہتا ہے کہ فلاں کی غلطی ہے، اور اگر یہ فلاں، اپنی اصلاح کرنے پر راضی ہو جائے تو انگلستان پھر خوش حال ہو جائے گا ..... ہر موقع پر انگریزوں کی اس جبلت کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کے بجائے کسی دوسرے کی اصلاح کریں!"

اگر اور ملکوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ عام رویہ تھا، تو ہندوستان میں یہ اور بھی زیادہ نمایاں رہا۔ ہندوستان کے مسئلے پر جس انداز سے انگریز

---

[۱] La crise Britannique au XX^e Siècle.

غور کرتے ہیں وہ ہمارے لئے کتنا ہی تکلیف دہ ہو مگر دلکشی سے خالی نہیں! ان کا راسخ عقیدہ ہے کہ وہ ہر حال میں حق پر ہیں اور ایک عظیم الشان فرض سے بہ خوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں، ان کی قوم خدا کی برگزیدہ قوم اور ان کی سلطنت دنیا کی بہترین سلطنت ہے۔ ان گنہگاروں کو جو اس سچے عقیدے کے منکر ہیں وہ غصہ اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرز خیال میں ایک مذہبی رنگ کی جھلک ہے۔ کلیسا کے قدیم محکمۂ احتساب کی طرح وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، وہ ہمیں نجات ضرور دلا کر رہیں گے۔ اس روحانی کاروبار سے انھوں نے ضمناً دنیاوی منافع بھی حاصل کیا، اور اس طرح ایک پرانی مثل کہ "ایمانداری سب سے زیادہ نفع کی چیز ہے" صحیح ثابت ہوگئی۔ ہندوستان کی ترقی کے معنی یہ قرار پائے کہ وہ برطانوی سلطنت میں کھپ جائے اور منتخب ہندوستانی ولایتی سانچے میں ڈھل جائیں۔ برطانوی نصب العین اور مقاصد کو ہم جتنا زیادہ اختیار کرتے اتنی ہی زیادہ ہم میں اپنے آپ پر حکومت کرنے کی صلاحیت تسلیم کی جاتی۔ جس وقت ہم یہ دکھا دیتے اور اس کا یقین دلا دیتے کہ ہم اپنی آزادی برطانیہ کی خواہشوں کے مطابق استعمال کریں گے اسی وقت آزاد کر دیئے جاتے۔

برطانوی حکومت کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی رائے میں ضرور اختلاف ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ مگر جب بڑے پائے کے انگریز عہدہ دار، یہاں تک کہ بعض وزیر ہند ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ حالات کی خیالی تصویریں کھینچتے ہیں اور بے بنیاد باتیں کہتے ہیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ چند ماہروں اور دوسرے لوگوں کے سوا ہندوستان کے متعلق عام انگریزوں کی لاعلمی

نہایت حیرت انگیز ہے جب وہ ٹھوس واقعات کو نہیں دیکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کی روح تک ان کی پہنچ کیونکر ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اس کے جسم پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ قبضہ جبر و تشدد کا تھا۔ وہ اس کی سیرت کو نہیں سمجھ سکے اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کبھی اسے آنکھ سے آنکھ ملا کر نہیں دیکھا کیونکہ ان کی نظریں بھری ہوئی تھیں اور اِس کی نظریں شرم اور ذلت سے نیچی تھیں۔ صدیوں کے سابقہ کے بعد بھی باہمی اجنبیت دور نہیں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے بیزار رہیں۔

اس افلاس اور ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت اور عظمت سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ قدیم روایات اور موجودہ مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا خمار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں "ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خط و خال میں پیدا کر دیا تھا' اس کے عجیب و غریب تصورات، نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقش ایک ایک کر کے اس کے چہرے پر ابھر آئے تھے"، اس کے شکستہ جسم سے روحانی عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی ہے۔ اس نے تاریخ کی طویل منزلیں طے کی ہیں اور اس سفر میں علم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے اسے بہت سے اجنبیوں سے سابقہ پڑا اس نے انھیں اپنے وسیع خاندان میں شامل کر لیا اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے سخت ذلتیں، اور مصیبتیں جھیلیں، اور عجیب عجیب تماشے دیکھے، لیکن اس لمبے سفر میں اول سے آخر تک اس نے اپنی پراچین تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا اس سے تقویت اور زندگی حاصل کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح وہ کبھی اوپر گیا کبھی نیچے آیا، اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا، گرا تو پستی کے گڑھے میں پاتال

تک پہنچا یا وجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے بوجھ کے جس نے اس کی کمر توڑ دی تھی، وہ اس روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں اس کے داناترین روشن ضمیر حکیموں نے اپنشد کے ذریعہ دی تھی۔ ان کے تیز ذہن جو تلاش حق کی خلش سے بے چین، ہمیشہ سعی و جستجو میں لگے رہتے تھے،۔ انھوں نے اندھے عقائد کے دامن میں پناہ نہیں لی، بے جان رسوم اور معمولات پر تکیہ نہیں کیا وہ اس لوک میں اپنی ذات کو تکلیف اور مصیبت سے بچانا اور پرلوک میں بیکنٹھ میں ٹھکانا نہیں چاہتے تھے بلکہ بصیرت اور معرفت کے طلب گار تھے "وہ مجھے مجاز سے حقیقت تک پہنچا دے' اندھیرے سے روشنی تک، موت سے حیات دوام تک[۵۱] " یہ گایتری منتر یہ علم اور بصیرت کی دعا" ان دعاؤں میں جو آجکل بھی لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے'

اگرچہ سیاسی اعتبار سے ہندوستانی روح اکثر منتشر رہی لیکن اس نے اپنے مشترک روحانی سرمائے کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اس کثرت میں وحدت کا رنگ جھلکتا رہا[۵۲]۔ تمام قدیم ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اچھائی اور برائی کا معجون مرکب تھا۔ لیکن اس کی اچھائیاں چھپی ہوئی تھیں اور انھیں تلاش کرنے کی ضرورت

۵۱۔ برہد آرنیک اپنشد، ۱، ۳، ۲۷

۵۲ " ہندوستان میں جو تضاد پائے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑا یہ ہے کہ اس کے اختلاف کی تہ میں ایک قومی اتحاد موجود ہے یہ جلد محسوس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہوا، جب اس اتحاد نے ملک میں سیاسی ربط پیدا کر کے اسے ایک واحد ہستی بنا دیا ہو۔ لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت ہے اور اتنی بڑی قوت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دائرے میں آ کر (بقیہ صفحہ ۲۵۷

تھی اور تنزل کے آثار کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی تیز، بے رحم دھوپ انھیں اور چمکاتی تھی۔

ہندوستان اور اطالیہ کی حالت کچھ ملتی جلتی ہے۔ دونوں پرانے ملک ہیں، اور ان کی تمدنی روایات کا سلسلہ بہت دور تک پہنچتا ہے البتہ اطالیہ ہندوستان کے مقابلہ میں کم عمر ہے، اور وسعت میں اس سے بہت کم ہے۔ دونوں میں سیاسی انتشار رہا مگر متحدہ ہند اور متحدہ اطالیہ کا تصور کبھی فنا نہیں ہوا، اور گوناگوں اختلاف کے باوجود اتحاد کا رنگ غالب رہا۔ اطالیہ کا اتحاد بڑی حد تک رومی اتحاد تھا، کیونکہ یہ عظیم الشان شہر ملک پر حاوی رہا تھا اور یہی اتحاد کا مرکز اور نشان تھا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا مرکز کوئی ایسا شہر نہیں تھا جو تمام ملک پر حاوی ہو۔ بنارس مشرق کا "شہر لازوال"[1] کہا جا سکتا ہے نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام مشرقی ایشیا کا۔ لیکن بنارس نے کبھی سلطنت کا کھیل نہیں کھیلا، نہ کبھی دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر کھپایا ہندوستانی تہذیب سارے ملک میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ ملک کا کوئی حصہ اس کا مرکز نہیں ٹھیرایا جا سکتا تھا۔ جنوب میں راس کماری سے، شمال میں بدری ناتھ اور امرناتھ تک، مشرق میں دوارکا سے مغرب میں پوری تک ایک ہی قسم کے خیالات جاری اور ساری تھے، اور اگر کسی جگہ پر خیالات کا تصادم ہوتا تو اس کی دھمک سارے ملک میں دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔

بقیہ صفحہ (۲۵۶)۔ وہ اس سے بہت کچھ متاثر ہوئے"۔ سر فرڈرک وائٹ: مشرق اور مغرب کا مستقبل" (انگریزی)۔

[1] ۔ رومی سلطنت کے زمانہ میں روم شہر لازوال کہلاتا تھا۔

جیسے اطالیہ نے مغربی یورپ کو مذہب اور تہذیب عطا کی اسی طرح ہندوستان نے مشرقی ایشیا کو یہ دولت بخشی اگرچہ چین قدامت اور عظمت میں اس سے کم نہ تھا۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ سیاسی اعتبار سے اطالیہ نحیف و زار تھا، یورپ کی رگوں میں اسی کا خون دوڑ رہا تھا۔

اطالیہ کے متعلق شاید مترنش[1] نے کہا تھا کہ وہ ایک "جغرافی اصطلاح" ہے بہت سے لوگ جو مترنش بننا چاہتے ہیں ہندوستان کی نسبت بھی یہی فقرہ کہتے ہیں، اور اتفاق سے دونوں براعظموں میں ان ملکوں کا محل وقوع بھی ایک ہی سا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ انگلستان اور آسٹریا کی مشابہت ہے اور بیسویں صدی کے انگلستان کا انیسویں صدی کے آسٹریا سے مقابلہ کیا بھی گیا ہے۔ انگلستان بھی اسی کی طرح متکبر اور مغرور اور بظاہر شاندار اور رعب دار ہے، مگر وہ جڑیں جن سے اسے قوت حاصل ہوتی تھی اب سوکھ رہی ہیں، اور اس عالی شان عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ملکوں کو بھی اپنی طرح مجسم تصور کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ عادت اور قدیم ایتلافات کا اثر ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھارت ماتا، مادر ہند، ایک خوب صورت خاتون کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو بہت بوڑھی ہیں مگر دیکھنے میں سدا جوان معلوم ہوتی ہیں، ان کی آنکھیں غم سے بھری اور دل حسرت و یاس سے معمور ہے، بدیسیوں کے ظلم سے نالاں ہیں اور اپنے بچوں کو مدد کے لئے پکارتی ہیں یہی تصور ہے جو لاکھوں آدمیوں کے جذبات کو ابھارتا ہے اور انھیں عمل اور ایثار پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں

---

[1] ۔آسٹریا کا مشہور مدبر، جو ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۸ء تک یورپ کی سیاسی زندگی پر حاوی رہا

زیادہ تر کسان اور مزدور بستے ہیں، اور وہ دیکھنے میں حسین نہیں ہیں، کیونکہ افلاس میں کوئی حُسن نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے تخیل کی خوب صورت خاتون کھیتوں اور کارخانوں کے ننگے اور کمر جھکے مزدوروں کی نمائندگی کرتی ہیں، یا ان لوگوں کی چھوٹی سی جماعت کی جو صدیوں سے غریبوں کو پیروں تلے روندتی اور ان کا خون چوستی رہی ہے جس نے انھیں ظالمانہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور ان میں سے بہتوں کو اچھوت تک بنا دیا ہے۔ ہم حقیقت پر تخیلات کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ واقعات کی دنیا سے بھاگ کر خواب و خیال کی دنیا میں پناہ لیں۔

لیکن ان مختلف طبقوں اور ان کی باہمی کشمکش کے باوجود ایک رشتہ تھا جو ان سب کو مربوط کئے ہوئے تھا، اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رشتہ کتنا مضبوط اور پائدار تھا۔ اس کی مضبوطی کا راز کیا تھا؟ یہ محض روایات اور جمود کی انفعالی قوت نہیں تھی، اگرچہ یہ قوت بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی جاندار اور جاں بخش جوہر کام کر رہا تھا کیونکہ اس نے قومی خارجی اثرات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ، اور ان داخلی اثرات کو جو اس میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے جذب کر لیا لیکن اپنی اس قوت کے باوجود وہ سیاسی آزادی کو محفوظ نہ رکھ سکا اور سیاسی اتحاد پیدا نہ کر سکا۔ ان چیزوں کو اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ ان کے لئے زحمت اٹھائی جائے۔ اگلوں نے حماقت سے ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور ہم اس غفلت کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں ہم شروع سے آخر تک دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم نصب العین میں سیاسی اور فوجی کامیابی کو کبھی وقعت نہیں دی گئی اور دولت اور دولت پیدا کرنے والے طبقے ہمیشہ حقیر سمجھے گئے۔ عزت اور دولت کا ساتھ نبھ نہیں سکتا تھا اور عزت کم سے کم

ظری طور پر ان لوگوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی جو ادنیٰ معاوضہ پر سماج کی
دمت کریں۔

پرانی تہذیب بہت سے سخت طوفانوں سے سلامت گذر گئی لیکن
رچہ اس کی ظاہری صورت قائم رہی اس میں باطنی حقیقت باقی نہیں رہی۔
جکل وہ خاموشی کے ساتھ مگر جی توڑ کر ایک نئے اور نہایت طاقتور حریف
ے مقابلہ کر رہی ہے یعنی مغربی سرمایہ داری کی "بنیوں والی تہذیب" سے
ں نئے حریف سے وہ شکست کھا جائے گی۔ کیونکہ مغرب اپنے ساتھ سائنس
یا ہے اور سائنس سے لاکھوں فاقہ کشوں کو روٹی ملنے کی امید ہے لیکن
ہاجنانہ تہذیب کے زہر کا تریاق بھی مغرب اپنے ساتھ لایا ہے، اور وہ اشتراکیت
ہے یعنی اتحاد عمل، اور عام مفاد کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کا اصول
رہمنوں کا جو پرانا خدمت کا نصب العین تھا، اس سے یہ کچھ زیادہ مختلف
ہیں۔ لیکن اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر طبقہ اور جماعت کو برہمن کا رتبہ دیا
جائے۔ ظاہر ہے کہ (یہاں برہمن کے مذہبی معنی مراد نہیں) اور طبقوں کی
فریق اور امتیازات مٹا دیئے جائیں۔ ممکن ہے ہندوستان جب اپنا
یا لباس پہنے، اور وہ تو پہننا ہی ہے اس لئے کہ پرانا پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے
و گیا ہے، تو اس کی تراش ایسی ہو کہ موجودہ حالات اور پرانی وضع دونوں کے
ساتھ نبھ سکے جو رنگ وہ اختیار کرے وہ ایسا ہونا چاہیئے کہ قدیم رنگ
یں کھپ جائے۔

(۵۴)

انگریزی حکومت کی کارگذاری

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگذاری کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی انگریز یا ہندوستانی اس لمبی کارگذاری کو ایک خارجی چیز ٹھیراکر اس پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈال سکے گا۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو نفسیاتی اور دوسرے غیر مادی عناصر کا تولنا اور ان کا اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوگا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے "ہندوستان کو وہ دیا ہے جو پوتے گذشتہ زمانہ میں کبھی اسے حاصل نہ تھا، یعنی ایک حکومت جس کا حکم اس ملک میں جو ایک برّاعظم سے کم نہیں ہر جگہ بے چوں چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔[1] اس نے قانون کی عملداری قائم کی ہے اور ایک نظام حکومت جو عدل پر مبنی اور کارپرداز ہے، اس نے ہندوستان میں نیابتی حکومت اور شخصی آزادی کے تصورات رائج کئے، اور "برطانوی ہند کو ایک واحد مفرد ریاست بناکر اس نے ہندوستانیوں میں سیاسی اتحاد کا احساس پیدا کیا"، اور اس طرح قومیت کی اس کے ابتدائی مدارج میں پرورش کی۔[1] یہ دعوے انگریزوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں اور بہت صحیح بھی ہیں، اگرچہ قانون کی عملداری

---

[1] یہ اقتباس ہندوستان کے دستور کی اصلاح کے متعلق جو مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی بنی تھی اس کی رپورٹ میں سے لئے گئے تھے۔

ور شخصی آزادیاں اب کئی برس سے دیکھنے میں نہیں آئی ہیں۔

ہندوستانی اس دور پر نظر ڈالتے ہوئے اور بہت سے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں، اور یہ جتاتے ہیں کہ غیروں کی حکومت نے ہم کو کیا کیا مادی اور روحانی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر مختلف ہے کہ وہی چیز جسے انگریز تعریف کے لائق سمجھتے ہیں اس کی ہندوستانی مذمت کرتے ہیں جیسے کہ ڈاکٹر آنند کمار سوامی نے لکھا ہے: "ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے عجیب خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی قوم پر جو سب سے بڑی زیادتیاں کیں وہی بظاہر نعمتیں معلوم ہوتی ہیں"

واقعہ یہ ہے کہ پچھلی صدی یا اس سے کچھ زیادہ میں ہندوستان کے اندر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ عالم گیر تھیں اور مشرق اور مغرب کے ملکوں میں یکساں ہوئی ہیں۔ مغربی یورپ میں اور اس کے بعد باقی دنیا میں صنعتی ترقی نے ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس اور ایک مضبوط مفرد ریاست پیدا کی۔ انگریز اس کی داد تو لے سکتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے مغرب کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھولا، اور ایک نوعیت کی صنعت اور سائنس کو یہاں پہنچایا۔ لیکن یہ کرنے کے بعد وہ صنعت کا گلا دبا کر اس کی ترقی روکے رہے جب تک کہ حالات نے انھیں مجبور نہیں کر دیا۔ ہندوستان پہلے بھی وہ مقام تھا جہاں دو مختلف تہذیبیں آکر ملیں، مغربی ایشیا کی اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب، جو اس کی اپنی تھی اور مشرق بعید تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب ذرا اور دور مغرب سے ایک تیسری اور پچھلی تہذیبوں سے زیادہ قوی لہر آئی، اور ہندوستان مختلف پرانے اور نئے تصورات کا مرکز اور میدان جنگ بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تیسری تہذیبی تحریک

فتحیاب ہوتی اور اس طرح ہندوستان کے کئی پرانے مسائل حل کر دیتی، مگر انگریز جنھوں نے اسے یہاں پر قدم جمانے میں مدد کی تھی اس کو اور آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے ہماری صنعت کو نشو ونما نہیں پانے دیا، اور اس طرح ہماری سیاسی ترقی میں بھی حائل ہوئے، اور تمام ملک میں انھیں نظام جاگیری یا اور جو بھی فرسودہ آثار ملے ان کا انھوں نے تحفظ کیا۔ انھوں نے ہمارے بدلتے اور کسی قدر اصلاح پذیر قانون اور رسموں کے ساتھ کچھ ایسا کیا کہ وہ جس حالت میں تھی اسی میں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور ہمارے لئے ان کی زنجیروں سے رہا ہونا مشکل کر دیا۔ ہندوستان میں بورژوا طبقے نے ان کی خوشنودی یا مدد سے فروغ نہیں پایا۔ لیکن ریل اور صنعت کی پیدا کی ہوئی اور چیزوں کو ایک مرتبہ رائج کرنے کے بعد پھر وہ اس گاڑی کا آگے چلنا اور تغیرات کا سلسلہ جاری رہنا بند نہیں کر سکتے تھے، ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ رکاوٹیں ڈالیں اور رفتار سست کر دیں، اور یہ انھوں نے بیں طور پر اپنے فائدے کے لئے کیا۔

"حکومت ہند کی شاہانہ عمارت اسی پختہ بنیاد پر قائم ہے، اور اس کا یقین کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۸ء سے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تمام مقبوضات برطانوی تاج کے زیر نگیں ہو گئیں، اس وقت تک ہندوستان نے جو تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اسے حاصل کرنا اس کی لمبی اور رنگا رنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی[ل]"۔ یہ دعویٰ ایسا واضح اور بیّن نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، اور یہ اکثر کہا گیا ہے کہ دراصل برطانوی حکومت قائم

ل۔ مشترک پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۳۴ء۔

ہونے کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہوگئی۔ لیکن اگر یہ بیان پورا پورا صحیح بھی ہوتا، تو اس کا مطلب موجودہ صنعتی دور کا پچھلے زمانہ سے مقابلہ کرنا ہوا پچھلے سو سال میں سائنس اور صنعت کی بدولت دنیا کے ہر ملک نے بے حساب تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے، اور ہم کسی ایسے ملک کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ترقی حاصل کرنا اس کی لمبی اور رنگا رنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی" چاہے اس کی تاریخ ہندوستان کے مقابلہ میں لمبی نہ کہی جاسکے۔ تو پھر کیا یہ ہماری بیکار کی کٹ حجتی اور کج فہمی ہو گی اگر ہم کہیں کہ اس صنعتی دور میں ہم بہرحال کچھ نہ کچھ میکانکی ترقی کر ہی لیتے، اور برطانوی حکومت کے بغیر بھی کر لیتے، اور در اصل اگر ہم اپنی حالت کا اور بہتیرے ملکوں سے مقابلہ کریں تو کیا ہم بغیر غلطی کے خوف کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ ترقی زیادہ ہوتی، کیونکہ خود انگریز اس ترقی کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے اس کے خلاف ہم کو جدوجہد کرنا پڑی ہ ریلیں، تار برقی، ٹیلیفون، لاسلکی، ان سے اور ایسی دوسری چیزوں سے برطانوی حکومت کی اچھائی اور فیض رسانی کو جانچنا درست نہیں۔ یہ اچھی چیزیں ہیں اور ضروری تھیں، اور چونکہ انگریز اتفاق سے انھیں پہلے پہل یہاں لائے، ہمیں ان کا احسان ماننا چاہئے۔ لیکن صنعتی نظام کے یہ پیش خیمے ہمارے یہاں بالخصوص اس لئے آئے کہ برطانوی حکومت مستحکم ہوجائے۔ یہ شرائین اور رشہ رگیں ہیں جن میں قوم کے خون کو دوڑنا چاہیے تھا، انھیں اس کی تجارت کو بڑھانا، اس کی پیداوار کو جگہ جگہ لے جانا، اور اس کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں میں نئی جان ڈالنا اور انھیں دولتمند بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ بالآخر ان سے کوئی ایسا نتیجہ نکلنے والا تھا، لیکن ان کی تنظیم اور ان سے کام لینے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ یعنی ملوکیت کی گرفت کو مضبوط کرنا اور

کو برطانوی مال کے لیئے قبضہ میں کرنا۔ اور یہ مقصد ان کی بدولت حاصل ہو گیا
میں صنعتی تنظیم اور نقل وحمل کے جدید ترین ذریعوں کا بالکل موافق ہوں، لیکن
کبھی کبھی ہندوستان کے میدانوں سے تیزی کے ساتھ گذرتے وقت مجھے ایسا
معلوم ہوا کہ یہ ریلیں جو ملک کو زندگی بخشتی ہیں، ایک طرح کی آہنی بیڑیاں اور
ہتکڑیاں ہیں جو ہندوستان کو جکڑے اور قید کئے ہوئے ہیں۔

جس تصور کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی اس
میں ریاست پولس کی عملداری ہے۔ حکومت کا کام یہ تھا کہ ریاست کی حفاظت
کرے اور باقی سب دوسروں پر چھوڑ دے۔ انگریزی مالیات کا موضوع بس
فوج کے اخراجات، پولیس، نظام حکومت، سرکاری قرضہ کا سود تھے شہریوں
کی معاشی اغراض کی نگرانی نہیں کی گئی، بلکہ انھیں انگریزی اغراض پر قربان
کیا گیا۔ سوائے ایک مٹھی بھر آدمیوں کے باقی سب کی تہذیبی اور دوسری
ضروریات کی مطلق پروا نہیں کی گئی۔ مالیات عامہ کے نئے تصورات جن کی
بدولت دوسرے ملکوں میں سرکاری خرچ سے ہر ایک کی تعلیم، عام صحت کی
ترقی، غریب اور کمزور دماغ والوں کی دیکھ بھال، مزدوروں کا بیمہ کہ
بیماری، بڑھاپے اور بے روزگاری کے زمانہ میں بالکل محتاج نہ ہو جائیں
اور دوسری باتوں کا انتظام کیا جاتا ہے، ہماری حکومت کی حد نظر سے بالکل
باہر تھیں۔ اس طرح کے کاموں کے لیئے جن میں خرچ ہی خرچ ہوتا ہی اس کے
یہاں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، کیونکہ اس نے جس اصول پر لگان مقرر کیے
تھے وہ بالکل الٹا تھا، جن لوگوں کی آمدنی کم تھی ان سے بڑی آمدنی والوں
کی بہ نسبت حساب سے بہت زیادہ لیا جاتا تھا، اور ملک کے تحفظ اور حکومت
کے محکموں پر اس کا خرچ بے انتہا تھا اور ساری آمدنی کو کھا جاتا تھا۔

انگریزی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی پوری توجہ ان باتوں پر صرف کرتی تھی جن کے ذریعے اس کا سیاسی اور معاشی تسلط بڑھتا تھا۔ باقی سب ضمنی تھا۔ اگر انھوں نے ایک نہایت طاقتور مرکزی حکومت تعمیر کی اور پولیس کو بہت مستعد رکھا تو یہ ایک کارنامہ تھا جس پر وہ خود فخر کر سکتے تھے، لیکن ہندوستانی قوم اس کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ سکتی۔ اتحاد بڑی اچھی چیز ہے، مگر غلامی میں اتحاد کوئی فخر کی بات نہیں۔ ایک استبدادی حکومت کی طاقت لوگوں پر اور بھی گراں ہو سکتی ہے، اور پولیس اگرچہ وہ بے شک کئی اعتبار سے کارآمد ہوتی ہے، انہی لوگوں کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے، اور کی جا چکی ہے، جن کی حفاظت کرنا اس کا کام سمجھا جاتا ہے۔ برٹرنڈ رسل نے موجودہ اور قدیم یونانی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے حال ہی میں لکھا ہے: "یونانی تہذیب اگر ہماری تہذیب پر فضیلت رکھتی ہے تو اس لحاظ سے کہ اس کا پولیس کا نظام خراب تھا جس کی بدولت بھلے آدمیوں کی نسبتاً زیادہ بڑی تعداد اس سے بچ نکلتی تھی۔"

انگریزوں کا تسلط ہونے سے ہم کو امن ملا، اور ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد جو مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر ہمیں سہنا پڑیں ہندوستان کو بے شک امن کی ضرورت تھی۔ امن ایک قیمتی چیز ہے، ہر قسم کی ترقی کے لئے ضروری ہے اور ہمیں جب وہ حاصل ہوا تو ہم نے اس کی آؤ بھگت بھی کی۔ لیکن امن بھی بہت گراں داموں خریدا جا سکتا ہے، اگر وہ قبر کے کامل سکون، یا پنجرے یا قید خانہ کی قطعاً محفوظ زندگی کے برابر ہو جائے امن ایسے لوگوں کی اشک آلود مایوسی سے بھی پیدا ہو سکتا ہے جو اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ وہ امن جو کسی اجنبی فاتح نے جبراً قائم کیا ہو اصل

امن کی تھکن مٹانے اور تسکین دلانے والی صفات پا ہی نہیں سکتا جنگ ایک بڑی خوفناک چیز ہے، اور اس سے بچنا چاہیئے، لیکن چند اوصاف کو وہ ترقی دیتی ہے، جو نفسیات کے ماہر ویلیم جیمز کے مطابق وفاداری، ربط، استقلال، بہادری، ضمیر کی بیداری، تعلیم، جدت کا مادہ، کفایت شعاری اور جسمانی صحت اور قوت کے اوصاف ہیں۔ اسی سبب سے جیمز ایک اخلاقی محرک کی تلاش میں تھا جو لڑائی کا اندھیر ڈھائے بغیر کسی انسانی جماعت میں ان اوصاف کو ترقی دے۔ اگر اسے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی خبر ہوتی تو اسے ایک ایسی چیز مل جاتی جو اس کے دل کو لگتی، یعنی لڑائی کا ہم وزن اخلاقی اور پرامن محرک۔

تاریخ کے امکانات پر اور اس پر غور کرنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا تضیع اوقات ہے مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے لئے اچھا تھا کہ اس کا مغرب کی سائنس اور صنعت سے سابقہ پڑا۔ سائنس مغرب کی بڑی دین تھی، ہندوستان میں اسی کی کمی تھی اور اس کے بغیر اس کی حالت کا بد سے بدتر ہونا لازمی تھا جس طریقہ پر ہمارا ایک دوسرے سے سابقہ ہوا وہ قابل افسوس تھا، لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ جب تک ہم کو متواتر سخت صدمے نہ پہنچتے ہماری غفلت دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو پروٹسٹنٹ انفرادیت پسند، اینگلوسیکسن قوم کے انگریز ہمارے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، کیونکہ مغربی قوموں میں وہی ہم سے سب سے زیادہ مختلف ہیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ صدمے پہنچا سکتے تھے۔

انھوں نے ہمیں سیاسی اعتبار سے متحد کر دیا، اور یہ ایک بہت اچھی بات تھی، لیکن یہ اتحاد موجود ہوتا یا نہ ہوتا، ہندوستان میں قومیت

بڑھتی اور ایسے اتحاد کا مطالبہ کرتی۔ آجکل عرب کئی الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کر دئیے گئے ہیں، جن میں سے بعض آزاد ہیں، بعض کا کسی یورپی قوم نے اپنے آپ کو محافظ ٹھیرایا ہے، بعض کا کسی نے اپنے آپ کو نگراں اور اتالیق بنالیا ہے، یا ایسا ہی کچھ اور، لیکن عرب اتحاد کی خواہش سب میں موجزن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مغربی ملوکیت رستہ روکے نہ کھڑی ہوتی تو وہ اس اتحاد کو بڑی حد تک عمل میں لے آتے، لیکن ہندوستان کی طرح وہاں بھی ان مغربی ریاستوں کا مقصد یہ ہے کہ انتشار کے میلانات کو تقویت پہنچائیں، اقلیتوں کے مسائل پیدا کریں جو قومیت کے جذبہ کو کمزور کرتے اور ایک حد تک اس کا ردعمل ہوتے ہیں، اور ملوکیت پرست ریاست کو اس کا موقع دیتے ہیں کہ وہ قبضہ جمائے رہے اور غیر جانب دار پنچ بنی رہے۔

ہندوستان کا سیاسی اتحاد تو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان کا بس ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ بعد کو، جب یہ اتحاد جذبۂ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی جو ہماری آئندہ ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں، جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے۔

انگریزوں کو یہاں آئے اور تسلط حاصل کئے بھی کتنا زمانہ ہو گیا ہے۔ پونے دو صدی! وہ سیاہ و سپید کے مالک تھے، جیسے کہ استبدادی حکومتیں ہوا کرتی ہیں، اور ہندوستان کی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دینے کا انھیں ایک نایاب موقع ملا تھا۔ اس دوران میں ساری دنیا، انگلستان، یورپ، امریکہ، جاپان، سب اس قدر بدل گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جا سکتے

بحر اٹلانٹک کے ساحل کی وہ امریکی نوآبادیاں جن کی اٹھارویں صدی میں کوئی حیثیت نہیں تھی اب دنیا کی سب سے دولتمند اور طاقتور قوم ہیں اور صنعت میں سب سے آگے ہیں، جاپان میں ذرا سی مدت میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں، روس کی وسیع سرزمین میں، جہاں ابھی کل تک زار کی حکومت کا بھاری ہاتھ ترقی اور نشوونما کا گلا دباتا رہتا تھا، ایک نئی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بنائی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی تغیرات ہوئے ہیں، یہ ملک اب وہ نہیں ہے جو اٹھارویں صدی میں تھا۔ اب ہم ریلیں دیکھتے ہیں، آب پاشی کا انتظام، کارخانے، اسکول اور کالج، بڑے بڑے سرکاری دفتر وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان تغیرات کے باوجود، ہندوستان کی اس وقت کیا حالت ہے؟ ہندوستان ایک غلاموں کی ریاست ہے جس کی عظیم الشان قوت ایک پنجرے میں بند ہے، جس میں آزادی سے سانس لینے کی ہمت نہیں، جس پر اجنبی دور سے بیٹھے راج کر رہے ہیں۔ اس کے باشندوں سے زیادہ غریب کہیں کے باشندے نہیں، ان کی عمریں کم ہوتی ہیں اور ان میں بیماری اور وبا کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ یہاں جہالت کا دور دورہ ہے، بڑے بڑے علاقے ہیں جن میں صفائی اور طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں، متوسط طبقے اور عوام میں بے روزگاری بے پناہ ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ آزادی، جمہوریت اشتراکیت، اشتمالیت کے نعرے ناقابل عمل حوصلوں کے شیدائی، عقیدوں کے کٹر پرستار یا لفنگے لگاتے ہیں، اصل معیار لوگوں کی اجتماعی بہبودی ہے۔ بےشک سب سے اہم معیار یہی ہے، اور اس پر آجکل کا ہندوستان جانچا جائے تو اس کی قدر بہت ہی حقیر نکلے گی۔ دوسرے ملکوں میں بے روزگاری میں

امداد کرنے اور مصیبت زدوں کو سہارا دینے کے لئے جو بڑے انتظامات تجویز ہوئے ہیں ان کے متعلق ہم پڑھتے ہیں، لیکن ہمارے ملک میں جو کروڑوں بے روزگار ہیں اور جس طرح ملک کے بیشتر حصہ میں مصیبتیں گلے کا طوق بنی ہیں اس کے لئے کیا کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں کے متعلق ہم پڑھتے ہیں کہ رہنے کے لئے مکانوں کا بندوبست کیا جا رہا ہے، ہمارے یہاں ان کروڑوں کے رہنے کے لئے کیا سوچا جاتا ہے جو مٹی کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں یا جنھیں چھت کا سایہ بھی میسر نہیں؟ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے اگر ہم ایسے ملکوں پر رشک کریں جہاں تعلیم، صفائی، طبی امداد کے وسائل، مہذب زندگی کا سامان اور صنعتی پیداوار میں روزافزوں ترقی ہوتی ہے جب کہ ہم اسی ایک حال میں پڑے ہوئے ہیں یا بڑھتے ہیں تو گھونگے کی رفتار سے۔ روس نے کوئی بارہ برس کے مختصر سے عرصہ میں ایک حیرت انگیز کوشش کرکے اپنے وسیع ملک میں جہالت کا خاتمہ کر دیا اور ایک نفیس اور جدید ترین اصولوں پر مبنی طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس کا عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال کی رہبری میں ترکی جو پیچھے رہ گیا تھا لمبے لمبے ڈگ رکھ کر تعلیم کو عام کرنے میں دوسروں کے برابر پہنچ گیا ہے۔ فاششت اٹلی نے اپنے نئے مسلک پر پہلا قدم رکھتے ہی جہالت پر ایک زوردار حملہ کیا۔ وزیر تعلیم جنٹیلے نے اعلان کیا کہ "جہالت کی فوج کا قلب مارنا چاہیئے۔ اس ناسوری مرض کو جو ہمارے جسم سیاسی کو سڑا ڈالتا ہے۔ دہکتے ہوئے لوہے سے جلا کر دور کرنا چاہیئے" یہ بہت سخت الفاظ ہیں جنھیں کسی ڈرائنگ روم میں زبان پر لانا نامناسب ہوگا، لیکن یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بات کہنے والے میں جوش کتنا ہے اور اس کا عقیدہ کتنا پختہ ہے۔ ہم یہاں پر زیادہ شائستہ ہیں اور ہماری زبان شستہ اور نرم ہوتی ہے۔ ہم کمال

احتیاط سے قدم رکھتے ہیں اور ہماری ساری قوت کمیشنوں اور کمیٹیوں میں صرف ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ باتیں بہت کرتے ہیں اور کام کم۔ یہ الزام صحیح ہے۔ لیکن کیا انگریزوں میں کمیٹی اور کمیشن بنانے کی جو بیحد وحساب استعداد ہے اس پر ہم اپنی حیرت ظاہر نہ کریں، وہ کمیٹیاں اور کمیشن جن میں سے ہر ایک مدتوں محنت کرنے کے بعد ایک عالمانہ رپورٹ شایع کرتا ہے، "ایک اہم سرکاری تالیف" جس کی حسب دستور تعریف کی جاتی ہے اور جو پھر حسب دستور کسی خانے میں رکھدی جاتی ہے، اس طرح کہ ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں، ترقی کر رہے ہیں، اور یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں ہیں وہیں پر رہتے ہیں۔ خود داری جو چاہتی ہے وہ بھی ہو جاتا ہے، اور مستقل اغراض وابستہ ہیں ان کا بال بیکا نہیں ہوتا اور وہ محفوظ رہتی ہیں دوسرے ملکوں میں اس پر بحث کی جاتی ہے کہ ترقی کیسے کریں۔ ہم روکنے اور بریک لگانے اور حقوق کا تحفظ کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ تیزی سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

سنہ ۱۹۳۴ء کی مشترک پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ میں مغل عہد کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ "شہنشاہ کی شان وشوکت رعایا کی غربت کا پیمانہ ہو گئی تھی" یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن کیا آجکل بھی ہم اسی پیمانہ سے نہیں ناپ سکتے؟ آپ آجکل کی نئی دہلی اور وائسرائے کے ٹھاٹھ اور صوبوں کے گورنروں اور ان کے دکھاوے اور نمائش کو کیا کہیں گے؟ اس کا پس منظر بھی وہی انتہائی اور حیرت انگیز غربت ہے۔ دونوں کو مقابلہ پر دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے، اور یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ حساس لوگ اسے کیسے گوارا کرتے ہیں

شہنشاہی عمارت کی روکار کے پیچھے ہندوستان کا جو منظر ہے اس پر افلاس ر ویرانی برستی ہے۔ سامنے تو جوڑ جاڑ کر اور لیس پوت کر کچھ حیثیت بنالی گئی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے بدقسمت متوسط طبقہ کے ادنیٰ لوگ ہیں جنھیں موجودہ زمانہ نظام حیات روز بروزنا اور بے بس کئے دیتا ہے۔ اور آگے بڑھئے تو مزدور ا جو بڑی تکلیف سے رہتے ہیں اور غربت کی چکی میں پسے جاتے ہیں پھر ہمارا مان ہے، ہندوستان کا قومی نشان جس کی قسمت میں زندگی کو ایک سدا چھائی ئی رات کے اندھیرے میں گذارنا لکھا ہے۔

"صدیوں کے بوجھ سے جھکا ہوا
وہ اپنے پھاوڑے کی ٹیک لگائے زمین کو تک رہا ہے،
جُگوں کی محرومی اس کے چہرے پر نقش ہے۔
اور دنیا کا بار اس کی پیٹھ پر ہے۔

ہزاروں برس جو دُکھ سہے گئے ان کی جھلک اس ہیبت ناک شکل میں
ظر آتی ہے،
سارے زمانے کا الم اس دُکھتی اور جُھکی ہوئی کمر میں ہے۔
یہ بھیانک شکل اس نوعِ انسانی کی
جسے دغا دی گئی، جو لُٹی، رسوا ہوئی اپنے حق سے محروم کی گئی،
صدائے احتجاج ہے ان قوتوں کے سامنے جنھوں نے دنیا کو بنایا،
اور یہ احتجاج ایک پیشین گوئی بھی ہے۔" [1]

---

[1] یہ اقتباسات ایک امریکی شاعر مارک ہیم (E. Markham) کی نظم (بقیہ صفحہ ۲۷۳)

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا الزام انگریزوں پر لگانا جہل ہے۔ یہ ذمہ داری ہم کو اپنے سر لینا ہوگی اور ہمیں اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اپنی کمزوریوں کے لازمی نتائج کا دوسروں کے سر تھوپنا بہت بری بات ہے۔ ایک تحکم پسند نظام حکومت خصوصاً اگر وہ غیر ملکی ہو، لازمی طور پر غلامی کے جذبے کو ترقی دے گا اور محکوموں کے ذہن و نظر کو محدود کرنے کی کوشش کرے گا، یہ نوجوانوں کی بہترین صفات حوصلہ مندی من چلے پن، جدت طبع، تیزی اور طراری کو کچل ڈالے گا، اور بزدلی، کائیاں پن، کورانہ اطاعت، افسروں کو خوش رکھنے اور ان کی خوشامد کرنے کی خواہش کو بڑھائے گا۔ ایسا نظام سچے جذبۂ خدمت کو نہیں ابھارتا، قوم کی خدمت کا حوصلہ اور نصب العین کی محبت نہیں پیدا کرتا، بلکہ ان لوگوں کو چن لیتا ہے جن میں جوش قومی سب سے کم ہو اور جن کا مقصد صرف ذاتی ترقی ہو ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کو کس قسم کے آدمی ملتے ہیں! ان میں سے بعض تیز فہم ہوتے ہیں اور اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں کی طرف ڈھل جاتے ہیں اس لئے کہ اور کسی طرف جانے کا موقع نہیں ہوتا یہاں ان کی ساری تیزی جاتی رہتی ہے، وہ اس بڑی مشین کے پرزے بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کے ذہن اس مرہٹی گھس گھس میں پڑ کر کند ہو جاتے ہیں۔ ان میں دفتری حکومت کے خاص اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی "کلرکی قابلیت اور دفتری کام کی حکمت عملی"۔ بہت ہوا تو انھیں اپنے کام سے کچھ دھیمی سی محبت ہو جاتی ہے۔ سرگرمی اور جوش کا تو کوئی سوال ہی نہیں، کیونکہ غیروں کی حکومت میں

(صفحہ ۲۷۲ کا بقیہ) "پھاوڑے والے" سے لئے گئے ہیں۔

یہ چیز ناممکن ہے۔

ان کو چھوڑ کر، چھوٹے عہدہ دار عموماً کچھ قابل تعریف نہیں ہوتے کیونکہ وہ بس اپنے افسروں کی خوشامد کرنا اور اپنے ماتحتوں پر دھونس جمانا جانتے ہیں۔ اس میں ان کا قصور نہیں۔ یہ نظام حکومت انھیں تربیت ہی ایسی دیتا ہے۔ اگر اس فضا میں، خوشامد اور رعایت کا زور ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ ان لوگوں کا ملازمت میں کوئی نصب العین نہیں ہے۔ بے روزگاری اور اس کے ساتھ فاقہ کشی کا خوف بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا ہے، اور ان کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے عہدوں پر قرار رہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے اور نوکریاں حاصل کرلیں۔ جہاں جاسوس، اور وہ ذلیل ترین مخلوق، یعنی مُخبر ہمیشہ گھات میں لگے رہتے ہوں وہاں لوگوں میں عمدہ صفات کا نشوونما پانا آسان نہیں۔

حال کے واقعات نے، ان لوگوں کے لئے جو حسّاس طبیعت اور جذبۂ قومی رکھتے ہیں سرکاری ملازمت اختیار کرنا اور بھی دشوار کر دیا ہے حکومت ان کو پسند نہیں کرتی، اور وہ بھی جب تک معاشی حالات انھیں مجبور نہ کر دیں، حکومت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔

لیکن دنیا جانتی ہے کہ، برطانوی سامراج کا بار گورے آدمی سنبھالے ہوئے ہیں، نہ کہ کالے آدمی ہمارے یہاں سامراج کی روایات کو قائم رکھنے کے لئے متعدد امپیریل سروسیں ہیں، اور ان کے خاص حقوق کی حفاظت کے لئے کافی تحفظات ہیں، اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ سب ہندوستان کے مفاد کے لئے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کا مفاد اسی چیز پر موقوف ہے جس میں ان سروسوں کا صریحی فائدہ ہو۔ اگر انڈین سول سروس کا کوئی

خاص حق یا کوئی بڑا عہدہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے تو ایک شور مچ جاتا ہے کہ اس سے بدانتظامی اور بددیانتی پھیلے گی۔ انڈین میڈیکل سروس کے وہ عہدے جو گورے آدمیوں کے لئے مخصوص ہیں کم کر دیئے جائیں تو "ہندوستانیوں کی صحت عامہ کے لئے خطرہ پیدا ہوتا ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ اگر فوج کے اس حصے کو جس میں انگریز ہیں ہاتھ بھی لگایا گیا تو دنیا بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔

میرے خیال میں یہ ایک حد تک ٹھیک ہے کہ اگر اعلیٰ عہدہ دار سب یکبارگی چلے جائیں اور اپنے محکموں کو اپنے ماتحتوں کے حوالے کر دیں تو کارکردگی کا معیار گر جائے گا۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سارا نظام قائم ہی اسی ڈھنگ سے ہوا ہے اور ماتحت نہ تو قابلیت کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ہیں اور نہ کبھی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں قابل آدمی کثرت سے موجود ہیں اور اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو تھوڑے ہی سے عرصہ میں یہ لوگ کام کے بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری حکومت اور ہماری سماج کا نقطۂ نظر بالکل بدل جائے یعنی ایک نئی ریاست وجود میں آئے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم سے کہا جاتا ہے دستور میں چاہے جیسے تغیرات ہوں، ان بڑی سروسوں کا جو ہماری محافظ اور پشت پناہ ہیں یہ سنگین قلعہ بدستور قائم رہے گا۔ یہ سروسیں حکومت کے اسرار کی حامل ہیں وہ اپنے مندر کی پاسبانی کریں گی، اور نامحرموں کو اس حریم پاک میں قدم نہیں رکھنے دیں گی۔ رفتہ رفتہ، جوں جوں ہم اس عزت کے مستحق ہوتے جائیں گے وہ پردوں کو ایک ایک کر کے ہٹاتے جائیں گے یہاں تک کہ کبھی نہ کبھی وہ دن آئے گا جب آخری پردہ ہٹ جائے گا اور یکایک اس معبد کا اندرونی

ہمہ ہماری متحیر اور مودب نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

امپیریل سروسوں میں سب سے بڑا درجہ ہندوستانی سول سروس کا
ہے ، اور ہندوستان کی حکومت کو چلانے کی نیک نامی یا بدنامی اسی کے
حصے میں آتی ہے۔ اس سروس کے چند در چند اوصاف ہمیں بار بار سنائے جا چکے
ہیں ، اور سامراج کے نظام میں اس کو جو عظمت حاصل ہے ، وہ ضرب المثل ہو گئی
ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا مسلمہ اقتدار ، اُسے قریب قریب استبدادی
حکومت کے اختیارات حاصل ہونا اور پھر اس طرح آسمان پر چڑھایا جانا کسی فرد
جماعت کے ذہنی توازن کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ سول سروس کی میرے
دل میں جو قدر ہے اس کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی
حیثیت سے یہ حضرات بہت جلد اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جو پرانے
زمانے سے چلی آتی ہے اور آجکل اور بڑھ گئی ہے ، یعنی اپنی بڑائی کا
مالیخولیا۔

سول سروس کی خوبیوں سے انکار کرنا فضول ہے اس لئے کہ انھیں
بھولنے کا ہم کو موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ لیکن اس کی تعریف میں اتنی لغویاتیں
لکھی جا چکی ہیں اور کہی جا رہی ہیں کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے ذرا ان لغویات کی قلعی
کھول دی جائے۔ امریکی ماہر معاشیات وِبلن نے امتیازی حقوق رکھنے
والے طبقوں کو "داشتہ طبقے" کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور
دوسری امپیریل سروسوں کو "داشتہ سروسیں" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ
عیش ہمیں بڑا مہنگا پڑتا ہے۔

میجر گراہیم پول نے جو پارلیمنٹ کے سابق لیبر ممبر ہیں اور ہندوستان
کے معاملات سے بھی بہت دلچسپی رکھتے ہیں ، کچھ دن ہوئے "موڈرن ریویو"

میں لکھا تھا کہ "ابھی تک کسی نے اس سے انکار نہیں کیا کہ آئی سی ایس ایک نہایت قابل اور مستعد سروس ہے۔" چونکہ انگلستان میں ایسی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں اور مان لی جاتی ہیں، اس لئے اس قول پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اس طرح کے قطعی دعوے جن کی آسانی سے تردید ہوسکتی ہے، خطرے سے خالی نہیں، اور میجر گریہیم کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس بات سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ بارہا اس کا انکار کیا جا چکا ہے۔ بہت دن ہوئے مسٹر گوکھلے نے آئی سی ایس کو کھری کھری سنائی تھیں۔ آج بھی تمام ہندوستانی خواہ وہ کانگریسی ہوں یا نہ ہوں، میجر گریہیم پول کے اس قول کی تردید کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فریقوں کی رائے اپنی اپنی جگہ صحیح ہو ان کا اشارہ مختلف صفات کی طرف ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ سول سروس میں جو قابلیت اور مستعدی ہے وہ کس قسم کی ہے۔ اگر اس قابلیت اور مستعدی کا اندازہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کس حد تک مستحکم کی گئی، اور اسے ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کتنی مدد پہنچائی گئی تو بے شک آئی سی ایس والے یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن اگر معیار ہندوستان کے عوام کی بہبودی ہے تو وہ صریحًا ناکامیاب رہے، اور ان کی ناکامیابی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آمدنی اور معیار زندگی کے لحاظ سے ان میں اور عام لوگوں میں، جن کی خدمت کے لئے وہ رکھے گئے ہیں اور جن پر ان کی تنخواہوں کا بار پڑتا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس سروس نے ایک خاص معیار قائم رکھا ہے۔ یہ معیار لازمی طور پر اوسط درجہ کی قابلیت کا ہے، اگرچہ کبھی کبھی اس میں غیر معمولی لوگ بھی نکلے ہیں۔ اس قسم کی سروس سے اس سے زیادہ

توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اصل میں اس میں انگلستان کے پبلک اسکول کی اسپرٹ
مع اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے کام کر رہی ہے (اگرچہ اس وقت آئی سی ایس
کے بہت سے لوگ پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ نہیں ہیں) گو آئی سی ایس نے
ایک معیار قائم رکھا، مگر وہ مقررہ نمونے کے مطابق نہ ہونے کو سخت ناپ
کرتی تھی، اور اس کے افراد کی خاص صلاحیتیں کچھ تو ایک بندھے ہوئے ڈھ
میں پڑ جانے کی وجہ سے اور کچھ اس خوف سے کہ کہیں وہ دوسروں سے مختلف
نہ معلوم ہوں، ٹھٹھر کر رہ گئیں۔ اس میں بہت سے لوگ دل سے کام کرنے وا
تھے، بہت سے ایسے جن کے سامنے خدمت کا ایک نصب العین تھا، مگر
خدمت برطانوی سلطنت کی خدمت تھی، ہندوستان کا نمبر دوسرا تھا او
بہت بعد میں آتا تھا۔ اپنی تربیت حالات کے لحاظ سے سول سروس کا طرز عم
اس کے ساتھ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ وہ تعداد میں کم تھے اور انھیں
ایک غیر قوم سے سابقہ تھا جو اکثر ان کی مخالف رہتی تھی اس لئے انھوں نے
باہمی اتفاق، اور ایک خاص معیار قائم رکھا۔ اور چونکہ انھیں بڑی حد تک
مطلق العنانی حاصل تھی، انھیں ہر قسم کی تنقید ناگوار ہونے لگی، اسے گناہِ کبیرہ
لگے ان کی ناروا داری بڑھتی گئی، ان کا انداز معلّا نہ ہوتا گیا، اور ان میں غیر ذ
حاکموں کے بہت سے عیب پیدا ہو گئے۔ وہ خود پسند اور بر خود غلط تنگ نظ
اور بے لوچ ہو کر رہ گئے یعنی ایک ترقی پذیر ماحول سے انھیں بالکل مناسبت نہ
رہی جب ان سے زیادہ قابل اور ماحول سے مطابقت رکھنے والے دماغ ہن
کے مسئلے پر غور کرنے لگے تو انھیں بہت برا معلوم ہوا وہ ان لوگوں کو برا بھلا
لگے، انھیں دبانے لگے اور ان کے راستے میں ہر طرح کے روڑے اٹکانے
جب جنگ عظیم کے بعد کے تغیرات نے، دنیا میں ایک ہیجان اور حرکت پید

تو ان کی عقل چکرا گئی اور یہ نئے حالات سے نبٹنے کے قابل نہیں رہے ان کی محدود اور جامد تعلیم نے انھیں غیر معمولی موقعوں اور نئی صورتوں کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ ایک مدت تک غیر ذمہ دار رہنے سے ان کی عادتیں بگڑ گئی تھیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے وہ قریب قریب خود مختار تھے محض برائے نام برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت تھے لارڈ ایکٹن نے کہا ہے کہ "اقتدار آدمی کو بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار تو بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے"۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اپنی بساط کے موافق یہ لوگ بھروسے کے عہدہ دار تھے، جو اپنا روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اگرچہ اس میں کوئی خاص ذہانت نہیں پائی جاتی تھی، ان کی تربیت ہی ایسی تھی کہ اگر کوئی غیر متوقع صورت پیدا ہو جاتی تو وہ رہ جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی خود اعتمادی، ضابطہ پسند طبیعت، اور باہمی اتحاد کی بدولت فوری مشکلات پر قابو پا لیتے۔ عراق میں جو گڑبڑ ہوئی تھی اس نے ظاہر کر دیا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کتنی سست اور بھُس ہے اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں مگر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ سول نافرمانی کے روکنے کے لئے جو کارروائیاں حکومت نے کیں وہ بھی بہت بھونڈی تھیں۔ بندوق اور لاٹھی چلا کر مخالفوں کو تھوڑی دیر کے لئے دبا سکتے ہیں مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ خود وہ برتری کا احساس جس کا تحفظ مقصود ہے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان لوگوں نے ایک بڑھتی ہوئی جارحانہ قومی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا، کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ

تشدد سے کام لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا تھا اور معمولی حالت میں جو ضبط و استقلال ان میں نظر آتا تھا وہ اس وقت باقی نہیں رہا تھا، اکثر وہ بالکل بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی پبلک تقریروں میں ہسٹیریا کی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ کوئی نازک موقع آتا ہے تو بیرحمی سے وہ سب کی قلعی کھول دیتا ہے اور طبیعت کی گہرائیوں میں جو کمزوریاں چھپی ہوں انھیں سطح پر لے آتا ہے۔ سول نافرمانی ایسا ہی آزمائش کا موقع تھا، اور مورچے کے دونوں طرف، یعنی کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کے یہاں، ایسے لوگ بہت ہی کم تھے جو اس آزمائش میں پورے اُترے۔ مسٹر لائڈ جارج کہتے ہیں "نازک موقعوں پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورتیں جن میں واقعی اعلیٰ درجے کی قابلیت ہے بہت کم ہیں اور باقی لوگ ایسے موقعوں پر بے کار ہیں۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے تو وہ ٹیلے جو یوں خاصے بلند نظر آتے تھے، ڈوب جاتے ہیں، اور صرف سب سے اونچی چوٹیاں پانی کی سطح کے اوپر نظر آتی ہیں"۔

آئی سی ایس کے لوگ اپنے ذہن اور جذبات کے اعتبار سے اس طوفان کے لئے جو ہندوستان میں آیا بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کی اصل تعلیم کلاسیکی طرز پر ہوئی تھی، جس سے ان میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن یہ طرز پرانے زمانے کا تھا، جو عہد وکٹوریہ کے لئے موزوں تھا مگر موجودہ حالات سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنی ایک تنگ محدود دنیا، اینگلو انڈین دنیا میں رہتے تھے، جو نہ انگریزی تھی نہ ہندوستانی۔ وہ ان قوتوں کی قدر و قیمت کا جو اس عہد کی سماج میں کارفرما ہیں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ باوجود اس مضحک دعوے کے کہ وہ ہندوستان کے عام لوگوں کے ولی اور امین ہیں وہ

ان سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے اور نئے اوسط طبقے کے شہریوں سے اور بھی کم۔ وہ ہندوستانیوں کی سیرت کا اندازہ ان خوشامدیوں اور ملازمت کے خواستگاروں کو دیکھ کر کرتے جو انھیں گھیرے رہتے تھے، باقی سب کو مفسد اور شریر جان کر قابل التفات نہ سمجھتے۔ لڑائی کے بعد ساری دنیا میں جو تغیرات خصوصاً معاشی زندگی میں ہوئے، ان کا علم انھیں بہت ہی کم تھا۔ وہ اپنے اسی پرانے ڈھرے پر چلتے تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جس نظام کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں وہ اب فرسودہ اور بیکار ہو گیا ہے اور وہ ایک جماعت کی حیثیت سے وہی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جس کا نقشہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی تصنیف "کھوکھلے آدمی" میں کھینچا ہے۔

یہ فرسودہ نظام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ برطانوی سلطنت قائم ہے۔ اور اب بھی خاصی طاقت ور ہے اور اس کے چلانے والے قابل اور باتدبیر ہیں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اس دانت کی طرح ہے جو سڑ گیا ہے مگر مسوڑھوں میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اس سے درد ہوتا ہے مگر اسے اکھاڑنا آسان نہیں۔ یہ درد اسی طرح ہوتا رہے گا بلکہ اور بڑھتا جائے گا جب تک کہ دانت نکالا نہ جائے یا خود ہی نہ گر جائے۔

انگلستان میں بھی پبلک اسکول کے پڑھے ہوئے لوگوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب تک ملکی معاملات میں دخیل ہیں مگر اب ان کی وہ پہلی سی بات نہیں رہی ہندوستان میں وہ اور بھی زیادہ بے محل ہیں۔ جارحانہ قومی تحریک سے نبھانا ان کے لئے محال ہے اور سماجی انقلاب کی تحریک سے نبھانا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

بے شک آئی سی ایس میں بہت سے اچھے لوگ ہیں، انگریز بھی اور ہندوستانی بھی۔ لیکن جب تک موجودہ نظام قائم ہے ان کے یہ اوصاف ان مقاصد میں کام آئیں گے جو ہندوستانیوں کے حق میں مفید نہیں۔ سول سروس کے بعض ہندوستانی پبلک اسکول کے رنگ میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ وہ "بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کے حامی" بن جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں آئی سی ایس کے ایک نوجوان ہندوستانی سے ملا تھا جو اپنے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے مگر افسوس ہے کہ مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا انھوں نے سروس کے بہت سے اوصاف جتائے اور آخر میں برطانوی راج کی حمایت میں وہ دلیل پیش کی جس کا کوئی جواب نہیں، کہ کیا برطانوی راج رومی اور چنگیزی اور تیموری راج سے بہتر نہیں؟

آئی سی ایس والوں کے خیالات کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیتے ہیں اس لئے انھیں حق ہے کہ اپنے چند در چند مطالبات پر جتنا چاہیں زور دیں۔ اگر ہندوستان غریب ہے تو یہ اس کے معاشرتی رسم و رواج کا قصور ہے یا اس کے بنیوں اور ساہوکاروں، اور سب سے زیادہ اس کی بے شمار آبادی کا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے بنیئے یعنی برطانوی حکومت کو وہ چپ چاپ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ معلوم نہیں آبادی کی کثرت کا وہ کیا علاج کریں گے اس لئے کہ گو انھیں آئے دن کے قحط، وبا اور شرح اموات کی عام زیادتی سے بہت بڑی مدد ملتی ہے مگر پھر بھی آبادی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لوگ ضبط تولید کی تجویز پیش کرتے ہیں اور میں خود اس سے پوری طرح متفق ہوں کہ ضبط تولید کے طریقوں کے متعلق لوگوں کو معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ لیکن ان تدبیروں پر عمل ہونے کے لئے یہ ضروری

ہے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی بہت بلند ہو، ان میں تھوڑی بہت تعلیم پھیل جائے اور سارے ملک میں بے شمار اسپتال قائم ہوں۔ موجودہ حالات میں ضبط تولید کے وسائل عام لوگوں کی پہنچ سے بالکل باہر ہیں البتہ اوسط طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور میرے خیال میں بڑی حد تک اٹھا بھی رہے ہیں۔

لیکن آبادی کی کثرت کا مسئلہ دوسرے پہلو سے بھی غور و توجہ کا مستحق ہے۔ آجکل دنیا کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ غذا یا اور ضروریات کی کمی کا نہیں بلکہ اصل میں کھانے والوں کی کمی کا ہے یعنی حاجت مندوں میں خریدنے کی استطاعت نہ ہونے کا۔

دنیا سے قطع نظر، خود ہندوستان میں بھی غذا کی کمی نہیں اگرچہ آبادی بڑھ گئی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی کی رسد آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھی ہے اور بڑھائی جا سکتی ہے۔ اور پھر ہندوستان کی آبادی کا یہ اضافہ جس کا اس قدر شور ہے (بجز پچھلے دس سال کے) اکثر مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت کم رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آگے چل کر فرق بہت زیادہ ہو جائے گا، کیونکہ مختلف محرک مغربی ملکوں میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار کم کر رہے ہیں بلکہ روک رہے ہیں۔ لیکن ایسے اسباب ہندوستان میں بھی جلد پیدا ہو جائیں گے جو آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے۔

جب کبھی ہندوستان آزاد اور اس قابل ہو گا کہ اپنی نئی زندگی کو حسب دلخواہ تعمیر کرے، تو اسے لازمی طور پر اس کام کے لئے اپنے بہترین مرد اور عورتیں درکار ہوں گی۔ اچھے آدمی ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں اور ہندوستان میں اور بھی کمیاب ہیں اس لئے کہ برطانیہ کی حکومت میں ہمارے لئے مواقع کی کمی

رہی ہے ۔ ہم کو اپنے اجتماعی کاروبار کے کئی شعبوں میں غیر ملکی ماہروں کی ضرورت پڑے گی، خاص طور پر ان شعبوں میں جن کے لئے میکانکی یا علمی واقفیت درکار ہوتی ہے ۔ ان لوگوں میں جنھوں نے آئی سی ایس یا دوسری امپیریل سروسوں میں کام کیا ہے بہت سے ہندوستانی اور غیر ملکی ہوں گے، جو نئے نظام کے لئے مفید ہوں گے اور خوشی سے رکھے جائیں گے ۔ لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی نیا نظام اس وقت تک تعمیر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ آئی سی ایس کی روح ہمارے نظام حکومت اور سرکاری محکموں میں سمائی ہوئی ہے۔ تحکم پسندی شہنشاہی کی رفیق ہے اور آزادی کے ساتھ کسی طرح نہیں نبھ سکتی ۔ یا تو یہ آزادی کو مٹا کر رہے گی یا خود مٹا دی جائے گی ۔ یہ تو ریاست کے صرف ایک طرز میں کھپ سکتی ہے یعنی فاشستی طرز میں ۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور اسی قسم کی اور سروسوں کا موجودہ حالت میں باقی رہنا ناممکن ہے ۔ ان کو توڑے بغیر حقیقی معنی میں کوئی نیا نظام تعمیر ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ افراد کی حیثیت سے ان سروسوں کے لوگ اگر وہ نیا کام کرنا چاہتے ہوں اور کرنے کی استعداد رکھتے ہوں خوشی سے لے لئے جائیں گے، مگر نئی شرائط پر ۔ اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں یہ لمبی چوڑی تنخواہیں اور الاؤنس جو آج کل ملتے ہیں دئے جا سکیں گے ۔ نئے ہندوستان کی خدمت کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی جو مخلص اور مستعد ہوں، جو اپنے نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے حاصل کرنے کی دل وجان سے کوشش کرتے ہوں، جو کام اس لئے کرتے ہوں کہ اس سے مسرت اور عزت حاصل ہوتی ہے اس لئے نہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں ۔ روپئے کے لالچ کو جہاں تک ہو سکے کم کرنا پڑے گا میرا خیال ہے کہ سب سے کم مانگ اُن انتظامی افسروں کی ہوگی جو کسی قسم

کی فنی واقفیت نہیں رکھتے - ایسے لوگ ہندوستان میں بہت نکل آئیں گے -

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے یہاں کی لبرل پارٹی اور دوسری جماعتوں نے ہندوستان کے نظم و نسق کے معاملے میں برطانوی خیالات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا ہے سروسوں کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے، کیونکہ ان حضرات کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی رکھے جائیں یہ نہیں کہ ان سروسوں کی نوعیت اور ذہنیت اور ریاست کا سارا نظام بدلا جائے یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس میں دوسرے کی بات مان لینا ممکن نہیں، کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ صرف برطانوی فوج اور سروسوں کے چلے جانے سے حل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازموں کی تحکم پسندی مٹائی جائے اور ان کی تنخواہ اور امتیازی حقوق عام طور پر کم کئے جائیں اس دستور سازی کے زمانے میں تحفظات کا بڑا چرچا ہے - اگر یہ تحفظات ہندوستان کے فائدے کے لئے ہیں تو ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہونی چاہئے کہ آئی سی ایس اور اسی قسم کی دوسری سروسوں کی موجودہ صورت کا، جس میں انھیں غیر محدود اختیارات اور امتیازی حقوق حاصل ہیں خاتمہ کر دیا جائے اور انھیں نئے دستور میں کوئی دخل نہ ہو -

آئی سی ایس سے بھی زیادہ پراسرار وہ سروسیں ہیں جو محافظ سروسیں کہلاتی ہیں، ہم ان کے بارے میں زبان بھی نہیں ہلا سکتے اس لئے کہ بھلا ہم ان معاملات کو کیا جانیں ؟ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ چپ چاپ کروڑوں روپیہ دیے جائیں - تھوڑے ہی دن ہوئے، ستمبر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کمانڈر- ان چیف سر فلپ چیٹووڈ نے کونسل آف اسٹیٹ کے جلسے میں،

جو شملے میں ہو رہا تھا ہندوستان کے سیاست دانوں سے اپنی اکھڑ فوجی زبان میں کہا کہ تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو میرے کام میں دخل نہ دو کسی صاحب نے ایک رزولیوشن میں ترمیم پیش کی تھی ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا "کیا وہ اور ان کے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں جیسی جنگ آزمودہ قوم جس نے تلوار کے زور سے سلطنت حاصل کی، اور تلوار ہی کے زور سے اس پر اب تک قابض ہے آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کی باتوں کو اپنی صد یوں کی جنگی قابلیت اور تجربے کے مقابلے میں کوئی وقعت دے گی . . . ؟" اس کے علاوہ انھوں نے اور دلچسپ باتیں کہیں، اور اس خیال سے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ انھوں نے وقتی جوش میں یہ باتیں کہہ دی تھیں، ہم کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ انھوں نے اپنی تقریر بہت سوچ سمجھ کر لکھی تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر پڑھ رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف فن کے لیے کسی کمانڈر ان چیف سے فوجی معاملات پر بحث کرنا گستاخی ہے، لیکن دو چار باتیں کہنے کی اجازت تو آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کو بھی ملنی ہی چاہئے ممکن ہے کہ ان لوگوں کی اغراض جو سلطنت پر تلوار کے زور سے قابض ہیں، کچھ اور ہوں، اور ان غریبوں کی اغراض کچھ اور جس کے سر پر یہ تلوار منڈلاتی رہتی ہے۔ ہندوستانی فوج سے ہندوستان کے فائدے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور برطانوی سلطنت کے فائدے کا بھی اور ان دونوں کا مفاد کچھ ضروری نہیں کہ ایک ہو۔ اس میں اختلاف بلکہ تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھنے والا انتقاد اس بات میں بھی شبہہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ جنگ عظیم کے تجربے کے بعد، بڑے بڑے جرنیلوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے کام میں دخل نہ دیا جائے جائز ہے یا نہیں جنگ عظیم میں یہ حضرات سفید و سیاہ

کے مالک تھے اور ہر طرف سے یہی سننے میں آتا ہے، کہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن آسٹروی، اطالوی، روسی، غرض تمام فوجوں میں افھوں نے ہر کام کو چوپٹ کر دیا۔

انگلستان کی فوج کے نامور مورخ اور فن جنگ کے ماہر کیپٹن لول ہارٹ نے اپنی "جنگ عظیم کی تاریخ" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب انگریزی سپاہی دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور انگریز جرنیل آپس میں لڑ رہے تھے۔ قومی خطرے ان کے خیالات اور جد وجہد میں یک جہتی نہیں پیدا کر سکے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس لڑائی نے "ہماری بت پرستی کو، ہیرو ورشپ کے اس عقیدے کو کہ بڑے آدمی معمولی مٹی کے نہیں کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں بالکل مٹا دیا۔ لیڈروں کی اب بھی ضرورت ہے بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ، لیکن یہ احساس جو ہم میں اب پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں ہم کو اس غلطی سے محفوظ رکھے گا کہ ان سے بہت زیادہ توقع رکھیں یا ان پر حد سے زیادہ بھروسا کریں"

سیاست دانوں کے جگت گرو مسٹر لائڈ جارج نے اپنے "تذکرہ جنگ" میں جرنیلوں اور امیر البحروں کی ان کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے جس کی بدولت لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضایع ہوئیں۔ انگلستان اور اس کے اتحادی لڑائی تو جیت گئے، لیکن "خون میں نہا کر لڑکھڑاتے ہوئے فتح کی منزل تک پہنچے" بڑے افسروں نے آدمیوں اور موقعوں سے اس ناعاقبت اندیشی سے کام لیا کہ انگلستان کی تباہی کی نوبت آگئی تھی، اور وہ اور اس کے اتحادی زیادہ تر اس وجہ سے بچ گئے کہ ان کے حریفوں سے ان سے بھی زیادہ ناقابل یقین حماقتیں سرزد ہوئی ہیں" یہ ہے انگلستان کے عہد جنگ کے وزیر اعظم کا بیان۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں عمل جراحی کے ذریعے امیر البحر لارڈ جیلیکو کی کھوپری میں

نقول خیالات ٹھونسنے پڑے، خصوصاً بدرقہ جہاز بھیجنے کے معاملے میں۔ فرانسیسی
شل ژوفرے کے متعلق ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا خاص وصف
ی تھا کہ ان کی صورت سے مستقل مزاجی ظاہر ہوتی تھی اور اس سے لوگوں کی
مت بڑھتی تھی" پریشانی کے مارے ہوئے لوگ مصیبت کے وقت میں ایسی
ی چیزوں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انسان کی
عقل ٹھوڑی میں ہوتی ہے"۔

لیکن مسٹر لائڈ جارج نے سب سے زیادہ قابل الزام فوج کے افسر اعلیٰ فیلڈ مارشل ہیگ کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے واقعات سے ثابت کیا ہے کہ لارڈ ہیگ انتہائی خود پسندی کی وجہ سے سیاست دانوں اور دوسرے لوگوں کی رائے سننا بھی نہیں چاہتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے خود برطانوی مجلس وزرا سے بعض نہایت اہم معاملات پوشیدہ رکھے اور فرانس میں برطانوی فوج کو اتنا سخت نقصان پہنچایا جتنا ساری لڑائی میں کہیں نہیں پہنچا تھا۔ اور اس وقت بھی جب شکست سر پر کھڑی تھی، وہ آخر تک اپنی بات پر اڑے رہے، اور کئی مہینے تک انھوں نے پاشندیل اور کامبرے کی بے پناہ کیچڑ میں اپنی غلط پیش قدمی جاری رکھی، یہاں تک کہ ۷ ہزار تو صرف افسر کام آئے، اور چار لاکھ بہادر انگریزی سپاہی "مقتولوں اور مجروحوں" کی فہرست میں داخل ہو گئے۔ غنیمت ہے کہ "گمنام سپاہی" کی آج اس کے مرنے کے بعد عزت کی جا رہی ہے۔ اس کا خون پانی کی طرح بہایا گیا اور جب تک وہ زندہ تھا کسی کو اس کی پروا بھی نہ تھی۔

دوسرے لوگوں کی طرح سیاست داں بھی اکثر غلطی کرتے ہیں، لیکن جمہوری ملک کے سیاست دانوں کو اشخاص اور واقعات سے متاثر ہونا اور

ان کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ عموماً وہ اپنی غلطیوں کو محسوس کر لیتے ہیں اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔ سپاہی کی تربیت اور ہی فضا میں ہوتی ہے جہاں تحکم پسندی کا دور دورہ ہوتا اور تنقید گوارا نہیں کی جاتی۔ اس لئے سپاہی کو دوسروں کا مشورہ برا لگتا ہے، اور جب وہ غلطی کرتا ہے تو دل کھول کر کرتا ہے اور اس پر اڑا رہتا ہے۔ اس کے لئے ٹھوڑی ذہن اور دماغ سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے ایک مشترک ٹائپ پیدا کیا ہے۔ ہمارے ملکی نظام حکومت نے تحکم پسندی اور خود بینی کی ایک نیم فوجی فضا میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے ملکی حکام کی ٹھوڑی بھی بڑی حد تک سپاہیوں کی سی ہے اور اُن میں دوسرے سپاہیانہ اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ فوج میں ہندوستانی عنصر بڑھایا جا رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ تیس پینتیس برس کے بعد کوئی ہندوستانی جنرل بھی ہندوستانی اسٹیج پر نمودار ہو۔ شاید سو سوا سو سال میں ہماری فوج میں ہندوستانی عنصر ایک معقول حد تک بڑھ جائے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ آخر انگلستان نے ایک دو سال کے اندر کروڑوں آدمیوں کی زبردست فوج کیسے تیار کر لی۔ اگر اسے ہمارے جیسے دانا مشیر نصیب ہوئے ہوتے تو شاید اس نے زیادہ احتیاط سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھا ہوتا یہ اور بات ہے کہ اس اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے تیار ہونے سے پہلے لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا اسی کے ساتھ ہمیں روسی فوج کا بھی خیال آتا ہے جو کچھ دن پہلے صفر کے برابر تھی جس نے تھوڑی ہی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی، بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ان پر فتح پائی، اور اب دنیا کی سب سے جرار فوجوں میں سمجھی جاتی ہے۔ شاید انھیں مشورہ دینے کے لئے ایسے جنگ آزمودہ جرنیل نہیں ملے تھے!

اب ہمارے یہاں دہرہ دون میں ایک فوجی اکادمی ہے جہاں شریف
خاندانوں کے امیدوار فوجی افسری کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا
ہے کہ پریڈ میں وہ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً بہت اچھے افسر
ہوں گے۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس ٹریننگ سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے
اگر اس کے ساتھ جدید آلات جنگ کا استعمال بھی نہ سکھایا جائے۔ پیادے
اور سوار آجکل اتنے ہی کام آ سکتے ہیں جتنی رومی لشکر کی صفیں، اور ایسے
زمانے میں جب کہ ہوائی جہاز، گیس کے بم، ٹینک اور بڑی زبردست توپیں جنگ
کے آلات ہیں رائفل بھی تیر کمان سے کچھ ہی زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے۔ فوجی
اکادمی کے استاد اور دانشمند مشیران سب باتوں کو سمجھتے ہی ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگذاری کیسی رہی؟
ہم اس کی خامیوں کی کس منہ سے شکایت کریں جب یہ خامیاں ہماری اپنی کمزوریوں
کا نتیجہ تھیں۔ اگر ہم دنیا کے تغیرات کے دھارے کو چھوڑ کر کسی کھاڑی میں پناہ
لیں، اپنے قدح کی خیر منائیں اور اپنی حالت میں مگن رہیں گڑھیا کے مینڈک کی
طرح یہ نہ جانیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تو یہ ہمارا ہی قصور ہے اور ہمیں کو اس
کی سزا بھگتنی ہے۔ انگریز یہاں بحرِ ہستی کے ایک نئے سیلاب کے زور
میں، زبردست تاریخی قوتوں کے نمائندے بن کر آئے اگرچہ انھیں خود اس کا احساس
نہ تھا۔ اس سے کیا فائدہ کہ ہم اس طوفان کی شکایت کریں جو ہمیں اٹھا کر پھینک
دیتا ہے یا اس سرد ہوا کی جس سے ہمارا بدن کانپتا ہے؟ ہمیں چاہیئے کہ ماضی کے جھگڑوں
سے پیچھا چھڑا کر مستقبل کا سامنا کریں۔ ہمیں انگریزوں کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ وہ
سائنس اور اس کی بیش بہا ایجادات کا تحفہ اپنے ساتھ لائے۔ لیکن یہ بات ہمارے
دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے کہ برطانوی حکومت

ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند فرقہ پرست اور مطلب پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر شاید یہ بھی ہمارے لئے ایک ضروری آزمائش ہے اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے۔

(۵۵)

رسولِ مرحوم اور رسم الخط کا مسئلہ

میں تقریباً ایک ہفتہ پونا اور بمبئی رہکر وسط ستمبر ۳۳ء میں لکھنؤ واپس
والدہ ابھی تک اسپتال ہی میں تھیں، اور رفتہ رفتہ صحتیاب ہو رہی تھیں
بی لکھنؤ میں تھی، اور تیمارداری کی کوشش کرتی تھی حالانکہ خود اس کی
ت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، بہنیں ہر سنیچر کو الہ آباد سے آجاتی تھیں، میں دو
ہفتہ لکھنؤ ہی میں رہا، الہ آباد میں شاید اتنی فرصت نہ ملتی جتنی یہاں نصیب
ن میں دو بار اسپتال جایا کرتا تھا فارغ اوقات میں اخبارات کے لئے
مضامین لکھنا شروع کر دیئے جن کی اشاعت سارے ملک میں خوب ہوئی
سلسلہ مضامین کا عنوان تھا "ہندوستان کدھر جا رہا ہے" اور ان مضامین
میں نے واقعات عالم کا تعلق ہندوستانی حالات سے بتا کر ان واقعات کا جائزہ
تھا۔ یہ مضامین بہت مقبول ہوئے بلکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کابل اور
ن میں بھی ان مضامین کا ترجمہ فارسی زبان میں شایع کیا گیا۔ جو لوگ حالات
نرہ اور جدید مغربی افکار اور خیالات سے واقف ہیں ان کے لئے ان
امین میں نہ کوئی ندرت تھی نہ کوئی جدت۔ لیکن ہندوستان میں ہم لوگ اپنی
مشکلات اور مصائب میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں مطلق خبر نہیں

۷۔ قانونی شادی۔

کہ دوسرے ملکوں پر کیا گذر رہی ہے ۔ میرے مضامین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے نیز بہت سی اور علامتوں سے یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگوں میں بھی زیادہ وسیع نقطۂ نظر اب پیدا ہو رہا ہے ۔

والدہ اسپتال رہتے رہتے عاجز آ گئی تھیں اس لئے ہم لوگوں نے انھیں الہ آباد واپس لے جانے کا فیصلہ کیا، ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری بہن کرشنا کی نسبت کا اعلان حال ہی میں ہو چکا تھا اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ قبل اس کے کہ میں اچانک پھر جیل خانہ پہنچا دیا جاؤں جس قدر جلد ممکن ہو شادی سے فراغت کر لی جائے، مجھے بھی مطلق اس کا اندازہ نہ تھا کہ کتنے دن اور مجھے آزاد رہنے دیا جائے گا، اس لئے کہ کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک باقاعدہ جاری تھی، اور خود کانگریس اور اس کے علاوہ بیسیوں دیگر انجمنیں اور ادارے خلاف قانون قرار دیئے جا چکے تھے ۔

شادی اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں بمقام الہ آباد قرار پائی ۔ اور یہ بھی طے ہوا کہ مروجہ سول قانونِ نکاح کے مطابق عقد کیا جائے مجھے اس بات سے خوشی ہوئی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم لوگوں کے طے کرنے نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ دو مختلف ذاتوں یعنی برہمن اور غیر برہمن کے درمیان رشتہ قائم کیا جا رہا تھا اور برطانوی ہندی قانون کے مطابق یہ عقد جائز نہیں، لیکن خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں ایک نیا سول نکاح کا قانون بنا تھا، جس نے ہمیں تمام پریشانیوں سے بچا لیا ۔ اس وقت دو قانون رائج ہیں اور دوسرا قانون جس کے مطابق میری بہن کی شادی ہوئی، صرف ہندوؤں یا اس قبیل کے دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، جین اور سکھ مت والوں کے لئے ہے لیکن اگر فریقین کا شمار بوجہ پیدائش یا بوجہ تبدیلی دین ان مذاہب میں نہیں

سکتا تو پھر پہلے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ پہلا قانون فریقین سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام مشہور مذاہب سے انکار کریں یا کم زکم یہ بیان داخل کریں کہ ان کا کوئی تعلق ان سے نہیں ہے۔ یہ بلا ضرورت انکار ہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے اور اکثر لوگ جنھیں گو مذہبی نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ س قسم کا غیر ضروری اعلان کرنے پر معترض ہوتے ہیں اس قانون سے فائدہ ہیں اٹھا سکتے یا مختلف مذاہب کے کٹر لوگ ان تمام باتوں کی مخالفت کرتے یں جن سے آپس کے شادی بیاہ میں آسانیاں پیدا ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر یا تو انکاری بیان داخل کرتے ہیں یا محض حدود قانون میں رہنے کی خاطر صرف زبان سے تبدیلی مذہب کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ذاتی طور پر میں تو مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا حامی ہوں لیکن خواہ اس کی کوئی حمایت کرے یا نہ کرے یہ بے حد ضروری ہے کہ سول نکاح کا ایک عام قانون ہو جس کا اطلاق تمام مذاہب کے لوگوں پر ہو اور ان کو اجازت دی جائے کہ مذہب کی تبدیلی یا کسی دین کو ترک کرنے کا اعلان کئے بغیر آپس میں شادی بیاہ کر سکیں۔

میری بہن کی شادی بغیر کسی دھوم دھام کے نہایت سادے طریقہ پر ہوئی، ہندوستان میں شادیوں کے موقع پر جو بکھیڑا اور دھوم دھام ہوتی ہے وہ مجھے یوں بھی ناپسند ہے پھر والدہ بیمار تھیں اور علاوہ اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی میرے بہت سے ساتھی جیل خانہ میں تھے، ان حالات میں کوئی ایسی بات کرنا جس سے جشن کی صورت پیدا ہو بے موقع اور نامناسب تھی، صرف چند اعزا اور مقامی دوستوں کو میں نے شرکت کی دعوت دی حالانکہ میرے والد کے بعض قدیم دوستوں کو بجا طور پر یہ ملال بھی ہوا

کہ میں نے انھیں اس موقع پر عمداً نظر انداز کیا۔

شادی کے سلسلہ میں نیوتہ کا جو مختصر سا خط ہم لوگوں نے بھیجا وہ ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا تھا، یہ ایک جدت تھی اس لئے کہ نیوتے ہمیشہ یا تو ناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں، اور علاوہ فوجی یا عیسائی مشنری حلقوں کے کسی جگہ لاطینی رسم الخط میں ہندوستانی زبان لکھنے کا بالکل رواج ہی نہیں، میں نے تجربہ کے طور پر لاطینی رسم الخط اختیار کیا تھا محض یہ دیکھنے کے لئے کہ مختلف لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس نیوتے کے متعلق موافق اور مخالف دونوں طرح کی رائیں معلوم ہوئیں لیکن زیادہ لوگ مخالف ہی تھے، بہت تھوڑے لوگ بلائے گئے تھے اگر اور زیادہ لوگوں کو نیوتہ بھیجا جاتا تو مخالفت بھی اور زیادہ ہوتی۔ گاندھی جی نے بھی میری اس جدت کو ناپسند کیا۔

گو لاطینی رسم الخط مجھے ایک عرصہ سے پسند ہے لیکن نہ میں اس کا قائل ہوں اور نہ اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا تھا، ترکی اور وسط ایشیا میں اس کی کامیابی سے میں متاثر ضرور ہوا اور اس کی تائید میں دلائل بھی خاصے وزنی ہیں، لیکن اس کے باوجود میں اس کا حامی نہیں ہوں اور اگر میں اس کا قائل بھی ہوتا تو بھی میں خوب جانتا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کو اختیار کرنے کا ذرہ برابر امکان نہیں ہے۔ قوم پرست، مذہب پرست، ہندو مسلمان، قدیم اور جدید غرض ہر گروہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی جائے گی اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ یہ مخالفت محض جذباتی نہیں ہوگی۔ رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار

رہا ہے۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں، قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔ جس زبان میں کوئی ایسا ادب موجود نہیں کہ اس کی حفاظت کی ضرورت ہو وہاں البتہ یہ تبدیلی کر کے دیکھ لینا چاہیئے لیکن ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا نہ صرف اس لیئے کہ ہمارے ادب اور زبان کا خزانہ بے حد گرانقدر اور انمول ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہماری تاریخ اور ہماری ذہنی ترقی اس سے وابستہ ہے نیز عوام الناس کی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ زبردستی اس قسم کی تبدیلی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندہ زبان کو بے رحمی سے ذبح کرنا چاہتے ہیں جس سے عوام الناس کی تعلیمی ترقی بالکل مسدود ہو جائے گی۔

لیکن ہندوستان میں یہ مسئلہ اب صرف ایک علمی مسئلہ نہیں ہے اور میرے نزدیک رسم الخط کے اصلاح کے سلسلہ میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ سنسکرت کی مختلف شاخوں یعنی ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ ان زبانوں کے رسم الخط کی اصل ایک ہے اور ان میں بہت زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لینا زیادہ دشوار نہ ہوگا جس کی بدولت یہ چاروں زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔

منجملہ دیگر افسانوں کے ایک یہ افسانہ بھی ہمارے انگریز حکمرانوں نے تمام دنیا میں مشہور کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں کئی سو زبانیں (مجھے صحیح تعداد اس وقت یاد نہیں ہے!) رائج ہیں، اور یہ بھی ایک عجیب دلچسپ واقعہ ہے کہ بہت تھوڑے انگریز ایسے ملیں گے جو تمام عمر ہندوستان میں گذار

دینے کے باوجود ان سینکڑوں زبانوں میں سے ایک زبان بھی معمولی طور پر جانتے ہوں، یہ لوگ تمام زبانوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے ہیں اس کا نام ورناکولر یعنی غلاموں کی زبان رکھا ہے (لاطینی زبان میں 'ورنا' کے معنی ہیں خانہ زاد غلام) اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے بغیر جانے بوجھے اس اصطلاح کو اختیار کر لیا ہے واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ یہ انگریز لوگ ساری ساری عمر ہندوستان میں گذار دیتے ہیں لیکن ہماری زبان اچھی طرح سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، ان لوگوں نے خانساموں اور آیاؤں کی مدد سے ایک عجیب زبان ایجاد کی ہے، جو ایک طرح کی گٹ پٹ گورا شاہی ہندوستانی ہے یہ اسی کو اصل زبان سمجھتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کی طرز معاشرت اور زندگی کے متعلق وہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں کی باتوں سے حالات معلوم کرتے ہیں اسی طرح ہندوستانی زبان کے متعلق ان کی معلومات کا واحد ذریعہ گھر کے نوکر اور بیرے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اپنی زبان توڑ مروڑ کر صاحب لوگوں سے انھیں کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات چیت کرتے ہیں اس خیال سے کہ کوئی اور زبان صاحب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ انگریز لوگوں کو یہ بالکل معلوم ہی نہیں کہ ہندوستانی زبان میں نیز دیگر ملکی زبانوں میں ہر قسم کا اعلیٰ ادب موجود ہے۔

اگر ہمیں مردم شماری کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دو تین سو زبانیں ہیں تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں بھی پچاس ساٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن میں تو نہیں جانتا کہ کسی شخص نے بھی اس واقعہ کو جرمنی کے اندر اختلافات اور جھگڑوں کے ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ مردم شماری میں تو ہر قسم کی ان چھوٹی چھوٹی زبانوں کو بھی گنوا دیا جاتا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ

نہیں ہوتی، اور بسا اوقات ایک ہی زبان کی مختلف بولیوں کو جو مقامی طور پر بولی
جاتی ہیں محض علمی ترتیب کی خاطر اصل زبان کے درجہ میں شمار کر دیا جاتا ہے۔ ہندستان
کی وسعت اور رقبہ کو دیکھتے ہوئے مجھے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں اتنی کم
زبانیں کیوں ہیں۔ یورپ کے اسی رقبہ آبادی سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ
ہم لوگ یہاں باعتبار زبان ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب تر ہیں۔ لیکن
چونکہ بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیئے کوئی مشترکہ معیاری
زبان نہیں پیدا ہو سکی اور مقامی بولیاں رائج ہو کر رہ گئیں، برما کو چھوڑ کر ہندستان
کی خاص خاص زبانیں یہ ہیں :۔ ہندوستانی (جس کی دو شاخیں ہیں یعنی اردو اور
ہندی) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگو، ملیالم اور کناری اوڑ اگر اس میں
آسامی، اوڑیا، سندھی، پشتو، اور پنجابی کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس میں
پورے ملک کی زبانیں آجاتی ہیں سوائے چند پہاڑی اور جنگلی قبائل کی بولیوں کے
اس میں سے ہندی آریائی نسل کی تمام زبانیں جو شمالی مغربی اور وسطی ہند میں
بولی جاتی ہیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں البتہ جنوبی ہند کی ڈراوڑی
زبانیں گو بہت مختلف ہیں لیکن اس پر بھی سنسکرت کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ
بھی سنسکرت لفظوں سے بھری پڑی ہیں۔

مندرجہ بالا آٹھ خاص زبانوں کا ادب بہت قدیم اور گرانقدر ہے۔ اور
ان میں سے ہر ایک زبان آج ایک بہت وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے۔ ہر
لسانی علاقے کے حدود بھی متعین طور پر بتلائے جا سکتے ہیں، چنانچہ یہ زبانیں
بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے، دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شمار کی جا سکتی
ہیں۔ ۵ کروڑ آدمی بنگالی زبان بولتے ہیں، جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے
مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں پڑتے لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں

کے بولنے والوں کی تعداد ۴ کروڑ سے کم نہیں اس کے علاوہ اس زبان کے تھوڑا بہت سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے[۵] ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں، یہ سنسکرت

---

[۵] ۔ ہندوستانی زبان کے حامیوں نے حسب ذیل اعداد و شمار دیئے ہیں، مجھے صحیح نہیں معلوم کہ یہ اعداد ۳۱ء کی مردم شماری سے جمع کئے گئے ہیں یا ۲۱ء کی مردم شماری سے، لیکن میرا خیال ہے کہ ۲۱ء ہی کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں۔ اور اگر موجودہ اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو اس مرتبہ اور زیادہ اضافہ نظر آئے گا۔

ہندوستانی (بشمولیت ہندی پنجابی اور راجستھانی)	۱۳۹٫۲ ملین
بنگالی	۴۹٫۳ "
تلنگی	۲۳٫۶ "
مرہٹی	۱۸٫۸ "
تامل	۱۸٫۸ "
کناری	۱۰٫۳ "
اڑیا	۱۰٫۱ "
گجراتی	۹٫۶ "
میزان	۲۷۹٫۸ "

بعض زبانیں مثلاً پشتو، آسامی، اور برمی (جو لسانی اور مقامی دونوں اعتبار سے ایک بالکل مختلف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں) اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

زبان کی مستحکم بنیادوں پر قایم ہے اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ دونوں زبانوں کے خزانوں سے یہ مالامال ہو سکتی ہے اور اب تو کچھ عرصے سے انگریزی زبان سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے، جنوبی ہند میں صرف دراوڑی علاقہ ہی ایسا ہے جہاں ہندوستانی زبان تقریباً ایک اجنبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہاں کے لوگ اس کو سیکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ دو سال ہوئے ۱۹۳۲ء میں ایک انجمن نے جو محض خدمت کی غرض سے جنوبی ہند میں ہندی زبان پھیلانے کا کام کر رہی ہے چند اعداد و شمار شائع کئے تھے، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ ۱۴ سال کے اندر جب سے کہ وہ انجمن قایم ہوئی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ آدمیوں نے محض اس انجمن کی کوشش سے احاطہ مدراس کے اندر ہندی زبان سیکھ لی، ایک ایسے ادارہ کی کوشش جس کو سرکار کی طرف سے کوئی مدد نہ ملے بہت قابل تعریف ہے۔ اکثر لوگ جو ہندی زبان سیکھ لیتے ہیں وہ خود بھی اس زبان کی تبلیغ کا کام کرنے لگتے ہیں۔

بہر حال مجھے تو اس بارہ میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی زبان آگے چل کر پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی، اور سچ پوچھئے تو آج بھی معمولی کاموں کے لئے اس زبان کی یہی حیثیت ہے۔ لیکن فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے متعلق احمقانہ جھگڑوں کی وجہ سے اور فریقین کی اس غلط روش کی وجہ سے کہ ہر ایک یا تو اپنی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ضرورت سے زائد ٹھونستا ہے یا فارسی کے الفاظ، اس زبان کی ترقی رک گئی ہے، چونکہ اس جھگڑے کی وجہ سے بڑا غصہ اور گرمی پیدا ہوتی ہے اس لئے رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ جس خط میں وہ چاہیں لکھیں۔ لیکن یہ کوشش ضرور

کرنا چاہیئے کہ انتہا پسندی کے رجحانات کو رد کا جائے اور بول چال کی زبان جو عام طور پر رائج ہے اسی طرح کی ایک ملی جلی ادبی زبان پیدا کی جائے جب تعلیم عام ہوگی تب تو لازمًا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا، لیکن اسوقت متوسط طبقہ کے کچھ لوگ جو ادبی ذوق اور طرزِ انشا کے ناقد اور استاد سمجھے جاتے ہیں بد قسمتی سے بہت زیادہ تنگ نظر اور لکیر کے فقیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بس ایک مردہ قالب اور فرسودہ زبان کے محاوروں میں الجھے ہوئے ہیں جس میں نہ کوئی زندگی ہے نہ اپنی قوم کے عوام الناس کی زبان سے کوئی تعلق ہے اور نہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے کوئی واسطہ۔

ہندوستانی زبان کی ترقی اور رواج میں کوئی تصادم نہ ہوگا، ان میں بعض زبانیں ہندوستانی زبان کے مقابلہ میں پہلے ہی سے زیادہ ترقی یافتہ اور علمی حیثیت سے افضل ہیں، اور اپنے اپنے علاقے میں ان زبانوں کو تعلیمی اور دیگر کاموں کے لیے سرکاری زبان کی حیثیت برقرار رکھنا چاہیئے، انھیں زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور تمدن عوام الناس میں پھیلایا جا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ شاید انگریزی ہندوستان کی مشترکہ عام زبان بن جائے گی - لیکن مجھے تو یہ خیال بالکل دور از کار اور لغو معلوم ہوتا ہے، اعلیٰ طبقہ کے مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں میں ممکن ہے کہ یہ زبان رائج ہو لیکن جہاں تک کہ عوام الناس کی تعلیم اور ان کے تمدنی مسائل کا تعلق ہے انگریزی زبان ہمارے لیئے محض بے کار ہے یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی زبان کا استعمال کاروباری ضروریات علمی اور فنی کاموں میں اور بالخصوص بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں روز بروز بڑھتا جائے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لیئے بدیسی زبانوں کا جاننا ضروری ہے تاکہ دنیا کے حالات اور واقعات سے ہم لوگ باخبر رہیں اس لیئے

ں چاہتا ہوں کہ یونیورسٹیوں میں علاوہ انگریزی کے فرانسیسی، جرمنی، روسی
ینی، اور اطالوی زبانیں سکھانے کا بھی انتظام کیا جائے انگریزی زبان سے بے توجہی
رگز نہ برتی جائے، لیکن اگر واقعات عالم کے متعلق ہم صحیح رائے قائم کرنا چاہتے
یں تو صرف انگریزی کی عینک لگا کر نہ دیکھنا چاہیئے، ایک ہی پہلو اور ایک ہی
ہیجان فکر کو دیکھتے دیکھتے ہماری ذہنی اور دماغی صلاحیتیں بالکل چوپٹ ہوگئی ہیں
ور ہمارے بڑے سے بڑے جوشیلے قوم پرست مشکل ہی سے یہ محسوس کر سکتے
یں کہ ہندوستانی معاملات کے متعلق برطانوی نقطۂ نظر نے ہمارے لئے غور و فکر
کا میدان کتنا محدود اور تنگ کر دیا ہے،

بہر حال دوسری بدیسی زبانوں کو رواج دینے کی چاہے جو کوشش کی جائے
بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارا رشتہ اور تعلق یقیناً انگریزی زبان ہی کے ذریعہ قائم رہے گا
اور ایسا ہونا بھی چاہیئے گذشتہ کئی نسلوں سے ہم لوگ اس زبان کو سیکھنے کی
کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ہمیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی
ہے ہم لوگ سخت حماقت کریں گے اگر اس زبان کو بھلانا چاہیں یا اس سے پورا
پورا فائدہ نہ اٹھائیں یوں بھی انگریزی زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا
جو تمام دنیا میں پھیل گئی ہے، اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بازی لئے جا رہی
ہے۔ اور اگر امریکن زبان نے اس کی جگہ نہ لی تو اغلب یہ ہے کہ بین الاقوامی
تعلقات اور ریڈیو کی بات چیت میں اس کا رواج روز بروز بڑھتا جائے گا،
اس لئے ہم لوگوں کو چاہیئے کہ انگریزی زبان کی اشاعت کی کوشش برابر
جاری رکھیں، اس زبان کو جتنا اچھی طرح سیکھ سکتے ہوں سیکھنا اچھا ہے لیکن میرے
نزدیک یہ کوشش جو ہم میں سے اکثر لوگ کرتے ہیں کہ زبان کے نکات اور
باریکیوں کو سمجھیں تضیع اوقات ہے چند افراد اگر ایسا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں

لیکن ایک بہت بڑی تعداد کے سامنے یہ مقصد اگر رکھا جائے تو ان پر خواہ مخواہ کا ایک بوجھ ڈالنا ہوگا اور اس سے دوسری راہوں میں ترقی مسدود ہو جائے گی۔

مجھے "بنیادی انگریزی" (Basic English) بہت پسند آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ انگریزی زبان کی اس سہل کی ہوئی شکل کے سامنے بڑا اچھا مستقبل ہے۔ اور ہم لوگوں کے لئے یہ مفید ہوگا کہ بجائے معیاری انگریزی زبان (Standard English) کے یہ بنیادی انگریزی سکھلانے اور پڑھانے کا کام وسیع پیمانہ پر شروع کریں۔ معیاری انگریزی صرف محققوں اور خاص خاص طالب علموں کے لئے رہنے دی جائے۔

ذاتی طور پر میں اس کا بھی حامی ہوں کہ ہندوستانی زبان میں انگریزی اور دوسری بدیسی زبانوں کے الفاظ کو ہندوستانی بنا کر داخل کیا جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے یہاں جدید اصطلاحیں بالکل نہیں ہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ معروف الفاظ ہی کو اختیار کر لیا جائے بہ نسبت اس کے کہ نئے اور مشکل الفاظ سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں کے نکالے جائیں۔ خالص زبان کے حامی بدیسی الفاظ کے استعمال پر معترض ہوتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس میں لچک اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

بہن کی شادی کے بعد ہی مجھے اتفاق سے بنارس جانا پڑا۔ وہاں میرے پرانے دوست اور رفیق کار بابو شیو پرشاد گپتا تقریباً ایک سال سے بیمار تھے اور میں ان کی عیادت کی غرض سے وہاں گیا تھا۔ بابو صاحب لکھنؤ کے جیل

میں تھے کہ وہیں اچانک اُن پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اب رفتہ رفتہ مرض کا ازالہ ہو رہا تھا، بنارس کے اس سفر میں ایک چھوٹی سی ہندی ادبی انجمن نے مجھے ایک سپاسنامہ دیا اور اس انجمن کے اراکین سے میری بڑے مزے کی گفتگو رہی، میں نے پہلے تو معذرت کی کہ جس مضمون کو میں نہیں جانتا اس مضمون کے متعلق ماہرین کے سامنے بات چیت کرتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے مگر بالآخر میں نے اپنی چند تجاویز ان کو بتلائیں۔ اور میں نے مروجہ قدیم طرز کی ہندی پر اعتراض کیا جو اس وقت لکھی جاتی ہے جس میں یا تو سنسکرت کے مشکل الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے یا ایسی پر تکلف اور پیچیدہ زبان ہوتی ہے جس کو کوئی نہ سمجھے میں نے یہ خیال بھی جرات کر کے ظاہر کیا کہ اس درباری طرز انشا کو ترک کرنا چاہیے جس کے مخاطب صرف چند منتخب لوگ ہی ہو سکتے ہیں اور اب ہندی لکھنے والوں کو عوام الناس کے لئے لکھنا چاہیے اور ایسی زبان میں لکھنا چاہیے جس کو سب لوگ سمجھ سکیں عوام کے ساتھ تعلق پیدا ہو جانے سے زبان میں ایک طرح کی صداقت اور زندگی پیدا ہو جائے گی اور ادیبوں میں بھی عوام کی جذباتی قوت کا کچھ اثر آئے گا اور وہ زیادہ بہتر کام انجام دے سکیں گے اس کے علاوہ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندی مصنف مغربی افکار و خیالات اور ادب کا اور زیادہ مطالعہ کریں تو اس سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور یہ بھی مفید ہوگا اگر مغربی زبان کی مستند کتابوں کا نیز ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے جن میں جدید خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس نقطہ نظر سے ہندی کے مقابلہ میں جدید بنگالی، گجراتی اور مرہٹی زبانیں غالباً زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور یہ تو یقینی ہے کہ بمقابلہ ہندی کے بنگالی زبان میں تخلیقی کام اس زمانہ میں بہت کیا گیا ہے،

غرض ان مسائل پر دیر تک دلچسپ گفتگو اور بات چیت ہوئی اور پھر میں چلا آیا مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا کہ میری گفتگو اخبارات کو بھیج دی جائے گی لیکن کوئی صاحب جو وہاں موجود تھے انھوں نے ایک رپورٹ ہندی اخبارات میں بھیج دی ۔

پھر کیا تھا، ہر طرف سے میرے خلاف ہندی اخبارات میں ایک آفت مچ گئی کہ مجھے محض مغالطہ ہے میں نے کیوں ہندی زبان کو برا بھلا کہا، اور بنگالی گجراتی اور مرہٹی سے مقابلہ کر کے ہندی زبان کی تنقیص کی مجھے جاہل مطلق کہا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے میں واقعی جاہل ہوں ۔ اس کے علاوہ بھی بہت سخت سست الفاظ میرے متعلق کہے گئے تاکہ مجھے دبایا جائے اور میری زبان بند کر دی جائے ۔

میرے پاس تو اتنا وقت تھا نہیں کہ اس بحث و مباحثہ کو پڑھتا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ کئی مہینے تک یہ بحث جاری رہی یہاں تک کہ میں پھر جیل خانہ چلا گیا۔

اس واقعہ سے میری آنکھیں کھل گئیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندی ادیب اور اخبار نویس غیر معمولی طور پر زود رنج ہوتے ہیں، اور اگر ان کا کوئی بھی خواہ دیانتداری کے ساتھ تنقید کرے تو اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود کو ذلیل اور کمتر سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہیں، خود اپنی تنقید کرنے کا ان میں بالکل مادہ نہیں ، عام تنقید کا معیار بھی بہت پست ہے اور بالعموم یہ ہوتا ہے کہ مصنف اور اس کے نقاد میں جھگڑا ہونے لگتا ہے اور ایک دوسرے کی نیت پر حملہ کرتا ہے ان کی ساری ذہنیت وہی محدود اور تنگ بورژوا (سرمایہ دار) طبقہ والوں کی ذہنیت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

مصنف اور اخبار نویس دونوں یا تو ایک دوسرے کے لیے لکھتے ہیں، یا ایک مختصر سے حلقہ کے لیے، اور عوام الناس کو نیز ان کے وسیع مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مجھے اس پر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف بے کار اتنی محنت ضائع کی جا رہی ہے اور دوسری طرف اتنا وسیع میدان عمل موجود ہے جو مفید کام کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

ہندی ادب کا ماضی بہت شاندار رہا ہے، لیکن اپنے ماضی پر وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بھی بہت شاندار ہے اور ہندی صحافت اس ملک میں ایک بہت زبردست قوت بن سکتی ہے۔ لیکن جب تک کہ عوام الناس کو بے دھڑک مخاطب نہ کیا جائے اور رسمی زبان کی پابندیوں سے آزادی حاصل نہ کی جائے اس وقت تک نہ صحافت ترقی کر سکتی ہے نہ ادب،

(۵۶)

فرقہ پرستی اور رجعت پسندی

جس زمانہ میں میری بہن کی شادی تھی اسی زمانہ میں یورپ سے یہ خبر آئی کہ وٹھل بھائی پٹیل کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصہ سے بیمار تھے، اور اسی علالت کی وجہ سے ان کو قید خانہ سے رہا کر دیا گیا تھا۔ ان کی موت ہم لوگوں کے لئے ایک اندوہناک سانحہ تھا، اور یہ خیال کر کے دل اور بیٹھا جاتا تھا کہ ہماری جدوجہد ابھی جاری ہے اور ہمارے مقتدر رہنما ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں! وٹھل بھائی کی تعریف میں یوں تو بہت کچھ کہا گیا لیکن سب سے زیادہ تعریف اس بات کی کی گئی کہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں انھوں نے اپنی قابلیت کا سکہ جمایا اور اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہے۔ یہ تعریفیں اپنی جگہ بالکل درست تھیں لیکن جب بار بار ان کا ذکر کیا جاتا تھا تو مجھے اس سے چڑھ ہونے لگی کہ کیا ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کچھ کمی ہے جو اسمبلی کی صدارت کے فرائض قابلیت کے ساتھ انجام دے سکیں یا جو پارلیمنٹ کی رکنیت کے اہل ہوں! میں تو سمجھتا ہوں کہ لے دے کے صرف یہی ایک کام ہے جس کے لئے وکالت کے پیشہ نے ہم کو تیار کیا ہے اور میرے نزدیک وٹھل بھائی کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ بلند تھی، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک بہت بڑے سورما اور سپاہی تھے۔

نومبر کے مہینے میں مجھے بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ ہندو یونیورسٹی کے طلبار
نے مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی۔ میں نے اس دعوت کو قبول کرلیا اور ایک
بہت بڑے جلسہ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ کی
زیر صدارت میں نے تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں فرقہ پرستی کے
متعلق بہت کچھ کہا اور پرزور الفاظ میں ہر قسم کی ذہنیت کی مذمت کی بالخصوص
ہندو مہاسبھا کی حرکتوں کو میں نے بہت برا بھلا کہہ ڈالا لیکن میں نے جو کچھ کہا
اس میں پہلے سے سوچ بچار کو زیادہ دخل نہ تھا ایک مدت سے مختلف
جماعتوں کے فرقہ پرستوں کی روز افزوں رجعت پسندی کو دیکھ دیکھ کر مجھے
غصہ آتا تھا اور اس موضوع پر تقریر کرتے وقت جب مجھے جوش آیا تو قدرتاً
اس غصہ کا بھی کچھ اظہار ہو گیا۔ میں اس وقت ہندوؤں کے جلسہ میں تقریر کر رہا تھا
اس لئے مسلمانوں کے اعمال کی مذمت کرنے کا یہ کوئی موقع نہ تھا اور میں نے
قصداً صرف ہندو فرقہ پرستوں کی رجعت پسندی پر زیادہ زور دیا، مگر تقریر
کرتے وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ مالوی جی جلسہ کی صدارت کر رہے ہیں وہ ہندو
مہاسبھا کے رکن رکین رہے ہیں اس لئے ان کے منہ پر مہاسبھا کو یہ باتیں سنانا
ذرا نامناسب بات تھی۔ ممکن ہے کہ یہ خیال مجھے اس لئے نہ رہا ہو کہ اس زمانہ
میں انھیں مہاسبھا سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاسبھا
کے نئے تیز مزاج لیڈروں نے انھیں مہاسبھا سے نکال باہر کر دیا ہے جب تک
مالوی جی مہاسبھا کے روح رواں رہے اس وقت تک مہاسبھا باوجود اپنی
فرقہ پرستی کے سیاسی حیثیت سے رجعت پسند نہیں ہوئی تھی، لیکن بعد میں چلکر
اس کی رجعت پسندی سب کے لئے ایک مسلم اور امتیازی خصوصیت بن گئی تھی
اور مجھے اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ مالوی جی کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ

اس کو ناپسند کرتے ہیں، پھر بھی مجھے بعد میں یہ محسوس ہوا کہ میرے لئے یہ کسی طرح بھی مناسب نہ تھا کہ ان کی دعوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایسی باتیں کہوں جس سے وہ مخمصے میں پڑ جائیں، واقعی مجھے اپنی اس غلطی پر بڑا افسوس ہوا۔

ایک اور غلطی بھی مجھ سے سرزد ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ کسی شخص نے بذریعہ ڈاک مجھے ایک قرارداد کی نقل بھیجی اور لکھا کہ اجمیر میں ہندو نوجوانوں کی کسی انجمن نے اس کو پاس کیا ہے، یہ رزولیوشن بہت زیادہ قابل اعتراض تھا چنانچہ میں نے بنارس والی تقریر میں اس کا بھی حوالہ دے دیا حالانکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی انجمن نے اس قسم کا کوئی رزولیوشن (قرارداد) کہیں منظور نہیں کیا اور ہم لوگوں کو محض دھوکہ دے کر بے وقوف بنایا گیا۔

میری بنارس کی تقریر کی مختصر رپورٹ سے ایک ہنگامہ مچ گیا، اس میں شک نہیں کہ میں اس قسم کے شور و غل سننے کا عادی ہو گیا ہوں لیکن پھر بھی ہندو مہاسبھا کے رہنما تو اس بری طرح میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں حیران رہ گیا۔ زیادہ تر حملے ذاتیات پر کیے گئے، شاذونادر ہی کسی نے اصل معاملہ کی طرف توجہ کی۔ (یہ لوگ اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر گئے)۔ مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی اس لئے کہ انھوں نے مجھے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کا ایک موقع بہم پہنچا دیا۔ کئی مہینہ سے اس مسئلہ پر میں بھرا بیٹھا تھا یہاں تک کہ جیل خانہ میں بھی بہت بے چین رہا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس مسئلہ کو چھیڑا کس طرح جائے۔ اس کی کیفیت بھڑوں کے چھتے کی سی تھی اور اس چھتے کو چھیڑنے سے میں ڈرتا نہیں تھا پھر اپنے دل میں سوچتا تھا کہ ایسی بحثوں میں پڑنے سے کیا لطف آئے گا جس کا خاتمہ گالی گلوج پر ہو۔ مگر اب تو

ا موش رہنے کا کوئی موقع نہ تھا، چنانچہ میں نے ہندو اور مسلم فرقہ پرستی پر ایک
غمون لکھا جو میرا خیال ہے کہ بہت مدلل تھا اور اس میں میں نے ثابت کیا تھا
ںان دونوں میں سے کوئی حقیقی فرقہ پرستی بھی نہیں ہے بلکہ محض سیاسی
ور معاشرتی رجعت پسندی ہے جو فرقہ پرستی کے بھیس میں چھپ کر کام کر رہی
ہے۔ اتفاق سے میرے پاس فرقہ پرست لیڈروں کی تقریروں اور بیانوں کے
راشے موجود تھے جو میں نے بڑے پرانے پرانے اخبارات سے کاٹ کر جیل خانہ
کے قیام میں جمع کئے تھے، اور میرے پاس اتنا زیادہ مواد جمع ہو گیا تھا کہ ایک
اخباری مضمون کے لئے ان سب سے پورا فائدہ اٹھانا مشکل ہو گیا! ہندوستانی
اخبارات میں میرے اس مضمون کی بہت اشاعت ہوئی۔ اور تعجب کی یہ بات
ہے کہ فرقہ پرست ہندو اور فرقہ پرست مسلمان دونوں میں سے کسی کی طرف
سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا حالانکہ دونوں کے متعلق میں نے اس مضمون
میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہندو مہاسبھا کے رہنما جنھوں نے مجھے گالیاں تک
دی تھیں اب بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ مسلمانوں کی طرف سے صرف
سر محمد اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق میرے چند بیانات کی تردید
کرنے کی کوشش کی لیکن میرے دلائل کا کوئی جواب انھوں نے بھی نہ دیا۔
انھیں کو جواب دیتے ہوئے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک نمائندہ اسمبلی
(Constituent) منعقد کر کے تمام سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ
کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد میں نے ایک یا دو مضامین اور فرقہ پرستی پر لکھے۔ یہ
دیکھ کر کہ ان مضامین کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور جو لوگ ان مسائل پر خود
غور و فکر کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں انھوں نے بھی ان مضامین کو پسند کیا، مجھے
بڑی خوشی ہوئی۔ یہ تو بہر حال میں جانتا تھا کہ میں اپنی جادو بیانی کے زور سے

ان جذبات پر ہرگز قابو نہیں پا سکتا ہوں جو فرقہ پرستی کی تہ میں کام کر رہے ہیں
میرا مقصد تو صرف یہ اقرار کرانا تھا کہ فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ
ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ
کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی اور سیاسی سے بھی زیادہ معاشرتی
اصلاح اور ترقی کے دشمن ہیں ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی
عوام الناس کے فائدے کے لئے نہیں ہے ان مطالبات کی غرض صرف یہ ہے
کہ اعلیٰ طبقہ کے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ میرا تو قصد تھا کہ اس سلسلۂ مضامین
کو جاری رکھوں لیکن جیل خانہ نے مجھے پھر بلا لیا، ہندو مسلم اتحاد کی جو کوششیں
بار بار کی جاتی ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ مفید ضرور ہیں لیکن میرے نزدیک
اس وقت تک ان کوششوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک کہ اختلافات
کے اصل اسباب و وجوہ سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے گی، بعض ناسمجھ اسی دھوکہ میں
ہیں کہ محض ہندو مسلم اتحاد پکارنے اور رٹنے میں کوئی ایسا جادو ہے کہ اتحاد
آپ ہی آپ ہو جائے گا۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے فرقہ وارانہ معاملات میں برطانوی حکومت
کا جو طرز عمل رہا ہے اس کی تاریخ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی۔ میرے خیال میں
(حکومت) کے اس طرز عمل کا بنیادی اصول اور مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ہندو
مسلمانوں کو اتحاد عمل سے روکا جائے اور ایک جماعت کو دوسرے کے خلاف
کھڑا کیا جائے ۱۸۵۷ء کے بعد بمقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں پر برطانیہ کا ہاتھ
زیادہ صاف ہوتا رہا مسلمانوں کے دل میں حکومت کی یاد ابھی تازہ تھی، اور وہ
مقابلتہً ذرا زیادہ جنگجو اور لڑاکو بھی سمجھے جاتے تھے، اس لئے حکومت بھی ان کو
زیادہ خطرناک سمجھتی تھی، مسلمانوں نے جدید تعلیم سے بھی کنارہ کشی اختیار

رہی تھی اس لئے سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ کم تھا ان تمام وجوہ سے ان کے متعلق حکومت کو طرح طرح کے شبہات اور خطرات تھے برخلاف اس کے ہندوؤں نے زیادہ شوق سے آگے بڑھ کر انگریزی زبان سیکھی اور کلرکی کی ملازمتیں حاصل کیں اس سے حکومت نے یہی اندازہ کیا کہ ہندو زیادہ آسانی سے قابو میں آسکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ دور آیا کہ اعلیٰ طبقہ کے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں جدید قسم کی ذہنیت پیدا ہونا شروع ہوئی ، اور چونکہ تعلیمی حیثیت سے مسلمان پیچھے رہ گئے تھے اس لئے قدرتاً صرف ایک خاص طبقہ کے ہندوؤں ہی تک جذبۂ وطنیت محدود رہا ، اس وطنیت کا اظہار نہایت ہی ملائم اور حددرجہ خوشامدانہ الفاظ میں ہوا کرتا تھا لیکن حکومت اس کو بھی پسند نہ کرتی تھی ۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب مسلمانوں کے سر پر ہاتھ رکھا جائے اور انھیں وطن پرستی کے اس نئے خطرہ سے علیحدہ رکھا جائے ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا انگریزی تعلیم کا نہ حاصل کرنا بجائے خود ان کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی ، لیکن رفتہ رفتہ اس رکاوٹ کا دور ہوجانا بھی یقینی تھا ، چنانچہ برطانیہ نے پوری دور اندیشی سے مستقبل کے لئے انتظام کرنا شروع کیا اور اس کام میں سرسید احمد خاں جیسی ممتاز شخصیت سے حکومت کو بڑی مدد ملی ۔

مسلمانوں کی ابتر حالت اور بالخصوص تعلیمی پستی کو دیکھ کر سرسید کو بڑا افسوس ہوا تھا اور یہ دیکھ کر بھی ان کو تکلیف ہوئی تھی کہ حکومت میں مسلمانوں کا کوئی اثر ہے نہ رسوخ ، اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح وہ بھی برطانیہ کے بہت بڑے مداح تھے اور یورپ کے سفر نے تو ان پر اور بھی گہرا اثر ڈالا

انیسویں صدی کے آخری پچاس سال کا وہ زمانہ ہے جب یورپ بلکہ یوں
کہنا چاہیئے کہ مغربی یورپ اپنی تہذیب اور ترقی کے شباب پر تھا اور بلاخوف
تردید ملکۂ عالم بنا ہوا تھا۔ اور جن خوبیوں کی بدولت اس کو یہ عظمت نصیب ہوئی
وہ بھی نمایاں طور پر منصۂ شہود پر تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنی موروثی املاک
اور جائدادوں پر قبضہ جمائے اطمینان اور چین سے بیٹھے تھے بلکہ اس میں برابر
اضافہ کرتے جاتے تھے۔ ان کو ذرہ برابر یہ گمان نہ تھا کہ ان کے مقابل کوئی اور
دعویدار بھی کبھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ آزاد خیالی کی ترقی کا عہد تھا اور ہر شخص ایک
عظیم الشان مستقبل کا یقین واثق رکھتا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں
کہ جو ہندوستانی وہاں اس زمانہ میں گئے وہ بھی ان حالات اور خیالات
سے متاثر اور مرعوب ہوئے۔ شروع شروع میں ہندو زیادہ تعداد میں گئے اور
پورے یورپ بالخصوص انگلستان کے مداح بن کر واپس لوٹے۔ لیکن رفتہ رفتہ
آنکھیں اس ظاہری دمک کی عادی ہونے لگیں، اور تحیر کا پہلا پردہ چاک ہوا
سرسید پر جو رعب اور اچنبھے کی کیفیت یورپ کے پہلے سفر میں طاری ہوئی
اس کا نمایاں ثبوت جا بجا ملتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں جب انھوں نے انگلستان کا
سفر کیا اور وہاں سے جو خطوط انھوں نے لکھے ان میں اپنے تاثرات کا ذکر
کیا ہے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔ "اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان
میں انگریزوں کی بداخلاقی اور ہندوستانیوں کو جانوروں سے بھی زیادہ
حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے نزدیک قابل معافی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم
لوگوں سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ایسا کرتے ہیں اور میرا تو خیال ہے کہ ہم لوگوں
کے متعلق جو رائے انھوں نے قائم کی ہے وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ انگریزوں
کی بیجا تعریف کئے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندوستانی خواہ اونچے طبقہ کے ہوں یا

نیچے طبقہ کے، سوداگر ہوں یا معمولی دوکاندار، تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل جب
ان کا مقابلہ تعلیم اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا
کہ وہی نسبت ہے جو ایک گندہ جانور کو ایک خوبصورت اور لائق انسان سے
ہوتی ہے انگریز اگر ہندوستانیوں کو بزدل اور جانور سمجھتے ہیں تو اُن کے
پاس اس کے وجوہ بھی ہیں .... جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے اور
ہر روز دیکھتا ہوں وہ ہندوستان کے باشندوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتا
وہ تمام روحانی اور مادی خوبیاں جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں اللہ تعالیٰ نے
یورپ کو اور بالخصوص انگلستان کو عطا فرمائی ہیں" لہ

یورپ اور برطانیہ کی اس سے زیادہ تعریف کوئی انسان نہیں کرسکتا
اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید بہت زیادہ مرعوب اور متاثر
ہوگئے تھے موازنہ اور تقابل کے لئے جو شدید الفاظ انھوں نے استعمال کئے
اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ اپنی قوم کو غفلت کی نیند سے جھنجوڑ کر اٹھانا
چاہتے تھے اور شرمندہ کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ لوگ بھی ترقی کی طرف قدم بڑھائیں
لیکن اس میں شک نہیں کہ ترقی کا یہ قدم وہ مغربی تعلیم ہی کی طرف اٹھانا چاہتے
تھے اور انھیں یقین تھا کہ بغیر مغربی تعلیم کے ان کی حالت روز بروز کمزور اور
پست ہوتی جائے گی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری ملازمت
ملے۔ امن چین سے روزی ملے اعزاز اور رسوخ حاصل ہو، چنانچہ انھوں نے اس
قسم کی تعلیم کو رواج دینے کے لئے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں تمام تر

لہ - یہ مقولہ ہانس کون کی کتاب، مشرق کی تاریخ وطنیت، سے نقل کیا گیا ہے
Hans Kohn's Nationalism in the East.

توجہ وقف کردی ۔ وہ کسی دوسری طرف اپنی توجہ کو منتشر کرنا نہیں چاہتے تھے مسلمانوں کے جمود اور جھجک پر غلبہ پانے کا کام خود ہی بہت مشکل تھا۔ دوسری طرف بورژوا ہندوؤں کی کوششوں سے وطن پرستی کی جدید تحریک شروع ہو رہی تھی اس میں شرکت سے ان کے نزدیک انتشار کا ڈر تھا اس لئے انھوں نے اس کی مخالفت کی ہندو جو مغربی تعلیم میں نصف صدی مسلمانوں سے آگے تھے حکومت وقت پر نکتہ چینی کرنے کا مشغلہ تفریحاً کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے تعلیمی کاموں کو حکومت کے تعاون اور امداد کے بھروسے پر شروع کیا تھا اور اس لئے وہ کوئی ایسا قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کام کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ انھوں نے نوزائیدہ نیشنل کانگریس کو پس پشت ڈالدیا، ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت یہی چاہتی تھی اور اس نے ان کی پوری حمایت کی،

سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا، بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔

ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا اس لئے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ ان کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان "بورژوا" تحریک وطنیت میں شامل ہو جاتے۔

سرسید کی یہ تمام کارروائیاں جو بظاہر ہمیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ مسلمان ابھی تک اپنے خیالات کے اعتبار سے جمہوریت کے مخالف اور منصب داری نظام کے حامی تھے برخلاف اس کے ہندوؤں میں جو متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا یورپ کے آزاد خیال لوگوں سے متاثر تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک سے ایک بڑھ کر اعتدال پسند تھے اور دونوں حکومت برطانیہ کے وابستگان میں تھے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ تھا کہ سرسید کا اعتدال زمیندار طبقہ کا اعتدال تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں تھوڑے بہت صاحب حیثیت لوگ جو رہ گئے تھے وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہندوؤں کا اعتدال ایک ہوشیار پیشہ ور یا کاروباری آدمی کا اعتدال تھا جو اپنی تجارت کی ترقی اور سرمایہ کو لگانے کے لئے راستہ نکالنا چاہتا ہے، ہندو مدبرین کی نظریں ہمیشہ گلیڈ اسٹون اور برائٹ وغیرہ کی طرف اٹھتی تھیں، اس لئے کہ انگلستان کے آزاد خیال گروہ کے یہی چشم و چراغ ہیں۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، یہ غالباً انگلستان کے قدامت پرست گروہ "ٹوریز" اور طبقہ امرا کے زیادہ قائل اور مداح تھے، گلیڈ اسٹون نے چونکہ ترکی کی اور ارمنی قتل عام کی مذمت کی تھی اس لئے گلیڈ اسٹون کو مسلمان ہوا سمجھے تھے اور ڈسرائیلی چونکہ ترکی سے کسی قدر ہمدردی رکھتا تھا اس لئے ان معاملات سے دلچسپی لینے والے مسلمان جن کی تعداد بہت تھوڑی تھی ذرا ڈسرائیلی کے طرفدار تھے۔

سرسید کی بعض تقریروں کو اگر آج پڑھا جائے تو بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں دسمبر ۱۸۸۷ء میں انھوں نے لکھنؤ میں ایک تقریر کی نیشنل کانگریس

کا سالانہ اجلاس بھی اسی زمانہ میں ہو رہا تھا چنانچہ اس تقریر میں انھوں نے کانگریس
کے حد درجہ معتدل مطالبات پر بھی نکتہ چینی کی اور اس کی مذمت کی، سر سید
نے کہا کہ حکومت اگر افغانستان سے جنگ کرتی ہے یا برما پر قبضہ کر لیتی
ہے تو ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اس کے طرز عمل پر نکتہ چینی کریں...... اس
کونسل کے لئے وہ ہر صوبہ سے ایسے افسروں کا انتخاب کرتی ہے جو ملکی
انتظامات اور لوگوں کی حالت سے سب سے زیادہ واقف ہیں، اس کے
علاوہ کچھ رئیسوں کو بھی لیا جاتا ہے جو اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے اس مجلس
میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، کچھ لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ بجائے قابلیت
کے محض بلند مرتبہ کی وجہ سے انھیں کیوں منتخب کیا جائے، میں ہی آپ سے
پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے امرا اور روسا کا طبقہ اس کو پسند کرے گا کہ ایک
نیچ ذات یا ایک بے نام و ننگ خاندان کے کسی آدمی کو خواہ وہ بی اے
ایم اے ہی پاس کر لے اور اس میں تمام قابلیتیں بھی کیوں نہ موجود ہوں کیا
ایسا اختیار اور رتبہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ان پر حکومت کرے اور اس کو
ایسے قوانین بنانے کا اختیار بھی حاصل ہو جس کا اثر ان کی زندگی اور املاک
پر پڑے؟ ہرگز نہیں!......... سوائے اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے
اور کسی شخص کو وائسرائے بہادر اپنا رفیق کار نہیں بنا سکتے نہ اس سے
برادرانہ تعلقات رکھ سکتے ہیں نہ ایسی دعوتوں میں اس کو شریک کر سکتے
ہیں جہاں اس کو ڈیوک اور ارل طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا
ہو۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت نے قانون سازی کا جو طریقہ اختیار
کیا ہے اس میں وہ رائے عامہ کا کوئی لحاظ نہیں کرتی؟ اور کیا ہم یہ کہہ
سکتے ہیں کہ قانون بنانے میں ہم لوگوں کا کوئی نفع نہیں؟ میں دعوی کر

کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے“ ؎۱

ہندوستان میں ”جمہوریت اسلام“ کے ایک نمائندہ اور رہنما کے یہ خیالات ہیں! کیا اودھ کے تعلقدار یا صوبہ آگرہ بہار اور بنگال کے بڑے بڑے زمیندار بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی جرأت آج کر سکتے ہیں لیکن ایک بیچارے سرسید ہی اس قسم کے خیالات نہ رکھتے تھے خود کانگریس کی بہت سی تقریریں آج اگر پڑھی جائیں تو اتنی ہی عجیب معلوم ہوں گی، بہرحال یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا سیاسی اور معاشی پہلو یہ تھا کہ ہندوؤں کا ایک متوسط طبقہ تھا جو معاشی حیثیت سے ذرا بہتر حالت میں تھا اور ترقی کر رہا تھا؟ اس طبقے کے اقتدار اور ترقی کی مخالفت کسی حد تک زمیندار طبقہ کی طرف سے کی گئی جس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی ہندو زمیندار بالعموم اپنے بورژوا طبقہ سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور اس لئے اپنے متوسط طبقہ

؎۱ - یہ ٹکڑا ہانس کوہن (Hanskohn) کی مشرق کی تاریخ وطنیت سے نقل کیا ہے

نوٹ - یہ پوری تقریر سرسید کے ”مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز“ میں شائع ہوئی ہے ہم یہاں ان کی اصل تقریر کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا پنڈت جواہر لال نے متن میں اقتباس دیا ہے۔

” اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کرے - برہما لے لے - افغانستان سے لڑے اس سے صلح کرے - ان سے ہم لوگ جو ملک کے باشندے ہیں کچھ سروکار نہیں رکھتے -

اس کونسل میں چند ممبر تنخواہ دار ہیں - علاوہ ان کے ہر صوبہ سے جو گورنمنٹ کی دانست میں نہایت ہوشیار اہلکار گورنمنٹ کے ہیں (بقیہ صفحہ ۳۱۹ پر

کے مطالبات میں یا تو وہ غیر جانبدار رہے یا ان سے ہمدردی کرتے رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ مطالبات انھیں کے اشاروں سے کیئے جاتے تھے۔ حکومت برطانیہ حسب معمول اس کشمکش میں منصب داروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دیتی رہی۔ اور جہاں تک بیچارے عوام الناس یا ادنیٰ متوسط طبقہ کا تعلق ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس پوری تصویر میں ان کا چہرہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

بالآخر سرسید کی پرزور اور چھا جانے والی شخصیت نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما دیا۔ اور ان کی تمام امیدوں اور آرزوں کی تشکیل علی گڑھ کالج کی صورت میں ہوئی۔ تغیر اور تبدیلی کے زمانہ میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی تحریک جلد ہی اپنی قوت ختم کر چکتی ہے اور پھر بجائے محرک کے الٹے روک کا کام کرنے لگتی ہے۔ اس کی ایک روشن مثال ہندوستان

صفحہ ۳۱۸ کا بقیہ۔ مثلاً کمشنر یا اور کوئی واقف کار حال صوبہ جس نے مدت تک وہاں زندگی بسر کی ہے۔ عدالت کے کام فوجداری۔ کلکٹری کے کام سے اور اس ملک اور اس ملک کے حال سے واقف ہے ہر صوبہ سے بلاتی ہے پنجاب سے۔ اودھ سے۔ شمال و مغرب سے۔ مدراس و بمبئی سے۔ اور ان کو مشورہ میں شریک کرتی ہے۔ گورنمنٹ ہندوستانی رئیسوں میں سے جن کو وہ اس کرسی پر بیٹھنے کے قابل اور باعتبار عزت کے مناسب سمجھتی ہے ان کو بھی بلاتی ہے شاید اس بات پر لوگوں کو شبہ ہوا ہو گا کہ باعتبار عزت کے کیوں بلاتی ہے۔ باعتبار لیاقت کے کیوں نہیں بلاتی؟ اس کی بابت اے حضرات میں کچھ بیان کروں گا۔ (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

کی لبرل جماعت ہے۔ وہ اکثر ہم لوگوں کو یاد دلا دیتے ہیں کہ کانگریس کی قدیم روایات کے اصل حامل اور جائز وارث وہی ہیں اور ہم لوگ جو بعد میں داخل ہوئے خواہ مخواہ دخل بیجا کرنے والے لوگ ہیں۔ اور یہ بالکل درست ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور کانگریس کی قدیم روایات اسی طرح محو ہو چکی ہیں جیسے پارسال کا برف پہاڑوں پر سے گھل کر غائب ہو گیا اب صرف اس کی یاد ہی یاد باقی ہے، شاید سرسید کا پیغام بھی اسی طرح اس وقت کے لئے مناسب حال اور ضروری تھا لیکن ایک ترقی کرنے والی جماعت کے لئے وہ آخری نصب العین نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر وہ ایک نسل تک اور زندہ رہتے تو وہ خود اپنے پیغام کو

(بقیہ صفحہ ۳۱۹) کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی۔ اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ ان کے مال۔ جائداد اور عزت پر حاکم ہو کبھی نہیں کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا (چیرز)۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے اس کو (مائی کلیگ یا مائی آنریبل کلیگ) یعنی برادر یا معزز صاحب کہہ سکتا ہے نہ شاہانہ ڈنروں میں اور نہ شہنشاہی جلسوں میں جہاں (ڈیوک) اور (ارل) اور بڑے بڑے معززین شامل ہوتے ہیں بلایا جا سکتا ہے۔

بہرحال قانون میں کچھ نقص ہو یا نہ ہو مگر طریقہ بنانے کا ایسا ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ خود مختاری سے جو چاہتی ہے وہ کرتی ہے۔ ہم رعایا کی رائے نہیں لیتی اور نہیں سنتی ہے۔ اور جو لوگ عذر کرنا چاہتے ہیں (بقیہ صفحہ ۳۲۲ پر)

کوئی نیا رخ دیتے ۔ یا دوسرے رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ ان کے پیغام کی تاویل کر کے تغیر پذیر حالات میں اس سے کام لیتے لیکن یہ ایسی عظیم الشان کامیابی سرسید کو حاصل ہوئی تھی اور ان کی ایسی عظمت لوگوں کے دلوں پر اسی وجہ سے قائم ہو گئی تھی کہ دوسرے لوگوں کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ ان کے عقیدے سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نکالی جائے اور بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسی غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کا بھی فقدان تھا جو کوئی نئی راہ نکال سکتے ۔

اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ کالج نے بڑا اچھا کام کیا ۔ قابل لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کر دی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا رنگ ہی بدل دیا لیکن جن اصولوں پر اس کی بنیاد اول روز قائم کی گئی تھی ان میں پھر پوری طرح تبدیلی نہیں ہو سکی ۔ امیرانہ ذہنیت وہاں ہمیشہ کارفرما رہی اور ایک اوسط درجہ کے طالب علم کا حوصلہ اور مقصد سرکاری ملازمت کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔ ان میں تحقیق کا جذبہ ہے نہ تلاش اور جستجو کا حوصلہ ، اگر اس کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بس وہ خوش ہے اور مطمئن ۔ اس کا جذبۂ افتخار اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اگر اس کو یاد دلایا جائے کہ وہ بھی جمہوریت اسلام کا ایک رکن ہے ۔ اور اپنے اس جذبہ اخوت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایک سرخ ٹوپی

(بقیہ صفحہ ۳۲۰) ان پر غور نہیں کرتی بلکہ اس بیان کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ گورنمنٹ کوئی قانون جاری نہیں کرتی جب تک رعایا اور اخباروں کی رائے نہیں سن لیتی ۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا حصہ قانون پر نہیں ہے ۔ ۔ بے شک ہے اور بلا شبہ ہے ۔

ذرا ترچھی کر کے پہنتا ہے (یہ ترکی ٹوپی کہلاتی ہے حالانکہ خود ترکوں نے اب اس کو بالکل ترک کر دیا ہے) جمہوریت اسلام میں شرکت کا یہ ناقابل انکار حق یقینی طور پر حاصل کر لینے کے بعد جس سے کہ اس کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کا حق مل جاتا ہے اب اس کو اس کی مطلق فکر نہیں ہوتی کہ اس کے وطن ہندوستان میں سیاسی جمہوریت کا وجود بھی کہیں ہے کہ نہیں ہے۔

سرکاری ملازمت کرنے کا یہ شوق اور یہ تنگ نظری صرف علی گڑھ یا دوسرے مقامات کے مسلمان طلبہ ہی میں نہیں بلکہ ہندو طلبہ میں بھی پائی جاتی تھی جو طبعاً بہت ہی کم حیثیت ہوتے تھے، لیکن حالات نے انھیں بالآخر اب اس چکر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ان کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی اور ملازمتوں میں اتنی جگہ نہ تھی کہ سب کو دی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا ایک طبقہ ہو گیا جو قومی انقلابی تحریکات کے پشت پناہ ہیں۔

سرسید کے سیاسی پیغام کا اثر ابھی ہندی مسلمانوں پر باقی تھا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں چند واقعات نے برطانوی حکومت کو یہ موقع دیا کہ قومی تحریک اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پہلے سے حائل ہے اس کو اور زیادہ وسیع کر دے۔ ۱۹۱۰ء میں سر ولینٹائن چرول اپنی کتاب انڈین ان ریسٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے مفاد اور قومی اغراض و مقاصد کو برطانوی حکومت کے قیام و استحکام کے ساتھ جس حد تک اب وابستہ کر لیا ہے اس سے پہلے کبھی اس کی مثال نہیں ملتی لیکن سیاسی پیشینگوئیاں خطرناک ہوتی ہیں۔ سر ولینٹائن نے جب یہ لکھا اس کے پانچ سال کے بعد یہ دیکھا گیا کہ تعلیم یافتہ

مسلمان بھی ان بیڑیوں کو توڑ پھینکنے کی کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں اور کانگریس کے دوش بدوش چلنا چاہتے ہیں اور اسی سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمان کانگریس سے بھی دو قدم آگے نکل جائیں گے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کی رہنمائی کرنے لگے۔ لیکن یہ دس سال کا زمانہ بہت ہی اہم زمانہ تھا جنگ عظیم اسی زمانہ میں شروع ہوئی اور دنیا کو تباہی اور بربادی کے عالم میں چھوڑ کر اسی زمانہ میں ختم بھی ہوئی۔

بہر کیف سطحی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سر ویلنٹائن چرول نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کے لیے بھی معقول وجوہ موجود تھے۔ آغا خاں نے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے ظہور فرمایا تھا اور اسی ایک واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ابھی تک قدیم منصب داری نظام کی روایات سے وابستہ تھے اس لیے کہ آغا خاں 'بورژوا' لیڈر تو کسی صورت میں نہیں کہے جا سکتے تھے آغا خاں ایک متمول امیر و کبیر ہیں اور ایک مذہبی فرقہ کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، برطانوی نقطہ نظر سے تو مقربین بارگاہ میں ان کا شمار کیا جاتا ہے اس لیے کہ برطانیہ کے حکمران طبقہ سے ان کے نہایت گہرے تعلقات ہیں، وہ ایک نہایت شائستہ اور وسیع المشرب آدمی ہیں ان کا قیام زیادہ تر یورپ میں رہتا ہے، جہاں ان کی طرز معاشرت اور بود و باش بالکل وہی ہے جو ایک فارغ البال اور سیر و تفریح میں وقت گذارنے والے انگریز رئیس کی بالعموم ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک فرقہ وارانہ اور مذہبی مسائل اور معاملات کا تعلق ہے آغا خاں خود ذاتی طور پر تنگ نظری سے بہت دور ہیں، لیکن ان کی قیادت کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں میں زمیندار طبقہ اور مسلمان بورژوا طبقہ دونوں برطانوی حکومت کی حمایت میں صف بستہ

ہوجائیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس پر ظاہرا طور پر اس لئے زور دیا جاتا تھا کہ اصل مقصد حاصل ہو۔ سر ویلنٹائن چرول لکھتے ہیں کہ آغا خاں نے وائسرائے لارڈ منٹو کو بتلا دیا تھا "کہ تقسیم بنگال سے جو سیاسی صورت حال پیدا ہوئی اس کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نظر کیا ہے تاکہ ہندوؤں کے ساتھ کوئی ایسی سیاسی مراعات کہیں رواداری میں نہ کردئے جائیں جس ہندو اکثریت کے اقتدار حاصل کرنے کے لئے راستہ صاف ہوجائے" کہ یہ بات برطانوی حکومت کے استحکام اور مسلم اقلیت کے مفاد کے لئے جس کی وفاداری میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی یکساں طور پر خطرناک تھی۔

برطانوی حکومت کے ساتھ اس سطحی حمایت کے پیچھے دوسری قوتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ ناگزیر طور پر جدید "مسلم بورژوا" طبقہ روز بروز موجود حالات سے غیر مطمئن ہوکر تحریک وطنیت کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ خود آغا خاں کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا اور انھوں نے مختص الفاظ میں برطانیہ کو متنبہ کیا۔ انھوں نے جنوری سنہ ۱۹۱۴ء کے اڈنبرا ریویو میں (یعنی جنگ سے بہت پہلے) یہ لکھا تھا اور حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا طرز عمل ترک کرکے دونوں مذاہب کے معتدلین کو ایک مشترکہ محاذ پر جمع کرنا چاہیئے تاکہ ہندوستان کے نوجوان ہندو اور مسلمانوں دونوں کے انتہا پسند قومی میلانات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد کا اتنا زیادہ خیال نہ تھا جتنا کہ ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو روکنے کا۔

لیکن قومیت کی تحریک کی طرف مسلم بورژوا طبقہ کے ناگزیر میلان

نہ تو آغا خاں روک سکے اور نہ حکومت برطانیہ۔ عالمگیر جنگ نے اس تحریک میں اور زیادہ تیزی پیدا کر دی اور جیسے جیسے نئے رہنما پیدا ہوئے آغا خاں کنارہ کش ہوتے گئے، یہاں تک کہ علی گڑھ کالج کا رنگ بھی بدلا۔ نئے رہنماؤں میں سب سے زیادہ زوردار علی برادران تھے اور یہ دونوں علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور متعدد بورژوا لیڈروں نے مسلمانوں کے سیاسی معاملات میں بہت اہم حصہ لینا شروع کیا اسی طرح مسٹر محمد علی جناح آگے بڑھے لیکن ذرا زیادہ اعتدال کے ساتھ گاندھی جی ان میں سے اکثر مسلم لیڈروں کو (مسٹر جناح کو چھوڑ کر) اور مسلمانوں کو بالعموم تحریک ترک موالات میں اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئے اور ان لوگوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک تمام واقعات میں بہت نمایاں حصہ لیا۔

اس کے بعد رد عمل شروع ہوا، ہندو اور مسلمانوں دونوں جماعتوں کے فرقہ پرست اور پچھڑی لوگ جو مجبوراً کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے نکلنا شروع ہو گئے۔ اس عمل کی رفتار بہت سست تھی لیکن مسلسل جاری رہی چنانچہ ہندو مہاسبھا کو پہلی بار کچھ شہرت حاصل ہوئی لیکن یہ شہرت زیادہ تر فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے تھی ورنہ سیاسی حیثیت سے وہ کانگریس کو کچھ زیادہ مرعوب نہ کر سکی، اسلامی فرقہ وارانہ انجمنوں کو البتہ عام مسلمانوں میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے میں نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی، لیکن اس کے بعد بھی مسلمان رہنماؤں کی ایک قومی جماعت برابر کانگریس کے ساتھ رہی، اسی اثنا میں حکومت برطانیہ نے ان تمام فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کی ہمت افزائی اور حمایت کی جو سیاسی حیثیت سے بالکل ہی رجعت پسند واقع ہوئے تھے

ان رجعت پسندوں کی کامیابی کو دیکھ کر ہندو مہاسبھا نے بھی رجعت پسندی میں ان کا مقابلہ شروع کیا اور اس امید پر کہ حکومت کی خوشنودی اس طریقہ سے حاصل ہو جائے گی۔ مہاسبھا کے ترقی پسند عناصر یا تو نکال باہر کیے گئے یا آپ اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گئے اور مہاسبھا روز بروز اعلیٰ متوسط طبقہ کی طرف اور بالخصوص ساہوکاروں اور مہاجنوں کی طرف جھکتی چلی گئی۔

دونوں طرف کے فرقہ پرست سیاسین جو کونسلوں کی نشستوں کی تقسیم پر برابر لڑ جھگڑ رہے تھے اگر کچھ سوچتے تھے تو بس یہ کہ حکومت میں اقتدار حاصل ہونے سے ان کو اپنے ہم قوموں کی سرپرستی کے مواقع ملیں گے غرض یہ سارا جھگڑا صرف متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ملازمتوں کے لئے تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اتنی ملازمتیں تو تھیں نہیں جو سب کو مل سکیں اس لئے ہندو مسلم فرقہ پرست اسی کے لئے جھگڑتے تھے اور اول الذکر کے قبضہ میں چونکہ اکثر ملازمتیں تھیں اس لئے وہ ان کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اور آخر الذکر برابر اور زیادہ چھیننے کی فکر میں تھے، ملازمتوں کے لئے اس جھگڑے کے پیچھے ایک اور بھی بہت زیادہ اہم مقابلہ تھا جو ٹھیک ٹھیک فرقہ وارانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن فرقہ وارانہ امور پر اس کا اثر ضرور پڑتا تھا۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو پنجاب سندھ اور بنگال میں ہندو زیادہ مالدار، زیادہ قرض دینے والے، اور زیادہ تعداد میں شہر کے رہنے والے ہیں، برخلاف اس کے ان صوبوں میں مسلمان زیادہ غریب، زیادہ مقروض اور زیادہ تر دیہات کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کی لڑائی زیادہ تر معاشی ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا اور ادھر کچھ عرصہ سے تو مختلف صوبہ جات کی کونسلوں میں اور بالخصوص پنجاب کونسل میں جہاں دیہی قرضوں

کی تخفیف کا مسودہ قانون پیش ہوا تو بحث مباحثوں میں یہ کیفیت خاص طور پر ظاہر تھی اور ہندو سبھا کے نمائندوں نے ہمیشہ ان قوانین کی مخالفت کی اور ساہوکار طبقہ کا ساتھ دیا ہے۔

ہندو مہا سبھا جب کبھی مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر نکتہ چینی کرتی ہے تو اپنی اس خالص وطنیت کا ادعا بھی کرتی ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ بات کہ مسلم انجمنوں نے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر فرقہ پرست ظاہر کیا ہے ہر شخص پر عیاں ہے، لیکن ہندو مہا سبھا کی فرقہ پرستی اتنی آشکارا نہیں ہے اس لئے کہ وہ وطنیت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی وطنیت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی جمہوری اور قومی تصفیہ سے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اس کو اندیشہ ہو اور اس وقت اس امتحان میں مہا سبھا بار بار ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ اکثریت کی مرضی کے خلاف اور اقلیت کے معاشی مفاد کی خاطر یہ لوگ ہمیشہ سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کرتے رہے۔

لیکن فرقہ پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے وطن پرستی کی مخالفت اور رجعت پسندی کی غیر معمولی نمائش گول میز کانفرنس میں ہوئی۔ برطانوی حکومت نے چن چن کر صرف فرقہ پرست مسلمانوں کو نامزد کرنے پر اصرار کیا تھا اور یہ لوگ آغا خاں کی قیادت میں بڑے سے بڑے رجعت پسندوں سے جا کر مل گئے جو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام ترقی پسند جماعتوں کے نقطہ نظر سے برطانیہ کی سیاسی زندگی میں سب سے خطرناک عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ آغا خاں اور ان کی جماعت کا لارڈ لائڈ اور ان کی جماعت کے ساتھ اتنا گہرا میل جول دیکھ کر یوں ہی تعجب ہوتا تھا لیکن

یہ لوگ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انھوں نے گول میز کانفرنس میں یورپین ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے نمائندوں کے ساتھ جا کر عہد و پیمان کر لیے۔ یہ بات بہت زیادہ تکلیف دہ اس لیے تھی کہ یہ ایسوسی ایشن (انجمن) ہندوستان میں ملکی آزادی کی سب سے بڑی مخالف اور دشمن ہمیشہ سے رہی ہے اور آج بھی ہے۔

ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے اس کے جواب میں یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص پنجاب کی خود اختیاری پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں یعنی ایسے تحفظات رکھے جائیں جو برطانیہ کے حق میں مفید ہوں، انھوں نے کوشش کی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے میں مسلمانوں سے بھی آگے بڑھ جائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ تو کچھ لگا نہیں، البتہ اپنے ہی مقدمہ کو نقصان پہنچایا اور تحریک آزادی کے ساتھ غداری کی۔ مسلمانوں نے کم از کم وقار کے ساتھ تقریریں کی تھیں لیکن فرقہ پرست ہندوؤں کے پاس یہ بھی نہ تھا۔

سب سے زیادہ نمایاں حقیقت مجھے تو یہ نظر آتی ہے کہ دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈر کس طرح صرف ایک چھوٹے سے اعلیٰ طبقہ کے رجعت پسند گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور کس طرح یہ لوگ بھی اپنی اغراض کے لئے عوام کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ دونوں طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصل معاشی مسئلہ پر غور و فکر کی خواہش کو دبایا جائے اور اس سے احتراز کیا جائے، لیکن انھیں معلوم نہیں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ان امور کو اور زیادہ نہ دبایا جاسکے گا اور اس وقت پھر دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈروں کی زبان سے

آغا خاں کی بیس برس پہلے والی تنبیہ کی آواز بازگشت آئے گی کہ "معتدلین ایک مشترکہ محاذ پر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انقلابی میلانات کے مقابلہ کے لئے مجتمع ہو جائیں" کسی حد تک تو یہ بات اب بھی ظاہر ہونے لگی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست خواہ عام جلسوں میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں لیکن اسمبلی میں اور دوسری جگہوں پر رجعت پسند قوانین منظور کرتے ہیں اور حکومت کی امداد کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ معاہدہ اٹاوہ بھی اسی قسم کا ایک رشتہ تھا جس نے تینوں کو متحد کر دیا تھا۔

یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ کنزرویٹو جماعت کے انتہائی رجعت پسند لوگوں کے ساتھ آغا خاں کا گہرا تعلق اب بھی قائم ہے، اکتوبر ۱۹۳۴ء میں برطانوی بحری افواج کی لیگ کے ڈنر میں آغا خاں بطور خاص مہمان کے مدعو تھے جس میں لارڈ لائڈ نے صدارت کی تھی، اور انھوں نے دل و جان سے ان تجاویز کی تائید کی تھی جو برطانوی بحری بیڑہ کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے لارڈ لائڈ نے برسٹل کی کنزرویٹو کانفرنس میں پیش کی تھیں، چنانچہ ایک ہندوستانی لیڈر کو اتنی زیادہ فکر برطانوی سلطنت اور بالخصوص انگلستان کی محافظت کی تھی کہ برطانوی افواج و اسلحہ کے اضافہ کے معاملہ میں مسٹر بالڈون اور نیشنل گورنمنٹ سے بھی وہ آگے جانا چاہتے تھے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ وہ صرف قیام امن کی خاطر کر رہے تھے۔!

اس کے بعد دوسرے مہینہ نومبر ۱۹۳۴ء میں یہ خبر ملی کہ ایک تصویر (فلم) نجی طور پر لندن میں دکھلائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ "اسلامی دنیا کے مستقل دوستانہ تعلقات کا رشتہ تاج برطانیہ کے ساتھ قائم کیا جائے" ہم لوگوں کو اطلاع دی گئی کہ اس موقع پر خاص مہمان آغا خاں اور لارڈ لائڈ

تھے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ آغا خاں اور لارڈ لائڈ سلطنتی معاملات میں اسی
ح ایک دوسرے سے متحد اور ایک جان دو قالب ہوگئے ہیں جیسے ہماری
زمی سیاسیات میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم آر جیکر ہیں۔ اور یہ بات بھی
ابل ملاحظہ ہے کہ اسی چند مہینہ کے عرصہ میں جب یہ دونوں ایک دوسرے
سے بار بار ساز باز کر رہے تھے، لارڈ لائڈ کنزرویٹو اقدامت پسند جماعت
کی باضابطہ قیادت پر اور اپنی نیشنل گورنمنٹ پر تلخ اور ناگوار حملے بھی کر رہے
تھے اور یہ الزام دے رہے تھے کہ حکومت ہندوستان کو ضرورت سے زیادہ
یکر گویا کمزوری دکھلا رہی ہے [1]

ادھر کچھ عرصہ سے بعض فرقہ پرست لیڈروں کے بیانات اور تقریروں
میں ایک دلچسپ بات اور پیدا ہوگئی ہے۔ اس کی کوئی خاص اہمیت تو ہے
ہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اور لوگوں کا بھی یہی خیال کہیں نہ ہو۔ بہر کیف
فرقہ پرستی کی ذہنیت تو اس سے ظاہر ہی ہوتی ہے، اور اس کو بہت زیادہ
اہمیت بھی دی گئی ہے پہلے تو ہندوستان میں "مسلم قوم" اور اسلامی تمدن پر اور
ہندو تمدن' اور 'اسلامی تمدن' کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے
اور پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے (گو اس کو بھونڈے طریقہ پر نہیں
پیش کیا جاتا) کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ضروری
ہے تاکہ دونوں تمدنوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کرسکے۔

---

[1] ۔ کچھ عرصہ ہو کچھ برطانوی امرا [illegible] اور ہندوستانی مسلمانوں کی ایک
کونسل قائم کی گئی ہے جو ان دو انتہا پسند رجعت پسند عناصر کو متحد کرے اور
اس اتحاد کو اور زیادہ فروغ دے۔

تھوڑے سے فرقہ پرست ہندو لیڈر بھی ٹھیک اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں فرق بس اتنا ہے کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں اس لئے انھیں توقع ہے کہ 'ہندو تمدن' بالآخر غالب آجائے گا۔

'ہندو اور مسلم تمدن' اور 'ملت اسلامی'۔ ان الفاظ سے ماضی کے کیسے کیسے دل پسند تاریخی واقعات اور موجودہ اور آئندہ کے متعلق کیسی کیسی امیدوں کے باب کھل جاتے ہیں! لیکن ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم (موجود ہے) جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے، اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے، اور معاشی نقطہ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے۔ بہرکیف اس ذہنیت کے سمجھنے میں اس سے تھوڑی مدد ملے گی جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اس قسم کی چند قوموں کا وجود عہد وسطیٰ میں اور اس کے بعد بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں اور گھل مل نہ سکتی تھیں سلاطین عثمانی کے ابتدائی عہد کے قسطنطنیہ میں اس قسم کی ہر قوم علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی تھی اور اس کو کسی حد تک خودمختاری حاصل تھی مثلاً لاطینی عیسائی، ارتھوڈاکس عیسائی اور یہودی وغیرہ یہ گویا ابتدار تھی اپنے وطن کے علاوہ دیگر ممالک سے رشتہ اخوت جوڑنے کی جو اس زمانہ میں اکثر مشرقی ممالک کے لئے ایک بہت ہی پریشان کن خواب بن گیا۔ اس لئے مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ صرف مذہبی اخوت کا رشتہ ایک چیز ہے اور اس لئے کوئی قوم (جدید مفہوم میں) ترقی نہ کرنے پائے اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید تہذیب و تمدن کو ترک کر کے ہم لوگ عہد وسطیٰ

کے طریقوں کو پھر اختیار کریں، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت ہاں رہنا چاہیے یا بدیسی حکومت اور آخر میں تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے اور س کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ ذہن کی محض ایک جذباتی کیفیت ہے، اور محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر یہ خواہش کہ حقائق سے بالخصوص معاشی حقائق سے کسی رح دوچار ہونا نہ پڑے۔ جذبات کے سامنے منطق اوندھی ہو جاتی ہے مگر محض اس وجہ سے کہ وہ غیر معقول ہوتے ہیں ہم انھیں نظر انداز بھی نہیں کر سکتے ،مسلم قوم' کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے، اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہوتا تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

یہی حال ہندو اور مسلم تمدنوں کے تخیل کا ہے۔ اب تو قومی تمدن کا زمانہ بھی بہت تیزی کے ساتھ ختم ہوتا جا رہا ہے اور پوری دنیا ایک تمدنی وحدت بنتی جا رہی ہے'۔ قوموں کو یہ حق ہے اور آئندہ بھی ایک عرصہ تک یہ حق رہے گا کہ اپنی خصوصیات کو مثلاً زبان، عادات، اور طریق فکر کو باقی اور محفوظ رکھیں، لیکن سائنس اور کلوں کا یہ زمانہ، اور تیزی سے سفر کرنے کی سہولتیں، اخبار عالم کا مسلسل ملتا رہنا، ریڈیو، اور سینما وغیرہ کی ترقی کی وجہ سے روز بروز دنیا میں یک رنگی پیدا ہوتی جائے گی اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اگر اس کو کوئی روک سکتا ہے تو بس ایک ایسی عالمگیر تباہی جو جدید تہذیب اور تمدن ہی کو تہ و بالا کر دے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو اور مسلم فلسفہ زندگی میں بہت سے روایتی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن یہ اختلافات مشکل ہی سے نظر آ سکتے ہیں جب کہ ان دونوں کا مقابلہ زندگی کے متعلق جدید

علمی اور تجارتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس آخر الذکر اور اول الذکر دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج موجود ہے' آج ہندوستان میں اصل کشمکش ہندو تمدن اور مسلم تمدن کے درمیان نہیں ہے بلکہ ایک طرف یہ دونوں ہیں اور دوسری طرف تہذیب جدید کا فاتح علمی و حکمی تمدن' جو لوگ مسلم تمدن کا خواہ اس کا مطلب جو کچھ بھی ہو تحفظ چاہتے ہیں' انھیں ہندو تمدن کے متعلق فکر کرنے کی بجائے مغرب کے اس دیو کا مقابلہ کرنا چاہیئے' ذاتی طور پر مجھے تو اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ جدید علمی اور تجارتی تمدن کے مقابلے کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے گی خواہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے ان کا حشر ناکامی ہو گا۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں بغیر کسی تاسف کے اس ناکامیابی کا تماشہ خوشی سے دیکھوں گا جس دن ریلیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں یہاں آئیں ہماری پسند کا فیصلہ تو اسی دن بالکل غیر محسوس طریقہ پر اور بلا کسی خواہش کے ہو گیا تھا۔ سر سید احمد خاں نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اپنی پسند کا فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم میں سے کسی کی پسند کا کوئی دخل ہی نہ تھا' یا اگر تھا بھی تو اس کی مثال وہی ہے کہ جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو وہ تنکے کا سہارا پکڑتا ہے کہ شاید وہی اس کی جان بچائے۔

لیکن یہ 'مسلم تمدن' ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں' ایرانیوں' اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان' آرٹ' موسیقی' اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے نہیں یاد آتا کہ کوئی شخص آجکل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا

جن دو زبانوں نے ہندی مسلمانوں کے خیالات و افکار پر اثر ڈالا ہے وہ عربی اور بالخصوص ایرانی زبان ہے، لیکن ایرانی زبان کے اثر میں کوئی جذبی عنصر شامل نہیں۔ ایرانی زبان اور بہت سی ایرانی رسوم اور روایات ہزار ہا سال کے عرصہ میں ہندوستان میں آئیں اور پورے شمالی ہند پر اپنا نقش قائم کیا۔ ایران گویا مشرق کا فرانس تھا جو اپنی زبان اور اپنے تمدن کو تمام پردیس کے ملکوں میں پھیلاتا تھا اور یہاں ایک ایسا گرانقدر ورثہ ہے جس میں ہم تمام ہندوستانی برابر کے شریک ہیں۔

مسلم اقوام اور ممالک کے تاریخی کارناموں پر فخر کرنا غالباً ایک بہت ہی مضبوط اسلامی رشتہ سمجھا جاتا ہے، لیکن کیا کوئی شخص مختلف اقوام کے عظیم الشان کارناموں پر فخر کرنے سے مسلمانوں کو روکتا ہے، جب تک وہ ان کی یاد کو تازہ رکھنا چاہیں گے اس وقت تک کوئی شخص انھیں اس سے محروم نہیں کر سکتا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ تاریخی کارنامے بہت بڑی حد تک ہم سب لوگوں کے لئے بھی ایک مشترکہ ورثہ ہیں۔ اس لئے کہ ایشیائی ہونے کی وجہ سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے درمیان یہی ایک رشتہ ہے جو یورپ کی دست درازیوں کے خلاف ہمیں متحد کرتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جب کبھی میں نے اسپین میں یا صلیبی جنگوں میں عربوں کی لڑائیوں کا ذکر پڑھا ہے تو میری ہمدردی ہمیشہ انھیں کے ساتھ رہی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جانب داری نہ کروں اور صرف واقعات پر بحث کروں، لیکن چاہے جتنی کوشش کروں جہاں ایشیائی لوگوں کا تعلق ہوتا ہے میری ایشیائیت کا اثر میری قوت فیصلہ پر ضرور پڑتا ہے۔

میں نے اسلامی تمدن کا مطلب سمجھنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں

تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہوا میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں صرف ایک مٹھی بھر متوسط طبقہ کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی جن پر ایرانی زبان اور ایرانی روایات کا اثر ہے۔ اور اگر عوام پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن کی نشانی بظاہر یہ ہے، ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لانبا ہو اور نہ زیادہ اونچا، ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی کا رکھنا اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی ہوتی ہے اس کے برخلاف ہندوؤں میں رواج ہے دھوتی پہننے کا، سر پر چوٹیا رکھنے کا، اور ذرا مختلف قسم کا لوٹا رکھنے کا۔ درحقیقت یہ اختلافات بھی زیادہ تر شہری ہیں اور رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے ہیں، ورنہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کسان اور کارخانہ کے مزدور میں مشکل ہی سے کوئی تمیز کی جا سکتی ہے، مسلمان تعلیم یافتہ شاذونادر داڑھی رکھتے ہیں، البتہ علی گڑھ والے ابھی تک ترکی ٹوپی کے فریفتہ ہیں (یہ ٹوپی ترکی کہلاتی ہے حالانکہ ترکی کو اب اس سے کوئی سروکار نہیں ہے) مسلمان عورتیں ساری پہننے لگی ہیں اور رفتہ رفتہ پردے سے بھی نکل رہی ہیں میرا اپنا مذاق ان میں سے بعض عادات اور خصائل سے میل نہیں کھاتا اور مجھے نہ داڑھی پسند ہے نہ مونچھیں نہ چوٹیا، لیکن مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ اپنے مذاق کے اصول و قوانین دوسروں پر عائد کروں جہاں تک داڑھیوں کا تعلق ہے امان اللہ خاں نے کابل میں جب سرسری طور پر ان کا صفایا کرنا شروع کیا تو مجھے خوشی ضرور ہوئی تھی۔

اُن ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت بھی حد درجہ دردانگیز ہے جو ہمیشہ ماضی کی طرف نظر رکھتے ہیں اور ہمیشہ انھیں چیزوں کو پکڑتے ہیں جو ان کی گرفت سے نکلتی چلی جا رہی ہیں میں نہ ماضی کو بُرا کہتا ہوں نہ اس کو رد کرتا ہوں۔ اس لئے کہ

ہمارے ماضی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو حسن و جمال میں یکتا ہیں اور بلاشبہ باقی رہنے والی بھی ہیں لیکن یہ لوگ اس حسن و جمال کو باقی رکھنے کے آرزومند نہیں ہیں بلکہ ایسی چیزوں کے پیچھے پڑے ہیں جو آئندہ رکھنے کے قابل ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔

اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہونچے ہیں اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے اسلام کے غازی مرد ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لئے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لئے جا رہے ہیں۔ ترکی کے جدید دستور اساسی میں ایک دفعہ تھی کہ ترکی اسلامی ریاست ہے، لیکن اس اندیشہ سے کہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کمال پاشا نے ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا کہ "دستور اساسی کی یہ دفعہ کہ ترکی ایک اسلامی ریاست ہے محض سمجھوتہ کے طور پر داخل کی گئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اولین موقع ملتے ہی اس کو خارج کر دیا جائے گا" میرا خیال ہے کہ جو اشارہ اس نے کیا تھا اس پر بعد میں اس نے عمل بھی کیا۔ مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے گو نسبتاً بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ اور مذہب سے سیاست کو بالکل علیحدہ رکھتا ہے۔ یہی حال عربی ممالک کا ہے، سوائے ملک عرب کے جو بہت زیادہ پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیار کے لئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ وطنیت کے پیچھے پیچھے اور بھی بہت سے مسلک ہیں جو معاشرتی اور معاشی زبان میں گویا ہیں۔ ہاں "مسلم قوم"، اور "مسلم تمدن" کا کیا ہوگا؟ کیا یہ آئندہ صرف

شمالی ہند میں سرکار دولتمدار برطانیہ کے زیر سایہ پھلے پھولے گا؟۔
اگر ترقی کے معنی یہی ہیں کہ سیاست میں وسعتِ نظر سے کام لیا جائے تو آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارے فرقہ پرستوں نے اور حکومت نے جان بوجھ کر اور متواتر اس کے بالمقابل تنگ نظری کو اپنا مقصودِ نظر قرار دیا ہے۔

(۵۷)

تعطل

دوبارہ گرفتاری اور سزایابی کا امکان مجھے برابر پریشان کرتا رہا۔ امکان اس لیے اور بھی قوی تھا کہ ملک پر آرڈی ننس اور اسی نوع کے دیگر قوانین کا راج تھا اور خود کانگریس ایک خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی، برطانوی حکومت کی آئینی ساخت اور اپنی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میری گرفتاری ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کوئی کام اطمینان کے ساتھ جم کر نہیں کر سکتا تھا یہی فکر تھی کہ جتنا زیادہ کام ہو سکے جلد نبٹا دیا جائے۔

پھر بھی میں خواہ مخواہ کی گرفتاری مول لینا نہیں چاہتا تھا اور حتی الوسع ایسی کارروائیوں سے احتیاط کرتا تھا جن سے میری گرفتاری عمل میں آئے اپنے صوبہ کے اکثر مقامات سے اور باہر سے بھی بہت سی دعوتیں آئیں کہ میں دورہ پر نکلوں، لیکن میں نے ان سب کو مسترد کر دیا اس لیے کہ تقریر کرنے کی غرض سے اس قسم کا دورہ ایک اندھا دھند دھاوے کی صورت اختیار کر لیتا جو یقین تھا کہ بیچ ہی سے یکایک ختم کر دیا جائے گا، مگر میرے لیے کوئی اور درمیانی راستہ بھی نہ تھا۔ میں جب کبھی کسی دوسرے کام سے مثلاً گاندھی جی سے اور اراکین ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرنے کہیں باہر گیا تو میں نے عام جلسوں میں نہایت آزادی سے تقریریں کیں، جبلپور میں

ایک بڑا جلسہ ہوا اور نہایت شاندار جلوس نکلا، اور دہلی کا اجتماع تو اُن بڑے سے بڑے مجمعوں کے مقابلہ کا تھا جو میں نے وہاں دیکھے ہیں۔ اور فی الحقیقت ان جلسوں کی کامیابی ہی سے یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ حکومت بار بار اس قسم کے جلسوں کا انعقاد گوارا نہ کرے گی۔ بلکہ دہلی میں تو جلسہ کے بعد ہی میری گرفتاری کی افواہ بہت گرم تھی، لیکن بچ گیا اور الہ آباد واپس چلا آیا۔ البتہ راستہ میں مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے تقریر کرنے کے لئے علی گڑھ بھی اتر گیا۔

جب حکومت یوں ہر قسم کے مفید سیاسی کاموں کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو تو اس وقت غیر سیاسی پبلک کاموں میں حصہ لینے کا خیال مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ میں نے کانگریسیوں میں شدت کے ساتھ یہ میلان دیکھا کہ کانگریس کے کام سے جان بچا کر ایسے انٹ سنٹ کاموں میں لگتے جا رہے تھے جو اگرچہ بجائے خود پسندیدہ سہی مگر ہماری جدوجہد سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ میلان طبع قدرتی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کو تقویت نہ دینا چاہیے۔

وسط اکتوبر ۱۹۳۳ء میں صورت حال پر غور کرنے اور آئندہ کے لئے طریق کار کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ہم لوگوں نے صوبہ متحدہ کے کارکنان کانگریس کے جلسے الہ آباد میں منعقد کئے، صوبہ کانگریس کمیٹی ایک غیر قانونی جماعت تھی اور ہم لوگوں کا منشا صرف مشاورت کرنا تھا نہ کہ قانون کی خلاف ورزی کرنا اس لئے ہم نے اس کمیٹی کو باقاعدہ طلب بھی نہیں کیا تھا، ہم نے صرف ان تمام اراکین کمیٹی کو جو جیل سے باہر تھے نیز چند اور منتخب کارکنوں کو ایک غیر رسمی جلسہ میں مدعو کر لیا تھا۔ یہ جلسے بالکل نجی تھے مگر ان کے متعلق

کوئی رازداری بھی نہیں کی گئی تھی، چنانچہ آخر وقت تک ہم لوگوں کی زیادہ توجہ واقعات عالم پر مبذول رہی مثلاً شدید کساد بازاری جرمنی میں نازی تحریک اور کمیونزم وغیرہ وغیرہ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے ساتھی ہندوستان کی جدوجہد کا مطالعہ ان واقعات کے تعلق سے کریں جو دیگر ممالک میں پیش آرہے ہیں۔ بالآخر کانفرنس نے ایک اشتراکی قرارداد منظور کی جس میں ہمارے نصب العین کی توضیح اور تعریف کی گئی تھی، اور یہ اعلان کیا کہ کانفرنس سول نافرمانی بند کردینے کی مخالف ہے۔ ہم میں سے ہر شخص یہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وسیع پیمانہ پر سول نافرمانی کرنے کا اس وقت کوئی امکان نہیں بلکہ انفرادی سول نافرمانی بھی یا تو بہت جلد ختم ہوجائے گی یا بہت ہی محدود پیمانہ پر جاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے سول نافرمانی جاری رکھنے نہ رکھنے سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا تھا اس لئے کہ حکومت کی طرف سے حملے اور قوانین آرڈی نینس کا نفاذ برابر جاری تھا۔ چنانچہ اور کسی غرض سے نہیں صرف اپنے طرز عمل کو ظاہر کرنے کی خاطر ہم نے رسمی طور پر سول نافرمانی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا لیکن اسی کے ساتھ ہم نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کردی کہ اپنے کسی کام کو چھوڑ کر گرفتار ہونے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اپنا معمولی کام کئے جائیں اور اگر اس سلسلہ میں گرفتار ہوجائیں تو خندہ پیشانی سے اس کو قبول کرلیں۔ انھیں خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت البتہ کی گئی کہ دیہاتی علاقوں سے اپنے تعلقات اور واسطہ دوبارہ قایم کریں اور یہ معلوم کریں کہ تخفیف لگان اور حکومت کے تشدد سے کسانوں کا حال کیسا ہے۔ اس وقت عدم ادائگی لگان کی تحریک کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ تحریک تو پونا کانفرنس کے بعد ہی باقاعدہ روک

دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ اس کو دوبارہ شروع کیا جاتا۔

یہ پروگرام بہت ہی بے ضرر اور مدھم قسم کا تھا اور اس میں بظاہر کوئی بات ایسی خلاف قانون بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود ہم جانتے تھے کہ اس کی وجہ سے بھی گرفتاریاں کی جائیں گی۔ چنانچہ جون میں ہمارے کارکن دیہاتوں میں گئے ان کو گرفتار کر کے یہ الزام بالکل غلط طور پر لگایا گیا کہ وہ عدم ادائگی لگان کا پرچار کرتے ہیں (جو آرڈی ننس کے مطابق جرم قرار دیا گیا تھا) اور وہ سزایاب ہوئے۔ بہت سے رفقاء کار کی گرفتاری کے بعد میرا مقصد بھی دیہاتی علاقوں میں جانے کا تھا، لیکن بعض اور کاموں میں لگ گیا اور مجھے اپنا دورہ ملتوی کرنا پڑا یہاں تک کہ اس کا وقت ہی نکل گیا۔

ان چند مہینوں کے دوران میں دو مرتبہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین پورے ہندوستان کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ خود کمیٹی کا تو کوئی وجود نہ تھا اور یہ اس لئے نہیں کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت تھی بلکہ اس لئے کہ گاندھی جی کے ایما سے پونا کے فیصلہ کے بعد تمام کانگریس کمیٹیاں اور ان کے دفاتر بند کر دیے گئے تھے۔ میری حیثیت بھی اس وقت اتفاق سے کچھ عجیب ہو گئی تھی اس لئے کہ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے خود بخود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو کانگریس کا جنرل سکرٹری کہنے پر مصر تھا، لیکن اپنے فرائض منصبی صرف ہوائی طور پر ادا کر سکتا تھا، نہ تو کوئی دفتر تھا، نہ عملہ نہ قائم مقام صدر گاندھی جی صلاح و مشورہ کے لئے ضرور موجود تھے مگر وہ سارے ملک کا

ے عظیم الشان دورہ کرنے میں مشغول تھے اور اس مرتبہ ان کا یہ دورہ
یجن تحریک کے لئے تھا، اس دورہ میں بھی ہم لوگوں نے کسی نہ کسی طرح
ہور اور دہلی جاکر انھیں پکڑا اور ان کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے
ِاح ومشورہ کیا ان ملاقاتوں میں مختلف اراکین کا اختلاف رائے بھی
ت صاف صاف ظاہر ہوگیا۔ اور ایک تعطل سا پیدا ہوگیا۔ کوئی ایسی سبیل
بن نکلتی تھی جو سب کے لئے قابل قبول ہوتی جو لوگ سول نافرمانی بند کرنا
ہتے تھے اور جو اس کے مخالف تھے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کن
ت بس گاندھی جی کی تھی، اور چونکہ وہ اس وقت آخر الذکر گروہ کی رائے
ے متفق تھے اس لئے معاملات جس طرح تھے بدستور جاری رہے۔

مجالس قانون ساز کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے مقابلہ
نے کے مسئلہ پر کارکنان کانگریس میں کبھی کبھی بحثیں ہوا کرتی تھیں مگر ورکنگ
ٹی کے اراکین کو اس وقت اس مسئلہ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اور واقعہ
ہے کہ یہ سوال اس وقت کسی طرح پیدا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس وقت اس
ئلہ پر بحث کرنا بدیہی طور پر قبل از وقت تھا، اصلاحات کا نفاذ کم از کم آئندہ
تین سال تک ہوتا نظر نہیں آتا تھا، اور نہ اس وقت اسمبلی کے لئے جدید انتخاب
وئی تذکرہ تھا۔ ذاتی طور پر الکشن لڑنے کے خلاف مجھے کوئی اصولی اعتراض
تھا، اور مجھے اپنی جگہ پر پورا یقین تھا کہ جب وقت آئے گا تو کانگریس کو اس میں
صہ لینا ہی پڑے گا، لیکن اس وقت اس سوال کو پیدا کرنے کے معنی یہ تھے
، توجہ دوسری طرف ہو جائے۔ میرا یہ خیال تھا کہ اگر ہم اپنی جد وجہد
ری رکھیں تو جو مسائل در پیش ہیں وہ صاف اور واضح ہو جائیں گے
ر اپنے اصولوں کو چھوڑ کر سمجھوتہ کرنے والے لوگوں کو معاملات پر حاوی

ہونے سے روکا جا سکے گا،

اس دوران میں برابر میں مضامین اور بیانات اخبارات کو بھیجتا رہا۔ کسی حد تک مجھے اپنی تحریروں کو نرم اور ملائم بنانا پڑا اس لئے کہ وہ اشاعت کی غرض سے لکھی گئی تھیں، اور ادھر سنسر صاحب موجود تھے اور مختلف آئینی قوانین تھے جن کی گرفت octopus کے پنجوں کی طرح بہت دور تک پہنچتی تھی اور میں اگر ان خطرات میں پڑنے کے لئے تیار بھی ہوتا تو طابع اور ناشر اور مدیر اس کے لئے آمادہ نہ تھے، بہر حال مجموعی حیثیت سے اخبار نے مجھ پر عنایت کی اور بہت سی باتیں میری تائید میں لکھیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا بعض اوقات میرے بیانات اور مضامین کے حصے کے حصے حذف کر دیے جاتے تھے، بلکہ ایک مرتبہ تو میرا ایک پورا اور طویل مضمون جس کو میں نے بڑی محنت سے لکھا تھا شائع ہی نہیں ہوا۔

جنوری سنہ ۳۴ء میں جب میں کلکتہ میں تھا تو ایک مقتدر روزنامہ کے مدیر صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے اور انھوں نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ایک بیان کلکتہ کے جملہ اخبارات کے مدیر خصوصی کے پاس استصواب رائے کے لیے بھیجا تھا، اور چونکہ انھوں نے اس کو مسترد فرما دیا اس لیے وہ شائع نہیں کیا گیا یہ "مدیر خصوصی" کلکتہ گورنمنٹ پریس کے سنسر صاحب تھے۔

میں نے اپنے بعض بیانات میں اور اخبارات کے نمائندوں سے گفتگو کے دوران میں چند افراد اور جماعتوں پر نکتہ چینی کی تھی، اس پر اظہار ناراضگی کیا گیا، جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا اور گاندھی جی نے بھی اس خیال کو پھیلانے میں مدد دی تھی کہ کانگریس پر بلاخوف

انتقام ہر طرح کے حملے کیے جا سکتے ہیں، چنانچہ خود گاندھی جی نے اس کی ایک مثال قائم کر دی تھی اور بعض سر برآوردہ کانگریسی بھی حسب مراتب ان کا اتباع کیا کرتے تھے اگرچہ سب نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ علی العموم ہم لوگ مبہم اور دراز کار باتیں کیا کرتے تھے جس سے ہمارے نکتہ چینوں کو موقع ملتا تھا کہ غلط استدلال اور موقع پرستی کی چال بازیوں سے ہماری باتوں کو لے اڑیں اور پھر دونوں طرف سے اصل مسائل پر بحث کرنے سے گریز کیا جاتا تھا اس قسم کے بحث و مباحثے جو دیانت داری سے کیے جائیں اور جن میں موقع بموقع وار اور بچاؤ کی نوبت بھی آئے شاذ و نادر ہی ہوتے تھے جیسے کہ ان مغربی ممالک میں ہوا کرتے ہیں جہاں تحریک "فاشزم" رائج نہیں ہوئی ہے"۔

ایک خاتون دوست نے جن کی رائے کی میں قدر کرتا ہوں مجھے لکھا تھا کہ اخبارات میں تمہارے بعض مضامین کا زور دیکھ کر مجھے ذرا تعجب سا ہوا کہ تم تو بالکل کٹ کھنے ہوتے جاتے ہو۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ کیفیت اس وجہ سے ہو گئی ہے کہ مجھے مایوسیاں ہوئی ہیں۔ شاید کسی حد تک تو یہ بات صحیح ہے اس لیے کہ قومی حیثیت سے تو ہم سب ہی لوگ مایوسی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اور انفرادی طور پر بھی میرے نزدیک یہ بات ضرور صحیح ہوگی لیکن خود مجھے اس کا پورا پورا احساس نہ تھا شاید اس وجہ سے کہ ذاتی طور پر مجھے اپنی ناکامی یا درماندگی کا مطلق کوئی خیال ہی نہیں پیدا ہوا۔ سیاسی حیثیت سے گاندھی جی کا میرا ساتھ جب سے ہوا ہے میں نے کم از کم ایک بات ان سے ضرور سیکھی ہے کہ نتائج کے ڈر سے اپنے خیالات کو اپنے دل میں دبائے نہ رکھوں سیاسی میدان میں اس عادت سے دوسرے میدانوں

ہیں تو کم از کم اس پر عمل کرنا زیادہ خطرناک ہے) مجھے بسا اوقات بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے بڑا اطمینان بھی ملا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی عادت کی بدولت ہم میں سے اکثر لوگ قلبی تکلیف اور رنج سے اور بدترین قسم کی مایوسیوں سے بچ گئے ہیں'۔ یہ معلوم کر کے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کسی سے محبت کرتی ہے بڑا تشفی بخش اطمینان حاصل ہوتا ہے،' اور احساس شکست اور مایوسی کے مرض کے لئے یہ بڑا تریاق بھی ہے میرے خیال میں سب سے زیادہ تکلیف دہ احساس انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے' اور سبھوں نے اس کو فراموش کر دیا ہے'۔

اس سب کے باوجود انسان کو اس رنج و محن کی عجیب و غریب دنیا میں بھلا احساس مایوسی سے کس طرح مفر ہو سکتا ہے'۔ بار بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام غلط ہو رہا ہے اور اگرچہ کام جیسے تیسے جاری رہتا ہے پھر بھی جب ہم اپنے اردگرد کی انسانی خلقت کے خصائل پر نظر ڈالتے ہیں، تو طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ بسا اوقات مختلف واقعات اور حالات پر بلکہ اشخاص اور جماعتوں پر بھی غصہ اور غم کے جذبات مجھ پر طاری ہوئے ہیں۔ اور اب کچھ عرصہ سے تو میرا غصہ اور برہمی اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے جب میں زندگی کے متعلق لوگوں کے آرام طلب طرز عمل دیکھتا ہوں نیز یہ کہ کس طرح اہم ترین امور سے چشم پوشی کی جاتی ہے بلکہ ان کا ذکر تک اس لئے نامناسب خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر یا تو کسی کی جیب پر پڑتا ہے یا مرغوب خاطر تعصبات پر لیکن باوجود اس غصہ اور برہمی کے اور باوجود مایوسیوں کے اور اپنے "کٹ کھنے" ہونے کے اپنے متعلق مجھے یہ حسن ظن ضرور ہے کہ خود اپنی اور دوسروں کی حماقتوں پر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی خداداد قابلیت مجھ میں ہنوز مفقود نہیں ہوئی ہے۔

ایک رحیم و کریم خدا پر لوگوں کا ایمان دیکھ کر مجھے بعض اوقات بہت تعجب ہوتا ہے کہ پیہم دھچکوں کے بعد بھی یہ کس طرح قائم رہتا ہے اور کس طرح خود تباہیاں اور بربادیاں اور ایسی باتیں جن سے صفت رحیمی کا بطلان ہو صحت ایمان اور اعتقاد کی پختگی جانچنے کے لئے بس آزمائشیں سمجھی جاتی ہیں، جررڈ ہاپکنس کے اِن سرور انگیز اشعار کی صدائے بازگشت اکثر قلوب محسوس کرتے ہوں گے:

> "اے میرے مولا اگر میں تیرے ساتھ تکرار کرتا ہوں تو حق تیری طرف ہے، لیکن جس بات کے لئے میں لڑتا ہوں وہ بھی تو حق بجانب ہے؟ آخر تیرے گنہگار بندوں کے طور طریقے اس دنیا میں کیوں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور میری تمام سعی اور کوششیں مایوسی اور ناکامی پر کیوں ختم ہو جاتی ہیں تو جو میرا دم ساز ہے اگر تو بھی میرا دشمن ہوتا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تو اس سے زیادہ اور کون سی برائی میرے ساتھ کرتا جو تو مجھے شکست دینے اور کامیابی سے روکنے کے لئے کرتا ہے؟ افسوس! کہ شراب میں مدہوش رہنے والے اور ہوا و ہوس کے بدمست بندے فارغ اوقات میں زیادہ خوش اور اطمینان سے رہتے ہیں جتنا کہ یہ عاجز بندہ جو تری راہ میں اپنی ساری عمر گنوا رہا ہے۔"

اعتقاد خواہ ترقی پر ہو، خواہ کسی تحریک اور نصب العین پر یا انسان کی نیکی اور انسانی تقدیر پر، کیا یہ سب قریب قریب اعتقاد الٰہی سے ملتے جلتے نہیں ہیں؟ اگر ہم ان کی توجیہ عقل سے اور منطق سے کرنا چاہیں تو فوراً مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں، لیکن ہمارے سینوں میں کوئی چیز ہے جو اس اعتقاد اور اس کو پکڑے رہتی ہے ورنہ اگر زندگی اس سے بھی محروم کر دی جائے تو پھر

وہ ایک ایسے دشت ویراں کے مانند ہو جائے جس میں کوئی نخلستان تک نہ ہو۔

میرے اشتراکی پروپیگنڈے کا جو اثر ہوا اس نے میرے ورکنگ کمیٹی کے رفقائے کار بھی گھبرا گئے، میں تو کئی سال سے یہ پروپیگنڈا کر رہا تھا اور ابتک جس طرح وہ نباہتے رہے آئندہ بھی غالباً بلا کسی شکایت کے وہ نباہتے رہتے لیکن اب میں نے کسی حد تک ملک کے سرمایہ داروں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے میری کارروائیوں کو اب اور زیادہ عرصہ تک بے ضرر نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے کچھ ساتھی اشتراکی نہیں ہیں لیکن میرا یہ ہمیشہ سے خیال تھا کہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے بھی مجھے پوری آزادی حاصل ہے کہ کانگریس کو کسی طرح پابند کئے بغیر اشتراکی پروپیگنڈا جاری رکھ سکتا ہوں اس لئے مجھے یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ بعض اراکین ورکنگ کمیٹی کی رائے میں مجھے یہ آزادی حاصل نہ تھی اور وہ برہم تھے کہ میں ان کے متعلق بھی غلط فہمی پیدا کر رہا ہوں، لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کرتا میں اس چیز کو ترک نہیں کر سکتا تھا جس کو میں اپنے کام کا سب سے زیادہ اہم جزو سمجھتا تھا، بلکہ اگر ان دونوں میں کوئی تصادم ہوتا تو میں شاید یہ گوارا کر کہ ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں، لیکن میں استعفیٰ کیسے دیتا جب کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت تھی اور باقاعدہ طور پر اپنے فرائض منصبی تک ادا نہیں کرتی تھی۔

یہی دشواری ایک بار پھر بعد میں پیش آئی۔ غالباً دسمبر کا یہ آخری تھا جب گاندھی جی نے مجھے مدراس سے خط لکھا، اور اخبار مدراس میل

کا ایک تراشہ بھیجا جس میں ان کی وہ گفتگو نقل کی گئی تھی جو اخبار مذکور کے نمائندہ سے انھوں نے کی تھی ۔ نمائندہ نے میرے متعلق ان سے دریافت کیا تھا اور انھوں نے جواب میں میری کارروائیوں کے متعلق تقریباً اظہار افسوس کیا تھا لیکن میری دیانتداری کے متعلق اپنا پورا اعتماد ظاہر کیا تھا ۔ کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانگریس کو ان جدید طریقوں کا پابند بناؤں' میرے متعلق جو کچھ انھوں نے کہا اس پر خصوصیت کے ساتھ مجھے کوئی گمان نہیں گذرا لیکن جس بات نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا وہ یہ تھی کہ اس گفتگو کے دوران میں آگے چل کر گاندھی جی نے بڑی بڑی زمینداریوں کے نظام کی حمایت کی تھی' ۔ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ یہ نظام ہماری دیہی اور قومی معیشت کا ایک مفید حصہ ہے ۔ مجھے اس سے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ آج کل بڑی زمینداریوں اور تعلقداریوں کے حامی بہت کم ملیں گے' ۔ دنیا بھر میں ان کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ہندوستان میں بھی اکثر لوگ اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ زیادہ عرصہ تک یہ باقی نہیں رہ سکتی ۔ خود زمیندار اور تعلقہ دار خوش ہوں گے اگر یہ نظام ختم کر دیا جائے ۔ بشرطیکہ انھیں اس کا معقول معاوضہ ملے' [1]

واقعہ یہ ہے کہ یہ نظام خود اپنے ہی بوجھ سے دب کر ڈوب رہا ہے

---

[1] ۔ مسٹر پی' ان ٹیگور صدر مجلس استقبالیہ آل بنگال زمیندار کانفرنس نے اپنے خطبہ صدارت میں ۲۳ دسمبر سنہ ۳۴ء کو کہا تھا کہ ذاتی طور پر مجھے اس بات پر بالکل افسوس نہ ہوگا جب زمینداروں کو مناسب معاوضہ دیکر جائدادیں قومی ملک بنالی جائیں جیسا کہ آئرستان میں کیا گیا تھا" یہ یاد رکھنا چاہیے کہ (بقیہ صفحہ ۳۴۹)

پھر بھی گاندھی جی اس کے حامی ہیں اور اس کی تولیت وغیرہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے ہے'۔ میں نے پھر اس بات پر غور کیا کہ ان کا مطمح نظر مجھ سے کس قدر مختلف ہے اور اس فکر میں پڑ گیا کہ آئندہ کہاں تک میرا اور ان کا اشتراک عمل ہو سکے گا؛ کیا ورکنگ کمیٹی میں میرا رہنا بدستور ضروری ہے؟ اس وقت تو اس کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا اور چند ہفتہ بعد میرے جیل خانہ واپس جانے کی وجہ سے یہ سوال ہی بے محل ہو گیا'۔

خانگی معاملات نے میرا بہت سا وقت لے لیا'۔ والدہ کی صحت روبہ ترقی رہی مگر بہت آہستہ آہستہ۔ وہ اب بھی صاحب فراش تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے مالی معاملات کی طرف متوجہ ہوا جو ایک عرصہ سے بالکل ابتری میں پس پشت پڑے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اپنی استطاعت سے بہت زیادہ خرچ کرتے چلے جا رہے تھے اور اخراجات کم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی کہ اخراجات آمدنی کے مطابق ہو جائیں بلکہ میں تو خوشی کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب میرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا' جدید دنیا میں روپیہ پیسہ اور املاک مفید ضرور ہیں لیکن اکثر اوقات اس شخص کے لئے جو ایک طول طویل سفر کی ٹھان رہا ہو یہ بار بھی بن جاتے ہیں'۔ روپیہ پیسہ والے لوگوں کے لئے

(بقیہ صفحہ ۳۴۸) بندوبست استمراری کی وجہ سے بنگال کے زمیندار دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں جہاں بندوبست استمراری نہیں ہے زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ لیکن مسٹر پی ان، ٹیگور کے خیالات زمینوں کو قومی ملکیت بنانے کے متعلق بہت مبہم معلوم ہوتے ہیں۔

ایسے کاموں میں حصہ لینا بہت مشکل ہو جاتا ہے جن میں خطرات ہوں انھیں ہمیشہ اپنے مال و اسباب کے ضائع ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے' ایسے زر و مال اور جائداد سے فائدہ ہی کیا کہ حکومت جب چاہے اس پر قبضہ کرلے اور زبردستی اسے بحق سرکار ضبط کرلے؟ اس لیئے جو کچھ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اس سے گویا میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم لوگوں کی ضروریات بہت تھوڑی تھیں'۔ اور مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں اپنی قابلیت سے اتنا کما سکتا ہوں مجھے صرف اتنی فکر تھی کہ والدہ کو اخیر عمر میں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور ان کے معیار زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میری لڑکی کی تعلیم میں (جس کے لیئے یورپ کا قیام میرے خیال کے بموجب ضروری تھا) کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اس کے علاوہ روپیہ کی کوئی خاص ضرورت نہ مجھے تھی نہ میری بیوی کو'۔ یا یوں کہا جائے کہ ایسا ہم لوگوں کا خیال تھا اس لئے کہ صحیح معنوں میں کبھی روپئے پیسہ کی تکلیف اٹھانے کے ہم لوگ عادی نہیں رہے تھے، چنانچہ مجھے یہ یقین ہے کہ جب وہ وقت آجائے گا کہ ہم کو روپئے کی قلت محسوس ہو تو ہم اس سے خوش نہ ہوں گے۔ اور ایک اسراف جس کو میں نے ابھی تک جاری رکھا ہے اس کو ترک کرنا میرے لیئے بہت مشکل ہو جائے گا اور یہ کتابوں کی خریداری ہے'۔

اپنی مالی حالت فوری طور پر درست کرنے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بیوی کے زیورات، چاندی کی یا اسی قسم کی اور چیزیں جو ہمارے پاس تھیں اور اس کے علاوہ کئی چھکڑوں بھر مختلف قسم کا سامان گرہستی فروخت کر دیا جائے' زیورات علیحدہ کر دینے کی تجویز کملا کو پسند نہ تھی، حالانکہ گذشتہ دس بارہ سال سے اس نے ایک زیور بھی نہیں پہنا تھا، سب بنک میں رکھے ہوئے

تھے، لیکن اس کی یہ آرزو تھی کہ یہ سب اپنی بیٹی کے حوالہ کردے

یہ جنوری سنہ ۳۲ء کا زمانہ تھا۔ ضلع الہ آباد کے دیہاتوں میں ہمارے کارکنوں کے بے ضرر مشاغل کے باوجود ان کی مسلسل گرفتاریوں کا تقاضا یہ تھا کہ ہم لوگ بھی ان کے نقش قدم پر جائیں اور انھیں دیہاتوں کا دورہ کریں صوبہ متحدہ کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے بہت ہی کام کرنے والے سکرٹری رفیع احمد قدوائی بھی جیل ہی میں تھے، ۲۶ جنوری کا یوم آزادی بھی قریب آرہا تھا، اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے کہ باوجود آرڈی ننس اور امتناعی احکام کے سنہ ۱۹۳۰ء سے یہ دن ہر سال پابندی کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملہ میں رہنمائی کون کرے؟ اور پھر یہ کہ لوگوں کو ہدایت کس بات کی دی جائے، میرے علاوہ اور کوئی تھا نہیں جو آل انڈیا کانگریس کے عہدہ دار کی حیثیت سے عملی نہ سہی نظری طور پر بھی فرائض منصبی ادا کر رہا ہو۔ میں نے چند احباب سے مشورہ کیا اور تقریباً سب اس بات پر متفق تھے کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے، لیکن یہ کہ کیا کیا جائے اس پر اتفاق رائے نہ تھا عام رجحان خیال میں نے یہ دیکھا کہ ایسی کارروائیوں سے اجتناب کیا جائے جن کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ بالآخر یوم آزادی منانے کے متعلق میں نے ایک مختصر اپیل شایع کی اور یہ معاملہ کہ کس صورت سے یہ دن منایا جائے مقامی طور پر ہر علاقہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ خود الہ آباد میں ہم لوگوں نے تمام ضلع میں وسیع پیمانہ پر یوم آزادی منانے کا اہتمام کیا۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جشن یوم آزادی کے منتظمین اس دن گرفتار ہو جائیں گے۔ اس لئے قبل اس کے کہ میں جیل خانہ واپس جاؤں میں بنگال

کا ایک دورہ کرنا چاہتا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنے قدیم رفقائے کار سے وہاں ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن اصل غرض یہ تھی کہ گذشتہ چند سال سے اہل بنگال جو مصائب برداشت کر رہے ہیں اس کی داد دی جائے اور اس طریقہ سے اعتراف کیا جائے میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اعانت اور مدد کے لئے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے اور محض اظہار ہمدردی اور شرکت غم سے کچھ بہت فائدہ نہیں پہنچتا تاہم یہ بھی غنیمت ہے" اور اس وقت بنگال خصوصیت کے ساتھ اپنی کس مپرسی کو محسوس کر رہا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ مصیبت کے وقت میں پورے ہندوستان نے اسے فراموش کر دیا۔ ان کا یہ خیال صحیح تو نہ تھا مگر بہر حال وہ سمجھتے یہی تھے۔

مجھے کملا کے ساتھ کلکتہ اس لئے بھی جانا تھا کہ وہاں اس کے علاج کے متعلق ڈاکٹروں سے مشورہ کروں"۔ اس کی حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہ تھی لیکن ہم دونوں نے ایک حد تک اس کی کوئی پرواہ نہ کی تھی اور کلکتہ یا کسی دوسری ایسی جگہ جانے کا خیال ملتوی کر رکھا تھا کہ جہاں زیادہ مدت تک علاج کے لئے ٹھہرنا پڑے، جیل خانہ کے باہر میری تھوڑے دنوں کی رہائی کے زمانہ میں ہم دونوں چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، پھر جب میں جیل خانہ چلا جاؤں گا تو ڈاکٹروں سے ہر مشورہ اور علاج کے لئے اس کو بہت کافی وقت ملے گا" اور اب چونکہ گرفتاری کا وقت بظاہر قریب آ گیا تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ کلکتہ جا کر اپنی موجودگی میں کم از کم ڈاکٹروں کو دکھلا دیا جائے باقی بعد میں ہوتا رہے گا۔

چنانچہ میں نے اور کملا نے ۱۵ جنوری کو کلکتہ جانا طے کیا اور یہ ارادہ تھا کہ ایسے وقت پر واپس آجائیں کہ یوم آزادی کے جلسوں میں شریک ہو سکیں۔

(۵۸)

زلزلہ

۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو سہ پہر کے وقت میں الہ آباد میں اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا کسانوں کی ایک جماعت سے باتیں کر رہا تھا۔ سالانہ ماگھ میلہ شروع ہو چکا تھا اور دن بھر ہمارے یہاں ملنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ دفعتاً میرے پیر لڑکھڑانے لگے۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور قریب کے ایک کھمبے کا سہارا لینا پڑا۔ سارے گھر کے کواڑ دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ سوراج بھون قریب ہی تھا وہاں سے ایک گھڑگھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی اس لئے کہ بہت سے کھپرے لڑھک لڑھک کر چھت سے نیچے گر رہے تھے۔ مجھے زلزلے سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے پہلے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ مگر پھر فوراً ہی خیال آیا کہ یہ زلزلہ ہے۔ مجھے اس نئے تجربے میں ایک طرح کا لطف آ رہا تھا۔ میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور کسانوں کو زلزلے کا حال بتانے لگا۔ میری بوڑھی چچی کچھ دور سے چلائیں کہ بھاگ کر باہر چلے جاؤ مگر مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوئی۔ میں نے زلزلے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اپنی بوڑھی ماں کو جو کوٹھے پر بستر علالت پر پڑی ہوئی تھیں اور اپنی بیوی کو جو غالباً وہیں سامان سفر باندھ رہی تھی چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔ کچھ دیر جھٹکوں کا سلسلہ جاری رہا پھر ختم ہو گیا۔ چند منٹ زلزلے کے موضوع پر گفتگو رہی اس کے بعد قریب قریب سب اسے بھول گئے۔ اس وقت ہمیں سان گمان بھی نہ تھا کہ ان چند لمحوں میں بہار اور دوسرے مقامات میں لاکھوں آدمیوں پر کیا کچھ گذر گئی۔

اسی دن شام کو میں اور کملا کلکتے روانہ ہو گئے۔ رات کو ہم بے خبری کی حالت میں

زلزلے کے جنوبی رقبے میں ہو کر گذرے۔ دوسرے دن اس حادثے کا کلکتے میں کچھ چرچا نہیں تھا۔ اگلے دن تھوڑی تھوڑی خبریں آنے لگیں۔ چوتھے دن ہمیں اس ہولناک حادثے کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ کلکتے پہنچتے ہی ہم اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ بہت سے ڈاکٹروں سے متعدد مرتبہ ملے اور یہ قطعی طور پر طے ہوگیا کہ کملا علاج کے لئے مہینے دو مہینے بعد واپس آئے گی۔ بہت سے احباب اور کانگریسی رفقا ایسے تھے جن سے ایک مدت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ہر جگہ ایک افسردگی کی کیفیت نظر آرہی تھی۔ لوگ بڑی مصیبتیں اٹھا چکے تھے اس لئے اب قریب قریب کام کے لئے قدم اٹھاتے ڈرتے تھے کہ کہیں انھیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہاں کے اخبارات ہندوستان کے دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ محتاط تھے۔ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوگ آئندہ کام کے بارے میں شبہے اور الجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ اصل میں یہی شبہات ہر قسم کی سیاسی جدوجہد میں مانع تھے ورنہ خوف کچھ اتنا زیادہ نہ تھا۔ ایک طرف فاشستی رجحانات تھے دوسری طرف اشتراکی اور اشتمالی رجحانات مگر سب مبہم تھے اور ایک دوسرے سے خلط ملط ہوگئے تھے۔ ان جماعتوں کی حدود معین کرنا بہت دشوار تھا۔ میرے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ تخویفی تحریک کے متعلق کچھ زیادہ دریافت حال کرسکوں، جس کی طرف حکومت اس قدر متوجہ تھی اور دنیا بھر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی۔ جہاں تک مجھے اندازہ ہو سکا یہ تحریک کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتی اور خود اس جماعت کے پرانے ارکان اب اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے خیالات کا رخ بدل گیا ہے البتہ بنگال میں حکومت کے تشدد سے مشتعل ہو کر کہیں کہیں بعض افراد اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایک ذاتی لڑائی سی چھڑ گئی۔ سچ پوچھیے تو دونوں کے طرز عمل میں جنگ انتقام کا رنگ تھا۔ تخویف پسندوں کی حرکتوں میں تو یہ رنگ بالکل ظاہر تھا۔ حکومت کی طرف سے بھی یہ نہیں تھا کہ ان حرکتوں کو خلاف معاشرت جرائم سمجھ کر سکون کے ساتھ ان کے انسداد کی تدبیریں سوچی جائیں بلکہ وہی صورت تھی جیسے جنگ انتقام میں حریفوں سے بدلہ لیا جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر حکومت جس کو تخویفی حرکتوں سے سابقہ پڑے گا اس پر مجبور

ہو گی کہ ان کا مقابلہ اور انسداد کرے۔ مگر حکومت کی شان یہ ہے کہ اطمینان اور وقار کے ساتھ ان مشکلات پر قابو حاصل کرے نہ یہ کہ بلا تفریق مجرموں اور بے گناہوں، بلکہ زیادہ تر بے گناہوں پر (کیونکہ ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے) حد سے زیادہ تشدد شروع کر دے۔ شاید ایسے خطرے کے وقت اوسان قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ تخویف کی حرکتیں بہت ہی کم ہوتی جاتی تھیں لیکن ان کا امکان ہر وقت موجود تھا اور جن لوگوں کو ان سے سابقہ تھا انھیں بدحواس کرنے کے لئے یہی بات کافی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ حرکتیں خود مرض نہیں بلکہ مرض کی علامتیں ہیں اور اصل مرض کو چھوڑ کر علامات کا علاج کرنا بے سود ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بہت سے نوجوان مرد اور عورتیں جن کی بابت یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھیں تخویف پسندوں سے تعلق ہے، حقیقت میں اس وجہ سے ان کی طرف کھنچتے ہیں کہ خفیہ کارروائیوں میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ سن چلے نوجوانوں کی طبیعتیں ہمیشہ چھپی ہوئی باتوں اور خطرات کی جانب مائل ہوتی ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حالات سے باخبر ہوں اور یہ پتہ چلائیں کہ یہ شور و غوغا کس بات کا ہے اور اس میں پس پردہ کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ گویا جاسوسی کے قصوں کا ذوق انھیں کھینچتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ خود بھی کچھ کریں خصوصاً کسی تخویفی حرکت سے انھیں قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہوتا لیکن پولیس کے نزدیک صرف ان کا مشتبہ لوگوں سے ربط ضبط رکھنا اس کے لئے کافی ہے کہ وہ بھی مشتبہ قرار دئے جائیں اس لئے تھوڑے دن کے بعد اگر وہ اور زیادہ سخت مصیبت میں گرفتار نہ ہوگئے تو نظر بندوں کے کیمپ میں پہنچ جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قابل فخر کارناموں میں سے ایک کارنامہ نظم کا قیام اور قانون کا نفاذ ہے۔ میں بھی طبعاً امن پسند ہوں۔ میں ضبط و نظم کو اچھا سمجھتا ہوں اور بدامنی اور ابتری کو برا سمجھتا ہوں لیکن تلخ تجربات کی بنا پر اس نظم و قانون کی قدر قیمت مجھے مشکوک نظر آتی ہے جو سلطنتیں اور حکومتیں رعایا پر نافذ کرتی ہیں۔ بعض اوقات

ان کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قانون کے معنی ہیں غالب طبقے کی مرضی اور نظم نتیجہ ہے اس عام خوف کا جو سب پر طاری ہے۔ سچ پوچھئے تو بعض اوقات اس نام نہاد نظم و آئین کو بے نظمی اور بے آئینی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ جس کارنامے کی بنیاد عام خوف و دہشت پر ہو اس کو مشکل سے پسندیدہ کہا جا سکتا ہے اور جو امن حکومت کے آلات جبر پر مبنی ہو اور بغیر ان کے قائم نہ رہ سکتا ہو وہ بہ مقابلہ آئینی حکومت کے فوجی تسلط سے زیادہ مشابہ ہے۔

راج ترنگنی ایک ہزار سال کی پرانی اور کلہان شاعر کی لکھی ہوئی کشمیری تاریخی نظم ہے اس میں جو الفاظ نظم و قانون کے معنی میں بار بار آتے ہیں جن کا قائم رکھنا حکمراں اور حکومت کا فرض قرار دیا گیا ہے وہ دھرم اور ابھائے ہیں یعنی راست بازی اور بے خوفی۔ یہاں قانون معمولی قانون سے برتر چیز ہے اور نظم رعایا کی بے خوفی کا نام ہے۔ لوگوں کو خوف زدہ کر کے نظم قائم کرنے کے بجائے بے خوفی کی تلقین کرنے کا خیال کتنا پاکیزہ ہے۔

کلکتے میں ہم لوگوں کے ساڑھے تین دن صرف ہوئے اور اس عرصے میں میں نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میں نے تخویف کی مذمت کی اور اس کے خلاف دلائل پیش کئے۔ اس کے بعد ان تدابیر سے بحث کی جو صوبہ بنگال میں حکومت نے اختیار کی تھیں۔ میں نے بڑے جوش میں تقریر کی کیونکہ اس صوبے میں جو واقعات پیش آ چکے تھے اُن کے حالات سن کر میں بہت متاثر تھا۔ مجھے اس طرز عمل سے حد درجہ تکلیف پہنچی کہ انسانوں کے گروہ کے گروہ بلا تفریق بھیڑ بکری کی طرح باڑوں میں بند کر دئے گئے۔ یہ انسانی وقار کی توہین تھی سیاسی مسئلہ کتنا ہی اہم سہی مگر یہ انسانی مسئلہ اس وقت اس سے مقدم تھا۔ یہی تین تقریریں تھیں جن کی بنیاد پر بعد کو مجھ پر کلکتے میں مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزا جو میں آج کاٹ رہا ہوں انھیں کی وجہ سے ہوئی۔

کلکتے سے ہم لوگ رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے شانتی نکیتن گئے۔ ان سے مل کر ہمیشہ طبیعت کو فرحت ہوتی تھی اس لئے اس قدر قریب آ جانے کے بعد ہمارا جی نہ مانا کہ ان سے

ملے بغیر چلے جائیں۔ اس سے پہلے میں دو بار شانتی نکیتن آچکا تھا کملا پہلے پہل آئی تھی اور خاص طور پر اس مدرسے کو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ ہم لوگ یہ ارادہ کر رہے تھے کہ اپنی لڑکی کو وہاں بھیج دیں۔ اندرا کچھ دنوں میں میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہونے والی تھی اور اس کی آیندہ تعلیم کا مسئلہ ہمیں پریشان کر رہا تھا۔ میں اس کے بالکل خلاف تھا کہ وہ کسی باقاعدہ سرکاری یا نیم سرکاری یونیورسٹی میں داخل ہو کیونکہ ان یونیورسٹیوں کو میں ناپسند کرتا تھا۔ ان کا ماحول بالکل سرکاری جابرانہ اور تحکم پسندانہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ زمانے میں ان یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے قابل مرد اور عورتیں پیدا کی ہیں اور آیندہ بھی کرتی رہیں گی لیکن یہ چند مستثنیات ان یونیورسٹیوں کو اس الزام سے نہیں بچا سکتیں کہ وہ نوجوانوں کے لطیف احساسات کو کچل دیتی ہیں۔ شانتی نکیتن نے اس استبداد سے بچنے کی صورت نکالی تھی اس لئے ہم نے اسی کو منتخب کیا، اگرچہ بعض باتوں کے لحاظ سے وہ دوسری یونیورسٹیوں سے پیچھے تھا۔

واپسی پر ہم پٹنے میں ٹھہرے کہ زلزلے کے مصائب سے نجات دلانے کے مسئلے میں راجندر بابو سے گفتگو کریں۔ وہ ابھی جیل سے چھوٹے تھے اور غیر سرکاری طور پر امداد پہنچانے کا کام لامحالہ انھیں کو شروع کرنا پڑا۔ ہم لوگوں کا وہاں پہنچنا بالکل خلاف توقع تھا اس لئے کہ ہمارا کوئی تار انھیں نہیں پہنچا تھا۔ جس مکان میں ہم کملا کے بھائی کے ساتھ ٹھہرنے والے تھے وہ ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ بہت بڑا پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس لیے ہم لوگوں نے بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح میدان ہی میں قیام کیا۔

دوسرے دن میں مظفرپور دیکھنے گیا۔ زلزلے کو پورے سات روز گذر چکے تھے لیکن سوائے چند خاص خاص سڑکوں کے اور دوسرے مقامات سے ملبہ اٹھانے کا بہت تھوڑا کام کیا گیا تھا۔ ان سڑکوں کی صفائی کے وقت لاشیں بر آمد ہو رہی تھیں۔ بعض لاشوں سے عجیب و غریب انداز نمایاں تھا گویا وہ گرتی ہوئی دیوار یا چھت کو اپنے جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بربادی کا یہ منظر نہایت موثر اور ہولناک تھا۔ جو لوگ بچ رہے تھے انھیں ان دل دوز تجربات

نے بالکل پست کر دیا تھا۔

الہ آباد واپس پہنچنے کے بعد روپیے اور سامان کی فراہمی کا انتظام فوراً شروع کر دیا گیا اور ہم سب خواہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی اس میں سرگرمی سے شریک ہو گئے۔ میرے بعض ساتھیوں کی رائے تھی کہ زلزلے کی وجہ سے یوم آزادی منانا ملتوی کر دینا چاہئے لیکن دوسرے ساتھیوں کو اور خود مجھے اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آئی کہ زلزلے کی وجہ سے ہم اپنا پروگرام بدل دیں چنانچہ ۲۶ جنوری کو ضلع الہ آباد میں دیہات میں متعدد جلسے ہوئے اور ایک جلسہ شہر میں بھی ہوا۔ ان سب میں ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ پولیس مداخلت کرے گی اور گرفتاریاں عمل میں لائے گی۔ چھوٹے پیمانے پر کچھ مداخلت ہوئی بھی لیکن ہم لوگوں کو اس سے بہت تعجب ہوا کہ جلسے کے بعد ہم لوگ کس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ ہمارے یہاں کے بعض گانووں میں اور بعض اور شہروں میں کچھ گرفتاریاں ہوئیں بھی۔

بہار سے واپسی کے بعد ہی زلزلے کے بارے میں میں نے ایک بیان شائع کیا جس کے آخر میں سرمائے کی فراہمی کی درخواست تھی۔ اس بیان میں میں نے حکومت بہار کے اس تساہل پر نکتہ چینی کی جو اس نے زلزلے کے بعد ابتدائی چند دنوں میں کیا۔ میرا منشا ان حکام کی نکتہ چینی کرنا نہ تھا جو زلزلے کے علاقوں میں موجود تھے۔ ان کو ایسے سخت اور مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا جن سے مضبوط سے مضبوط طبیعت کا آدمی بھی گھبرا جاتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے بعض الفاظ کا یہ مطلب بھی نکل سکتا تھا لیکن اس کا مجھے یقیناً دل سے صدمہ تھا۔ بہار کے اعلیٰ حکام نے ابتداءً کچھ زیادہ قابلیت کا ثبوت نہیں دیا خاص کر ملبے کے ہٹانے میں، کیونکہ اگر وہ ہٹا دیا جاتا تو بہت سی جانیں بچ جاتیں۔

اکیلے مونگیر شہر میں ہزارہا آدمی مر گئے اور تین ہفتے گذرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ملبہ ایک بہت بڑی مقدار میں اب بھی پڑا ہوا ہے جس میں ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ حالانکہ چند ہی میل کے فاصلے پر جمال پور میں کئی ہزار ریلوے مزدوروں کی بستی موجود تھی جس سے اس حادثے

کے چند ہی گھنٹے بعد یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ زلزلے کے بارہ دن بعد بھی آدمی زندہ برآمد ہوئے ہیں۔ حکومت نے جائداد کی حفاظت کی فوری تدابیر اختیار کیں لیکن جو لوگ دبے پڑے ہوئے تھے ان کی جانیں بچانے میں اتنی عجلت نہیں کی۔ میونسپلٹیوں کا کام ان علاقوں میں بالکل بند تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرا اعتراض بالکل ٹھیک تھا اور بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ زلزلے کے رقبے میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس سے متفق تھی لیکن چاہے یہ نکتہ چینی صحیح ہو یا نہ ہو ایمانداری سے ضرور کی گئی تھی اور اس کا مقصد حکومت پر الزام لگانا نہ تھا بلکہ اس کے کام میں تیزی پیدا کرنا تھا۔ کسی نے حکومت پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اس نے قصداً غلط طریقے سے کام کیا یا جان بوجھ کر غفلت برتی۔ یہ ایک بالکل نیا اور بہت سخت موقع تھا اس لئے یہ غلطیاں درگذر کے قابل تھیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے (کیونکہ میں جیل میں تھا) حکومت بہار نے بعد کو محنت اور قابلیت سے زلزلے کی تباہ کاریوں کی تلافی کا کام انجام دیا۔

لیکن میری نکتہ چینی سے ناراضگی پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد بہار کے چند لوگوں نے حکومت کی حمایت میں ایک بیان شائع کر دیا جو میرے اعتراضات کا گویا جواب تھا۔ اس میں زلزلے اور اس کی ضرورتیں ان کے نزدیک محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ اہم بات یہ تھی کہ حکومت کی نکتہ چینی کی گئی اس لئے وفادار رعایا کا فرض تھا کہ اس کی صفائی پیش کرے۔ یہ ایک دلچسپ مثال ہے اس عجیب و غریب چیز کی جو ہندوستان میں بہت عام ہے یعنی حکومت پر نکتہ چینی کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ مغربی ممالک میں یہ معمولی بات ہے۔ یہ نوکری ذہنیت ہے جو نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بادشاہ کی طرح ہندوستان میں حکومت برطانیہ اور اس کے تمام اعلیٰ حکام خطا سے بالاتر قرار دئے گئے ہیں۔ ایسی کسی بات کی طرف اشارہ بھی کرنا بغاوت سمجھا جاتا ہے۔

اس کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ بھی ہے کہ حکومت پر ظلم و جور کا الزام لگانا اتنا زیادہ برا نہیں مانا جاتا جتنا نااہلی اور ناقابلیت کا الزام لگانا۔ ظلم و جور کا الزام لگانے والا بے شک جیل

پہنچایا جاسکتا ہے لیکن حکومت اس قسم کے الزامات کی عادی ہوچکی ہے اس لئے اصل میں اس کا کچھ زیادہ خیال نہیں کرتی۔ ایک حیثیت سے یہ تمام باتیں ایک حکمران قوم کی صفات میں داخل سمجھی جاسکتی ہیں لیکن اگر اسے ناقابل اور بودا کہا جائے تو تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ اس سے اُس کی خودپسندی کی جڑیں ہل جاتی ہیں اور ہندوستان کے انگریز حکام کا ادّعائے مسیحائی باطل ہوجاتا ہے۔ ان کی مثال کلیسائے انگلستان کے اس اسقف کی سی ہے جو بے دینی کے الزام کو صبر وتحمل سے برداشت کرتا تھا لیکن جب کوئی اس کو احمق اور ناقابل کہتا تو وہ ناراض ہوتا اور سختی سے جواب دیتا۔

انگریزوں کا عام عقیدہ ہے جس کا اعلان اکثر اس طور سے کیا جاتا ہے کہ گویا یہ ایک ناقابل انکار کلیہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت میں کوئی ایسا تغیر کیا گیا جس سے برطانوی اثر کم یا زائل ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت اور زیادہ ابتر اور خراب ہوجائے گی۔ انتہا پسند اور بلند نظر انگریز اس عقیدے کے باوجود جوش ہمدردی میں ہندوستانیوں کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اچھی حکومت اپنی حکومت کا بدل کبھی نہیں ہوسکتی اور اگر ہندوستانی اپنے پیروں میں آپ کلھاڑی مارنا چاہتے ہیں تو ان کو ایسا کرنے دیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ برطانوی اثر کے زائل ہوجانے کے بعد ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا دارومدار زیادہ تر اس پر ہے کہ برطانیہ کس صورت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اس وقت ہندوستان پر کس طبقے کی حکومت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قومی اور بین الاقوامی امور قابل لحاظ ہیں۔ بالکل قرین قیاس ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی مدد سے ایسی حکومت قائم ہو جو موجودہ حکومت سے بدتر ہو، جس میں موجودہ حکومت کی تمام خرابیاں ہوں اور خوبیاں کوئی نہ ہوں۔ مگر اس سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ہندوستان کا نظم بالکل بدل جائے اور وہ اہل ہند کے نقطۂ نظر سے موجودہ نظم سے کہیں بہتر اور مفید تر ہو۔ شاید اس وقت حکومت کے جابرانہ آلات اتنے کارگر نہ ہوں اور اس کی انتظامی مشین میں یہ چمک دمک نہ ہو مگر یہ یقینی بات ہے کہ دولت کی پیداوار اور اس کا صرف بہت بہتر ہوگا اور ان امور میں ترقی ہوگی جو عام لوگوں کے جسمانی، روحانی اور تمدنی معیار کو بلند کرتے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ خود اختیاری حکومت ہر ملک

ے لیے اچھی ہے لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں کہ اگر غیروں کی حکومت سچ مچ اچھی ہو تو اُسے مثال اپنی بری حکومت قائم کروں۔ اگر حکومت خود اختیاری کو اپنی فوقیت ثابت کرنا ہے تو لازمی طور پر اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ مفاد عامہ کے لیے بہتر ثابت ہو۔ مجھے دل سے یقین ہے کہ برطانوی حکومت کا استحقاق عہد ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو موجودہ زمانے میں وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتی کہ عام لوگوں کے لیے اچھی حکومت ثابت ہو اور ان کے معیار زندگی کو بلند کر سکے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دن پورے ہو چکے اور اس کے فوائد جتنے کچھ بھی تھے ختم ہو گئے۔ سچ پوچھیے تو ہندوستان کے دعوائے آزادی کی بنا اسی امید پر ہے کہ آزاد حکومت بہتر حکومت ہوگی، عوام کے معیار زندگی کو بلند کر دے گی، ملک کی صنعت اور تہذیب کو ترقی دے گی اور اس خوف اور دہشت کی فضا کو دور کر دے گی جو ہمیشہ غیر ملکی شہنشاہی حکومت کے جلو میں ہوتی ہے۔ حکومت برطانیہ اور اس کی سول سروس چاہے اتنی قوی ہو کہ اپنا حکم ہندوستان سے منوالے لیکن اس میں یہ اہلیت اور قابلیت نہیں ہے کہ ہندوستان کے آیندہ مسائل تو ایک طرف موجودہ مسائل کو بھی حل کر سکے اس لیے کہ اس کی بنیادیں اور اس کے تصورات سراسر غلط ہیں اور وہ حقیقی حالات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ ایک حکومت یا حکمراں طبقہ جس میں کافی قابلیت نہیں ہے، یا جس کی بنیادیں پائدار نہیں ہیں زیادہ عرصے تک جبر سے بھی کام نہیں چلا سکتا۔

الہ آباد میں جو انجمن بہار کے مصیبت زدوں کی امداد کے لیے قائم ہوئی تھی اس نے مجھے متعین کیا کہ میں زلزلے کے علاقے کا معائنہ کروں اور وہاں جو طریقے امداد پہنچانے کے اختیار کیے گئے تھے ان کی بابت رپورٹ پیش کروں۔ میں فوراً تنہا چل کھڑا ہوا اور دس دن تک برابر برباد شدہ علاقے میں پھرتا رہا۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا اور مجھے اس عرصے میں رات کو نیند بھر سونا بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۵ بجے صبح سے لے کر قریب قریب آدھی رات تک ہم لوگ دوڑ دھوپ کیا کرتے تھے۔ کبھی موٹر میں سوار ہو کر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گزرتے تھے کبھی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ان مقامات کو پار کرتے تھے جہاں پل منہدم ہو گئے تھے اور سڑکیں سطح سے تہ و بالا ہو جانے سے

زیرِ آب تھیں۔ شہروں اور قصبوں کا منظر کچھ کم ہیبت ناک نہ تھا۔ ان کے کھنڈر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑکوں میں شگاف پڑ گئے تھے اور اس قدر الٹ پلٹ گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی دیو پیکر ہاتھ نے انھیں توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے شگافوں سے پانی اور ریت پھوٹ نکلی تھی اور سیلاب کا زور آدمیوں اور جانوروں کو بہائے گیا تھا مگر ان قصبات سے بھی زیادہ شمالی بہار کے میدانوں میں جنھیں گلشن بہار کہا جاتا تھا ویرانی اور تباہی کے آثار نمایاں تھے۔ میلوں تک ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔ رقبے کے رقبے زیرِ آب تھے۔ زمین میں جا بجا بڑے بڑے شگاف اور بے شمار چھوٹے چھوٹے آتش فشاں کے سے دہانے تھے جن سے یہ ریت اور پانی نکلا تھا۔ چند برطانوی افسر جو اس علاقے پر ہوائی جہازوں میں پرواز کر چکے تھے کہتے تھے کہ یہ علاقہ کچھ اس شکل سے مشابہت رکھتا ہے جو دورانِ جنگ میں یا اس کے فوراً بعد شمالی فرانس کے میدانِ جنگ کی ہو گئی تھی۔

یہ تجربہ کس قیامت کا ہوگا! لوگوں سے معلوم ہوا کہ پہلے تو زلزلے کی لہر ایک جانب سے دوسری جانب گذر گئی اور جتنے آدمی کھڑے تھے سب گر گئے۔ پھر ایک ہالا ڈولا آیا اور ایک گڑگڑاہٹ اور گونج پیدا ہوئی جیسے بہت سی توپیں چھوٹ رہی ہوں یا سیکڑوں ہوائی جہاز اڑ رہے ہوں۔ بے شمار مقامات پر بڑے بڑے شگافوں اور دہانوں سے پانی اُبل اُبل کر دس بارہ فٹ اونچا جانے لگا۔ یہ حالت غالباً تین منٹ یا اس سے کچھ ہی زیادہ رہی لیکن یہ تین منٹ قیامت کے تھے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس واقعے کے بہت سے دیکھنے والے یہ سمجھے کہ اب دنیا کا خاتمہ ہے۔ شہروں میں مکانات کے گرنے کا شور برپا تھا پانی زوروں میں بہہ رہا تھا اور فضا گرد و غبار سے مکدر تھی جس کی وجہ سے چند گز کے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں گرد زیادہ نہیں تھی اس لئے وہاں دور تک نظر پہنچ سکتی تھی مگر اس وقت کون تھا جو اطمینان سے یہ تماشا دیکھتا جو بچ گئے تھے وہ زمین پر پڑے تھے اور وحشت سے مرے جاتے تھے۔

شاید مظفر پور میں ایک بارہ سال کا کمسن لڑکا دس دن بعد کھود کر زندہ نکالا گیا وہ سخت متحیر تھا۔ جس وقت گرتے ہوئے ملبے نے اس کو گرا کر قید کر دیا تو وہ سمجھا کہ دنیا کا خاتمہ ہو گیا ہے

اور ایک وہی بچ رہا ہے۔

اسی مظفر پور میں عین زلزلے کے وقت جب مکانات گر رہے تھے اور ہر طرف سینکڑوں آدمی مر رہے تھے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ناتجربہ کار نوجوان سخت پریشان تھے اور ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ماں اور لڑکی دونوں صحیح سلامت ہیں۔ زلزلے کی یادگار میں لڑکی کا نام کمپو دیوی رکھا گیا۔

ہمارے دورے میں آخری مقام شہر مونگیر تھا۔ ہم لوگ بہت دور دور پھرے تھے اور قریب قریب نیپال کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ ہم نے بہت سے ہیبت ناک سین دیکھے تھے اور ہماری آنکھیں تباہی اور بربادی کے نظارے کی عادی ہو چکی تھیں مگر جب مونگیر جیسے مرفہ الحال شہر کی کامل ویرانی پہ نظر پڑی تو ہم لوگ دہشت سے کانپ اٹھے۔ مجھے وہ خوفناک منظر کبھی نہ بھولے گا۔

زلزلے کے علاقے میں ہر جگہ، خواہ شہر ہوں یا دیہات، باشندوں میں اپنی آپ مدد کرنے کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ غالباً شہر کے اوسط طبقے اس بارے میں سب سے زیادہ قصوروار تھے۔ وہ سب اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے کہ حکومت یا کوئی غیر سرکاری امدادی جماعت پہنچ کر ان کی مدد کے لئے کچھ کرے۔ بعض لوگ جنھوں نے امدادی کاموں کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں یہ سمجھتے تھے کہ کام سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کو حکم دیا جائے کہ ایسا ایسا کرو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے بسی کچھ اس وجہ سے بھی پھیلی ہوئی تھی کہ زلزلے کی دہشت نے سب کو بدحواس کر دیا تھا اور یہ حالت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ہوگی۔

اس کے مقابلے میں ان لوگوں کی ہمت اور مستعدی خاص طور پر نمایاں تھی جو امداد رسانی کا کام کرنے کے لئے بہار کے دوسرے حصوں اور غیر صوبوں سے بکثرت آ رہے تھے۔ ان نوجوان مردوں اور عورتوں کے جذبہ خدمت اور کارکردگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور باوجود اس کے کہ متعدد امدادی جماعتیں جدا جدا کام کر رہی تھیں، ان میں بڑی حد تک اتحاد عمل تھا۔

میں نے مونگیر میں کوشش کی کہ ملبہ کھودنے میں لوگ اپنی مدد آپ کریں اور اس تحریک کو ابھارنے کے لیے ایک نمائشی حرکت کی۔ میں نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے یہ قدم اٹھایا مگر اس میں پوری کامیابی ہوئی۔ سب امدادی جماعتوں کے رہنما پھاوڑے اور ٹوکرے لے کر پہنچ گئے اور دن بھر کھدائی کا کام کرتے رہے۔ ہم لوگوں نے ایک کم سن لڑکی کی لاش کھود کر نکالی۔ میں تو اسی دن مونگیر سے چلا آیا لیکن کھدائی ہوتی رہی اور بہت سے مقامی لوگوں نے اس کام کو اٹھا لیا جس سے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

تمام امدادی جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم مرکزی امدادی جماعت تھی جس کے صدر راجندر پرشاد تھے۔ یہ خالص کانگریسی جماعت نہیں تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہ ایک آل انڈیا (پورے ہندوستان کی) جماعت بن گئی جس میں مختلف گروہوں اور معطیوں کے نمائندے شامل تھے۔ ایک خاص آسانی اس کو یہ تھی کہ وہ دیہاتی علاقوں میں کانگریس کمیٹیوں سے کام لے سکتی تھی۔ ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں، سوا گجرات یا بعض اضلاع ممالک متحدہ کے، کانگریسی کارکنوں کا اتنا زیادہ گہرا تعلق اور ربط ضبط کسانوں سے نہیں ہے جتنا کہ میں نے صوبہ بہار میں دیکھا بلکہ اصل میں کانگریس کے زیادہ تر کارکن کسان ہی تھے۔ صوبہ بہار کسانوں کا صوبہ ہے اور اس صوبے کے متوسط طبقے کے لوگ بھی کسانوں میں شامل ہیں۔ کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے بارہا بہار کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر کا معائنہ کرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے بعض اوقات سخت الفاظ میں اس ابتری اور سستی پر اعتراض کیا جو مجھے دفتر کے کام میں نظر آئی۔ لوگ کھڑے رہنے سے زیادہ بیٹھنے اور بیٹھنے سے زیادہ لیٹنے کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ کوئی دفتر سازوسامان سے خالی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ بہت سی ایسی چیزوں کے بغیر کام چلائیں جو دفتر کے معمولی لوازم میں داخل ہیں مگر باوجود ان اعتراضات کے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کانگریس کے نقطہ نظر سے یہ صوبہ ملک بھر میں سب سے زیادہ مستعد اور وفادار تھا۔ وہاں کانگریس اپنے کام کی کوئی نمائش نہیں کرتی تھی لیکن اس کو کسانوں کی زبردست تائید

حاصل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی بہار کے ممبر شاذ و نادر ہی کسی معاملے میں پیش قدمی کرتے تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں تعجب ہو کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ لیکن سول نافرمانی کی دونوں تحریکوں میں بہار نے نمایاں کارنامے دکھائے اور بعد کی انفرادی سول نافرمانی میں بھی اچھا کام کیا۔

کانگریس کی اس عمدہ تنظیم کی بدولت امدادی کمیٹی نے کسانوں تک پہنچنے کی صورت نکالی۔ دیہاتی علاقوں میں نہ کوئی دوسری جماعت اور نہ خود حکومت اتنی مفید ہو سکتی تھی۔ امدادی کمیٹی و نیز صوبہ بہار کی کانگریس دونوں کے صدر راجندر بابو تھے جو بہار کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ سرزمین بہار کے بسنے والوں کی تمام خصوصیات ان میں نمایاں ہیں۔ ان کی صورت کسانوں کی سی ہے اور پہلی نظر میں دیکھنے والا کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد ان کی آنکھیں جن سے تیزی اور صاف دلی اور ان کا چہرہ جس سے جوش اور خلوص ٹپکتا ہے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ کوئی شخص جس نے ان آنکھوں کو اور اس چہرے کو ایک بار دیکھ لیا ہے انھیں کبھی نہیں بھول سکتا اس لئے کہ ان میں صداقت کا جلوہ نظر آتا ہے جس میں کھوٹ کا نام تک نہیں۔ کسانوں کی سی طبیعت ہونے کی وجہ سے شاید ان کا زاویۂ نظر کسی قدر محدود ہے اور آج کل کے معیار سے وہ سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی نمایاں قابلیت، ان کی کامل راست بازی، ان کا جوش عمل، ان کا ہندوستان کی آزادی کے لئے جان لڑا دینا وہ اوصاف ہیں جنھوں نے ان کو نہ صرف اپنے صوبے میں بلکہ سارے ہندوستان میں محبوب بنا دیا ہے۔ رہنمائی کا جو مسلمہ مرتبہ راجندر بابو کو بہار میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی صوبے میں کسی شخص کو حاصل نہیں ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جن کی بابت یہ کہا جا سکے کہ انھوں نے گاندھی جی کے پیام کی حقیقی روح کو ان سے زیادہ جذب کیا ہے۔

بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان جیسا آدمی بہار کے امدادی کام کی رہنمائی کے لئے مل گیا اور یہ اس اعتماد کا نتیجہ تھا جو لوگ ان پر رکھتے تھے کہ ہندوستان بھر سے اس قدر کثیر تعداد میں روپیہ ملا۔ ان کی صحت کمزور تھی مگر وہ امدادی کام میں جٹ گئے۔ انھیں حد سے زیادہ کام

کرنا پڑا اس لئے کہ ساری جدو جہد کا مرکز انھیں کی ذات تھی اور ہر شخص انھیں سے ہدایت اور مشورہ لیتا تھا۔

جب میں زلزلے کے علاقے میں دورہ کر رہا تھا یا شاید وہاں جانے سے ایک آدھ روز پہلے مجھے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا کہ زلزلہ چھوت چھات کی سزا ہے۔ انھوں نے یہ ایسی بات کہی کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کا جو جواب دیا وہ مجھے بہت پسند آیا اور میں اس سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔ سائنس کے نقطۂ نظر سے یہ بات اس قدر بعید تھی کہ اس سے بعید تر کوئی چیز تصور میں نہیں آسکتی۔ یہ مانا کہ جذباتی کیفیات یا نفسی واردات کا جو اثر مادے پر پڑتا ہے اس کے متعلق سائنس صحیح حکم لگانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ دماغی صدمے کے اثر سے انسان کو بدہضمی ہو جائے یا اس کے جسم پر اس سے بھی زیادہ اثر پڑے لیکن یہ کہنا کہ انسانی رسوم یا کوتاہیوں کے کوئی اثرات سطح ارضی کی حرکت پر پڑیں گے سخت حیرت ناک ہے۔ گناہ، غضب الٰہی، اور نظام کائنات میں انسان کی اہمیت کا تخیل ہم کو چند صدی پیچھے ڈھکیل کر اس زمانے میں لے جاتا ہے جب یورپ میں کلیسا کے احتساب کا دور دورہ تھا۔ گیورڈانو برونو علمی تحقیقات کے جرم میں ملحد قرار دے کر جلا دیا گیا تھا اور بہت سی عورتیں سحر کے الزام میں آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔ امریکا میں اٹھارھویں صدی میں بھی بوسٹن کے سربرآوردہ پادریوں نے میساچوسٹس کے زلزلے کا سبب اس بدعت کو ٹھہرایا تھا کہ عمارتوں پر برق ربا سلاخیں نصب کی گئی تھیں۔

اگر زلزلے کو عذاب الٰہی تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ ہمارے کس گناہ کی سزا ہم کو دی جارہی ہے کیونکہ افسوس! ہمارے گناہ لاتعداد ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی توجیہہ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سزا ہم کو اس لئے دی گئی ہو کہ ہم ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی پر راضی ہیں یا اس لئے کہ ہم ایک ظالمانہ سماجی نظام کو برداشت کر رہے ہیں۔ مہاراجہ دربھنگہ کو جو ایک بہت بڑے زمیندار ہیں، مالی حیثیت سے زلزلے کی وجہ سے بہت بڑا نقصان پہنچا۔

اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظام زمینداری کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ یہ اس سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ بہار کے کم و بیش بے گناہ لوگوں کو جنوبی ہندو والوں کی چھوت چھات کے گناہ کی سزا ملے۔ یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آخر خود چھوت چھات کی سرزمین پر زلزلہ کیوں نہیں آیا؟ یا حکومت برطانیہ کہہ سکتی ہے کہ یہ عذاب سول نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی بہار نے جسے زلزلے سے بہت زیادہ نقصان پہنچا آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

غرض ہم اس طرح کی بے شمار قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم قضا و قدر کے کاموں میں دخل ہی کیوں دیں اور اپنی انسانی جد و جہد سے عذاب الٰہی کے نتائج کو ہلکا کرنے کی کوشش کیوں کریں؟ پھر ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ قدرت نے یہ ستم ظریفی ہمارے ساتھ کیوں روا رکھی کہ ہمیں کمزور اور خطاکار بنایا، ہماری راہ میں قدم قدم پر پھندے لگا دیے، دنیا کو مصیبت اور ظلم سے معمور کر دیا، شیر اور بھیڑیے کو پیدا کیا اور پھر ہمیں کو سزا بھی دیتی ہے۔

جب ستاروں نے اپنی شعاعوں کے تیر پھینک دیے،
اور آسمان کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیا،
تو کیا وہ اپنی مخلوق کو دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے؟
کیا تجھے بھی اسی نے پیدا کیا ہے جو میمنے کا پیدا کرنے والا ہے؟

میں اپنے پٹنے کے قیام کی آخری شب میں بہت رات گئے تک اپنے رفیقوں اور دوستوں سے گفتگو کرتا رہا جو امدادی کام میں شریک ہونے کے لئے مختلف صوبوں سے آکر جمع ہو گئے تھے۔ ممالک متحدہ کی نمائندگی کافی تھی اور ہمارے بعض چیدہ کارکن وہاں موجود تھے ہم لوگ ایک اہم مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ وہ یہ تھا کہ ہم کو زلزلے کے امدادی کام میں کس حد تک حصہ لینا چاہئے کیونکہ اسی حد تک ہمیں سیاسی کام سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ امدادی کام

بہت محنت طلب تھا اور سرسری طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہم اسی کے ہو رہتے تو ایک بڑی مدت تک عملی سیاسی جدوجہد سے الگ رہنا ضروری تھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا کہ سیاسی حیثیت سے ہمارے صوبے پر اس کا برا اثر پڑتا۔ یوں تو کانگریس کے کارکنوں کی کمی نہ تھی لیکن ایسے لوگ جن کی شرکت اور عدم شرکت کا اثر پڑتا ہے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں اور ان کے بغیر کام چلنا مشکل تھا۔ تاہم زلزلے کے مصیبت زدوں کے تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں صرف امدادی کام میں منہمک ہو کر رہ جاؤں۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کام کے لئے تو بہت سے آدمی مل جائیں گے مگر دوسرا کام ذرا خطرناک ہے اس کے لئے بہت کم آدمی ہیں۔

ہم لوگ بہت دیر تک یہی گفتگو کرتے رہے۔ پھر گذشتہ یوم آزادی کا ذکر چھڑ گیا کہ ہمارے فلاں فلاں ساتھی گرفتار ہو گئے اور ہم بچ گئے۔ میں نے ان لوگوں سے ہنستے ہنستے کہا کہ میں نے ایسی ترکیب معلوم کر لی ہے کہ آدمی جارحانہ سیاست کے باوجود گرفتاری سے بچا رہے۔

۱۱ فروری کو میں الہ آباد واپس آیا۔ اس دورے کے بعد تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دس دن کی سخت محنت سے میں پیلا پڑ گیا تھا اور میرے اعزا کو میری صورت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے الہ آباد کی امدادی انجمن کے لئے رپورٹ لکھنے کی کوشش کی لیکن نیند غالب آ گئی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم بارہ گھنٹے میں نے سونے میں گزار دیئے۔

دوسرے دن شام کے قریب میں اور کملا چائے پی چکے تھے اور پرشوتم داس ٹنڈن ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ ہم لوگ برآمدے میں کھڑے تھے کہ ایک موٹر آ کر رکی اور اس سے ایک پولیس کا افسر اترا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میرا وقت آ گیا ہے۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا کہ "بہت دنوں سے آپ کا انتظار تھا"۔ وہ کسی قدر عذر خواہی کے انداز میں بولا کہ میرا قصور نہیں ہے یہ وارنٹ کلکتے سے آیا ہے۔

پانچ مہینے تیرہ دن باہر رہنے کے بعد میں پھر اپنے گوشہ تنہائی میں واپس آ گیا۔

اصل میں میرے لئے کوئی مشکل نہ تھی مصیبت بے چاری عورتوں یعنی میری بیمار ماں، بیوی اور بہن کی تھی اور اب کیا ہمیشہ ہی ہوتی تھی۔

(۵۹)

علی پور جیل

"میں اس حالت اور کیفیت سے اب کتنی دور ہوں، کیا میں اب بھی اس جھاڑی دار درخت کی لٹوں کی طرح بلا کسی رکاوٹ کے ان ہلکی ہلکی ہواؤں میں اُڑتا رہوں جہاں راستہ دکھانے والا کوئی دمساز ستارہ نہیں ہے۔ (رابرٹ براؤننگ)

اسی رات مجھے کلکتہ لے گئے اور ہوڑا اسٹیشن سے ایک بہت بڑی اور سیاہ رنگ کی کار یا گاڑی میں لال بازار پولیس کی چوکی پر پہنچا دیا کلکتہ کے اس مشہور صدر تھانہ کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اس لئے ذرا دلچسپی کے ساتھ میں نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ یوروپین سارجنٹ اور تھانہ داروں کی بہت بڑی تعداد نظر آئی، جتنی شمالی ہند کے کسی صدر تھانہ میں نہیں ہوتی، سپاہی تقریباً تمام صوبہ بہار کے یا صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے، جیل خانہ کی بڑی لاری میں متعدد بار مجھے جیل خانہ سے عدالت آنا جانا پڑا یا اگر ایک جیل خانہ سے دوسرے جیل خانہ جانا ہوا تو ان سپاہیوں میں سے کچھ لوگ اندر بیٹھ کر میرے ہمراہ ہوتے تھے یہ لوگ بے حد رنجیدہ نظر آتے تھے، اپنی نوکری سے بیزار تھے اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ انھیں بڑی ہمدردی تھی، اور کبھی کبھی ان کی آنکھیں نم بھی ہو جاتی تھیں۔

ابتداءً مجھے پریسیڈنسی جیل میں رکھا گیا، وہاں سے چیف پریسیڈنسی

مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کے لئے مجھے لیجاتے تھے ۔ یہاں مجھے عجیب وغریب تجربہ ہوا، عدالت کا کمرہ اور پوری عمارت کی ظاہری شکل وصورت بجائے کھلی ہوئی کچہری کے ایک محصور قلعہ کی سی معلوم ہوتی تھی سوائے چند اخباری نمائندوں اور وکیلوں کے جو وہاں ہوتے ہی ہیں کسی اور آدمی کو کہیں آس پاس تک آنے کی اجازت نہیں تھی ۔ پولیس کے سپاہی البتہ خاص تعداد میں موجود تھے، لیکن یہ انتظامات بظاہر خاص طور پر میری وجہ سے نہیں کئے گئے تھے، یہ وہاں روزانہ کا دستور تھا۔ جب مجھے عدالت کے کمرہ میں لے گئے، تو کمرہ کے اندر ایک لمبے راستہ سے مجھے گذرنا پڑا جس کے اوپر اور اِدھر اُدھر دونوں طرف تاروں کی جالی لگی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجرے میں چل رہے ہیں، ملزم کا کٹہرا مجسٹریٹ کی کرسی سے بہت دور تھا، اور عدالت کا کمرہ پولیس کے سپاہیوں سے اور وکیلوں سے بھرا تھا جو سیاہ کوٹ اور چغے پہنے ہوئے تھے ۔

عدالتی مقدموں کا میں خاصا عادی تھا۔ میرے بہت سے مقدمات جیل خانہ کے اندر ہی ہوتے تھے، لیکن ہمیشہ کچھ دوست عزیز اور جان پہچان کے لوگ موجود ہوتے تھے، جس سے یہ پوری فضا اتنی زیادہ مکدر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پولیس کے سپاہی بھی بالعموم ذرا علیحدہ رہتے تھے، اور پنجرے کی شکل کی کوئی چیز آس پاس نہیں ہوتی تھی، لیکن یہاں حالت بالکل مختلف تھی اور میں گھور گھور کر اجنبی اور ناواقف لوگوں کی طرف دیکھتا تھا جن میں اور مجھ میں کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ مجمع کچھ زیادہ دلکش بھی نہ تھا، اور میرا تو خیال ہے کہ وکلا جب چغے پہن کر اکھٹے ہوجاتے ہیں تو یہ اجتماع کچھ زیادہ حسین بھی نہیں معلوم ہوتا، اور پولیس کی مخصوص عدالتوں کے وکلا، تو خصوصیت کے ساتھ ایک مہیب شکل اختیار کرلیتے ہیں آخر کار میں نے کسی طرح ایک وکیل کی صورت

پہچانی جو پیچھے کی قطار میں تھے، لیکن پھر وہ بھی اس مجمع میں گم ہو گئے۔

مقدمہ شروع ہونے سے قبل بھی جب میں باہر کی طرف برآمدہ میں بیٹھا تھا تو مجھے اپنی تنہائی اور سب لوگوں سے علیحدگی بہت محسوس ہوئی اس وقت میری نبض کی حرکت بھی یقیناً تیز ہو گئی ہو گی، اور اندرونی طور پر طمانیت قلب بھی اتنی نہ تھی جتنی کہ اس سے پہلے مقدمات کے دوران میں رہا کرتی تھی، اس وقت مجھے یہ بات کھٹکی کہ اگر مجھ سا آدمی جو اتنے مقدمات اور سزاؤں کا تجربہ حاصل کر چکا ہے ایسے حالات میں غیر معمولی طور پر گھبرا سکتا ہے تو پھر نوجوان اور ناتجربہ کار لوگوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔

ملزم کے کٹہرے کے اندر جا کر پھر میری حالت ذرا بہتر ہو گئی، حسب معمول نہ میں نے کوئی صفائی پیش کی اور نہ پیروی کی، صرف ایک مختصر سا بیان پڑھ کر سُنا دیا۔ دوسرے دن ۵ رفروری کو مجھے دو برس کی سزا دے دی گئی اور ساتویں مرتبہ میری قید کی مُدت شروع ہوئی۔

اب جو میں ساڑھے پانچ ماہ کے جیل سے باہر کے قیام پر نظر ڈالتا تھا تو مجھے اطمینان اور خوشی ہوتی تھی کہ میرا وقت اچھی طرح صرف ہوا، اور میں نے اس عرصہ میں بعض مفید کام کیے۔

والدہ نے بیماری پر قابو پا لیا تھا اور فوری طور پر کوئی خطرہ ان کے لئے نہ تھا، میری چھوٹی بہن کرشنا کی شادی ہو گئی تھی میری لڑکی کی آئندہ تعلیم کا بندوبست ہو گیا تھا، میں نے اپنے بعض خانگی اور مالی دشواریوں کو بھی درست کر لیا تھا، اور بہت سے ذاتی معاملات جنھیں میں نے ایک عرصہ سے نظر انداز کر رکھا تھا ان کا بھی کچھ انتظام ہو ہی گیا، سیاسی امور کا جہاں تک تعلق ہے میں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی شخص کچھ زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا

میں نے کم از کم اتنا کیا کہ کانگریس کے طرزِ عمل کو تھوڑا اور کس دیا اور ایک حد تک اس کو معاشرتی اور معاشی نقطۂ نظر سے غور و فکر کرنے کی طرف مائل کیا۔ پہلے تو گاندھی جی کے ساتھ میری پونا والی خط و کتابت سے اور اس کے بعد میرے مضامین سے جو اخبارات میں شائع ہوئے کچھ فرق پیدا ہوا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ پر میرے مضامین سے بھی کچھ فائدہ ضرور ہوا، اس کے علاوہ تقریباً دو برس کے بعد میں گاندھی جی سے اور دوسرے دوستوں اور ساتھیوں سے مل لیا اور اس ملاقات سے میں نے اپنی رگوں میں اور اپنے جذبات میں ایک نئی قوت ایک مدت کے لئے اور حاصل کر لی تھی۔

صرف ایک بات البتہ میرے لئے پریشان کن رہی اور وہ کملا کی علالت تھی، اس وقت مجھے اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ کتنی علیل ہے، اس لئے کہ اس کی عادت ہے کہ جب تک بالکل گر ہی نہ پڑے کام چلاتی رہتی ہے، بہرحال میں متفکر اور پریشان تھا، لیکن اس کے باوجود توقع تھی کہ اب چونکہ میں جیل خانہ میں ہوں اس کو فرصت ملے گی کہ اپنے علاج کی طرف توجہ کرے جب تک میں باہر رہا اس وقت تک اس کے لئے یہ ذرا دشوار تھا اس لئے کہ وہ مجھے زیادہ عرصہ تک چھوڑنے کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی۔

ایک بات کا مجھے اور بھی افسوس تھا کہ میں نے ایک بار بھی ضلع الہ آباد کے دیہاتی علاقہ کو جا کر نہیں دیکھا، میرے بہت سے نوجوان ساتھی جو وہاں ہم لوگوں کی ہدایت کے مطابق کام کرنے گئے تھے، گرفتار ہو گئے تھے اور ان کے پیچھے ضلع کے اندر دیہاتوں میں نہ جانا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ بے وفائی کرنا ہے۔

ایک بار پھر سیاہ رنگ کی قیدیوں کی گاڑی مجھے جیل خانہ واپس لے گئی راستہ

میں ہم لوگ ایک بہت بڑی فوج کے پاس سے گذرے جو مشین گن، فوجی موٹر کار وغیرہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر جا رہی تھی، جیل خانہ کی گاڑی کے اندر چھوٹے چھوٹے روشندانوں سے جھانک کر میں نے ان کو دیکھا اور اپنے دل میں سوچنے لگا کہ فوجی موٹر کار اور ٹینک بھی کتنے بدشکل ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے قرون قبل تاریخ کے مہیب دیو ہیکل اور اسی طرح کے دوسرے جانور یاد آ گئے۔

مجھے پریسیڈنسی جیل سے علی پور مرکزی جیل میں منتقل کر دیا گیا، اور وہاں مجھے ایک کوٹھری ملی جس کی لمبائی چوڑائی تقریباً نو فٹ اور آٹھ فٹ ہوگی، اس کے سامنے ایک برآمدہ اور ایک چھوٹا سا صحن تھا، صحن کے ارد گرد کی دیوار ذرا نیچی تھی، تقریباً ۷ فٹ کی ہوگی اس کے دوسری طرف ایک عجیب منظر مجھے نظر آیا۔ ہر قسم کی عجیب عجیب عمارتیں تھیں، کوئی ایک منزل کی کوئی دو منزلہ کوئی گول ہے تو کوئی مستطیل چھتیں بھی عجیب وغریب، یہ عمارتیں ہر چہار طرف کھڑی تھیں، ان میں سے بعض عمارتیں دوسری عمارتوں سے اونچی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمارتیں ایک ایک کر کے کھڑی ہوتی گئیں اور کچھ اس طرح اپنی اپنی جگہ جما دی گئیں کہ جتنا بھی رقبہ تھا وہ سب پوری طرح کام میں آ جائے۔ تقریباً یہ نقشہ تھا جیسے کوئی گورکھ دھندا ہو یا کسی "استقبالی" مصور کی تخیلی کاوش۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہی سمجھایا گیا کہ یہ عمارتیں ترتیب سے بنائی گئی ہیں جس کے بیچ میں ایک مینارہ ہے (جو عیسائی قیدیوں کے لئے گرجا کا کام دیتا ہے) اور وہیں سے قطاریں پھوٹ کر نکلتی ہیں چونکہ جیل خانہ شہر میں تھا اس لئے اس کا رقبہ بہت محدود تھا اور اس کے چپہ چپہ زمین کو کام میں لانا ضروری تھا،

میں اپنے ارد گرد کی ان بظاہر عجیب و غریب عمارتوں کو پہلی بار دیکھکر بمشکل اپنے حواس درست کر سکا تھا کہ ایک اور ہیبت ناک منظر دکھائی دیا میری کوٹھری اور اس کے صحن کے ٹھیک سامنے دو چمنیاں تھیں جنمیں سے سیاہ اور کثیف دھوئیں کے بگولے نکل رہے تھے، اور کبھی کبھی ہوا اس دھوئیں کو میری طرف اُڑا لاتی تھی جس سے دم گھٹنے لگتا تھا' یہ چمنیاں جیل کے باورچی خانہ کی تھیں' میں نے بعد میں سپرنٹنڈنٹ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اس حملہ کی مدافعت کے لئے گیس کے نقاب فراہم کرنا چاہیئے۔

جیل کی زندگی کی یہ ابتدا کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھی' اور مستقبل بھی زیادہ خوش آئند نہ تھا یعنی علی پور جیل کی سرخ اینٹوں والی عمارتوں کے غیر متغیر منظر سے لطف اندوز ہوتے رہنا اور اس کے باورچی خانہ کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو نگلنا اور سانس کے ساتھ اندر لینا۔ میرے صحن میں نہ کوئی درخت تھے نہ سبزہ' پورا کا پورا فرش پختہ' پکا اور صاف ستھرا رہتا تھا، (سوائے اس کوڑے کے جو دھوئیں کی وجہ سے ہر روز ہو جایا کرتا تھا) لیکن وہ بھی بالکل خالی اور ویران تھا'۔ پاس کے صحن میں ایک یا دو درختوں کی پھنگیاں مجھے دکھائی دیں، لیکن میں جس زمانہ میں پہنچا ان میں نہ کوئی پتی تھی نہ پھول'۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک پراسرار تبدیلی ان میں ہوئی اور ان کی تمام شاخوں پر ہری ہری کونپلیں پھوٹ کر نکلنے لگیں، کونپلوں سے پتیاں نکلیں اور جلدی جلدی بڑھ کر انھوں نے سر سبز شاخوں کو اپنے خوشگوار سبزہ سے چھپا لیا یہ ایک ایسی خوشگوار تبدیلی تھی جس سے علی پور جیل میں بھی رونق اور زندگی معلوم ہونے لگی

انھیں میں سے ایک درخت میں چیل کا ایک گھونسلا تھا جس سے مجھے دلچسپی ہو گئی میں اکثر اس کی طرف دیکھا کرتا تھا چیل کے بچے بڑے ہو رہے تھے

اور اپنے کاروبار کے گُر بھی سیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ نہایت تیز رفتاری اور نشانہ کی حیرت انگیز صحت سے نیچے جھپٹتے اور قیدی کے ہاتھ سے روٹی بلکہ منہ سے نوالہ تک جھپٹ کرلے جاتے تھے۔

غروب آفتاب کے وقت سے لے کر طلوع آفتاب تک (کم وبیش) ہم لوگ اپنی کوٹھریوں میں مقفل رہتے تھے، اور جاڑوں کی طویل شام کا کاٹنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ساعت بہ ساعت جب میں لکھتے لکھتے یا پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو اپنی کوٹھری کے اندر ٹہلنا شروع کرتا تھا، اور وہ بھی کیا چار پانچ قدم آگے جانا اور پھر پیچھے لوٹنا۔ اس وقت مجھے جانور گھر کے ریچھ یاد آتے تھے جو کٹہرے میں بند آگے پیچھے ٹہلتے ہیں۔ بعض اوقات جب میرا جی بہت زیادہ اکتا جاتا تھا تو میں اپنا مرغوب علاج (شرش آسن) سر کے بل کھڑے ہو کر کیا کرتا تھا!

رات کے ابتدائی حصہ میں کچھ خاموشی رہتی تھی اور شہر کی کچھ آوازیں اندر آجایا کرتی تھیں مثلاً ٹرام گاڑی کا شور، گراموفون کی آواز، یا کہیں دور سے کسی شخص کے گانے کی آواز، دور سے دھیمی دھیمی موسیقی کی آواز سن کر ذرا فرحت ہوتی تھی، لیکن کچھ رات گذرنے کے بعد پھر زیادہ آرام نہیں ملتا تھا اس لئے کہ پہرہ کے سپاہی ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہتے تھے، اور ہر گھنٹہ کوئی نہ کوئی معائنہ ہوتا رہتا تھا۔ بعض افسر لالٹین لے کر آتے تھے یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ ہم لوگ بچکر بھاگ تو نہیں گئے، ہر روز یا یوں کہنا چاہیئے کہ ہر رات کو تین بجے ایک بڑا شور اور مٹی سے برتن مانجھنے اور رگڑنے کا عمل ہوا کرتا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باورچی خانہ میں کام شروع ہو گیا۔

محافظ، پہرہ دار، افسر اور منشی بہت بڑی تعداد میں پریسیڈنسی

جیل میں بھی متعین تھے اور علی پور جیل میں بھی۔ ان دونوں جیل خانوں کی آبادی اور نینی جیل کی آبادی تقریباً برابر برابر تھی یعنی ۲۲۰۰ سے ۲۳۰۰ تک لیکن ان میں سے ہر جیل خانہ کا عملہ نینی جیل کے عملہ سے دُگنا تھا۔ ان میں بہت سے یورپین وارڈر، اور ہندوستانی فوج کے پنشن یافتہ افسر تھے۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بہ نسبت صوبہ متحدہ کے کلکتہ میں حکومت برطانیہ کا انتظام زیادہ زوردار اور زیادہ مسرفانہ ہیں۔ سلطنت برطانیہ کی قوت اور جبروت کی ایک نشانی اور مستقل طور پر یاد دہانی کرنے والی ایک بات اور تھی کہ جب اعلیٰ افسر قیدیوں کے قریب آتے تھے تو قیدیوں کو ایک نعرہ زور سے لگانا پڑتا تھا یہ نعرہ "سرکار سلام" کا ہوتا تھا جو ذرا لمبی آواز اور ایک خاص جسمانی حرکت کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا، اس نعرہ کی آوازیں دن میں کئی بار میرے صحن کی دیوار کے اُس طرف سے آیا کرتی تھیں اور بالخصوص اس وقت جب سپرنٹنڈنٹ صاحب روزانہ وہاں سے گذرتے تھے۔ میں سات فُٹ کی اونچی دیوار کی دوسری طرف ایک بہت بڑے شاہی چتر کا صرف اوپر کا حصہ دیکھ سکتا تھا جس کے سایہ میں یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب چلا کرتے تھے۔

معلوم نہیں کہ "سرکار سلام" کا یہ غیر معمولی نعرہ اور جس انداز سے یہ لگایا جاتا تھا زمانہ قدیم کی ایک یادگار ہے۔ یا کسی ذہین انگریز افسر کی ایجاد ہے، لیکن میرا گمان ہے کہ کسی انگریز افسر ہی کی یہ ایجاد ہوگی۔ اس کی آواز میں ایک خاص اینگلو انڈین لہجہ پایا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے ممالک متحدہ کے جیلوں میں اور غالباً علاوہ بنگال اور آسام کے اور کسی صوبہ میں یہ نعرہ رائج نہیں ہے۔ جس طریقہ سے یہ زبردستی کا سلام سرکار کی عظمت و جبروت کے سامنے کیا جاتا ہے مجھے باعث تذلیل معلوم ہوتا تھا۔

البتہ علی پور جیل میں ایک اصلاح دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ معمولی قیدیوں کا کھانا ممالک متحدہ کے جیل کے کھانے سے بہت زیادہ بہتر تھا۔ جہاں تک جیل کی خوراک کا تعلق ہے ممالک متحدہ بہت سے صوبوں سے گیا گذرا ہے۔

جاڑوں کا مختصر زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا، بہار کے دن بھی یوں ہی گذر گئے اور گرمیاں شروع ہوئیں روز بروز گرمی بڑھتی گئی۔ مجھے کلکتہ کی آب و ہوا کبھی پسند نہ تھی، تھوڑے دن بھی اس آب و ہوا میں رہنا ہوتا تو طبیعت پژمردہ اور پست ہو جاتی تھی، جیل میں حالات قدرتاً اور بھی ابتر تھے اور جیسے جیسے دن گذرتے گئے میری صحت کچھ اچھی نہ رہی غالباً اس وجہ سے کہ ورزش کے لئے جگہ نہ تھی اور دیر تک اس آب و ہوا میں مقفل رہنا پڑتا تھا میری صحت پر کسی قدر اس کا برا اثر پڑا اور میرا وزن تیزی سے کم ہونے لگا۔ مجھے تالوں اور چٹخنیوں سے لوہے کے سیخچوں اور دیواروں سے بڑی نفرت پیدا ہونے لگی۔

علی پور جیل میں ایک مہینہ کے بعد مجھے اپنے صحن سے باہر کچھ ورزش کرنے کی اجازت ملی۔ یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی اور میں اب اصل دیوار کے نیچے صبح شام ٹہل لیا کرتا تھا، رفتہ رفتہ میں علی پور جیل اور کلکتہ کی آب و ہوا کا عادی ہو گیا، اور باورچی خانہ اور اس کا دھواں اور شور غل بھی ایک قابل برداشت مصیبت بن گیا۔ اب دوسرے معاملات میرے دماغ میں سمانے لگے، دوسری پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ باہر کی خبریں کچھ خوش کن نہ تھیں۔

(٦٠)

مشرقی اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ

علی پور جیل میں مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ سزا یابی کے بعد پھر مجھے کوئی روزنامہ اخبار منگانے کی اجازت نہ ہوگی۔ جب تک میرا مقدمہ زیر سماعت رہا کلکتے کا روزنامہ اسٹیٹسمین مجھے مل جاتا تھا، لیکن جس دن مقدمہ ختم ہوا اس کے دوسرے ہی دن سے یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں ۱۹۳۲ء سے برابر ایک روزانہ اخبار (جس کو حکومت پسند کرے) درجہ الف یا اول قسم کے قیدیوں کو دینے کی اجازت تھی۔ یہی حال اکثر دوسرے صوبوں میں تھا اور اسی وجہ سے غالباً میرا یہ گمان تھا کہ یہی قاعدہ بنگال میں بھی ہوگا۔ بہرکیف بجائے روزنامہ اسٹیٹسمین کے اب ہفتہ وار اسٹیٹسمین مجھے دیا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ اخبار صرف ان انگریز افسروں کے لئے ہوتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں یا ان تاجروں کی دلچسپی کے لئے ہوتا ہے جو انگلستان واپس چلے گئے ہوں، اس میں ایسی ہی خبروں کا خلاصہ دیا جاتا ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیرونی خبریں اس میں بالکل نہیں دی جاتی تھیں اور چونکہ میں ان خبروں کو بالالتزام پڑھنے کا عادی تھا اس لئے ان کا نہ ہونا اور بھی محسوس ہوتا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے پھر ہفتہ وار مانچسٹر گارجین منگانے کی مجھے اجازت مل گئی اور اس کے ذریعے میں یورپ اور بین الاقوامی معاملات سے باخبر رہنے لگا۔

فروری میں جب میری گرفتاری اور مقدمہ ہوا اسی زمانے میں یورپ میں بڑے تلخ جھگڑے لڑائیاں اور ہنگامے ہوئے۔ فرانس میں ہنگاموں کا نتیجہ فاشستی طبقوں کی صورت میں ظاہر ہوا اور ایک قومی حکومت کی تشکیل ہوئی، اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت آسٹریا

میں تھی جہاں چانسلر ڈالفس نے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر آسٹریا کی جمہوریت کا قلع قمع کر دیا۔ آسٹریا میں خون ریزی کی خبروں نے مجھے بہت ہی افسردہ کیا۔ یہ دنیا بھی کیسی بری اور مصیبت کی جگہ ہے اور انسان بھی کتنا وحشی ہو جاتا ہے جب وہ اپنے مستقل اغراض کی حفاظت کرنے پر تل جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں فاشزم پھیلتا جا رہا ہے۔ جرمنی میں جب ہٹلر کا اقتدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ اس کی حکومت غالباً زیادہ عرصے تک نہیں رہے گی اس لئے کہ جرمنی کی مالی مشکلات کا اس نے کوئی حل نہیں پیش کیا تھا۔ اسی طرح جہاں کہیں اور فاشزم پھیلا میں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید ترقی دشمنی کا یہ آخری مورچہ ہے اور اس کے بعد یقیناً وہ وقت آئے گا کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن پھر سوچتا تھا کہ یہ میرے خیالات ہیں یا میری آرزوئیں، کیا یہ واقعی اتنی ہی بدیہی بات ہے کہ فاشزم کی رَو اس قدر آسانی اور تیزی سے فرو ہو جائے گی اور اگر فاشستی مطلق العنانی (ڈکٹیٹرشپ) کے لئے حالات بالکل ناقابل برداشت بھی ہو جائیں تو ایسی حالت میں کیا وہ لوگ اپنے ملکوں کو تباہ کن جنگوں میں نہ پھنسا دیں گے بجائے اس کے کہ خود ہار مان لیں؟ اور پھر اس کشمکش کا حشر آخر کیا ہوگا!

اسی اثنا میں قسم قسم کا فاشزم دنیا میں پھیلا۔ اسپین جہاں ایمان دار لوگوں کی جمہوری حکومت کا جدید نظام قائم ہوا تھا جس کے متعلق کسی نے خوب کہا کہ بس گویا ہو بہو حکومتوں کا منچسٹر گارجین ہے، وہ بھی بری طرح رجعت پسندی کی طرف واپس لوٹ گیا تھا۔ وہاں کے ایمان دار لبرل رہنماؤں کی اچھی اچھی باتوں کے باوجود اس کو پیچھے کی طرف پھسلنے سے نہیں روکا جا سکا۔ ہر جگہ لبرل تحریک جدید حالات کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ وہ لوگ بس الفاظ اور جملوں کے پیچھے پڑے رہے اور نادانی سے یہ سمجھتے رہے کہ باتیں بنانا اور کام کرنا برابر ہے، چنانچہ جب کوئی نازک موقع آیا تو وہ اسی طرح چپ چاپ غائب ہوگئے جیسے کسی قلم کے آخری حصے کا اختتام ہوتا ہے۔

آسٹریا کے المناک حالات پر مسٹر گارجین کا مقالہ افتتاحیہ ہم نے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور اس کو پسند کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ "معلوم نہیں اس خون ریز جھگڑے کے بعد آسٹریا کی کیا صورت ہو گی؟ کیا آسٹریا پر اب یورپ کے سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ بندوقوں اور مشین گنوں کے زور سے حکومت کریں گے؟" "لیکن اگر انگلستان آزادی کا حامی ہے تو آخر اس کے وزیر اعظم کی زبان اتنی خاموش کیوں ہو گئی ہے۔ ہم نے ان کی زبان سے ڈکٹیٹر شپ کی تعریفیں سنی ہیں، ہم نے انھیں یہ کہتے سنا ہے کہ اس کی بدولت قوموں کی روح کیسے زندہ ہوتی ہے اور ایک نیا نقطہ نظر اور نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔" "اس لئے انگلستان کے وزیر اعظم کو ان بے رحمیوں اور سفاکیوں کے متعلق بھی کچھ اظہار خیال کرنا چاہیئے، خواہ وہ کسی ملک سے تعلق رکھتی ہوں، جو اکثر جسموں کو قتل کرتی ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ روح کو موت کا منہ دکھاتی ہیں اور اس سے کہیں بری موت کا۔"

لیکن خود مسٹر گارجین اگر آزادی کا حامی ہے تو جب ہندوستان میں آزادی کا سر کچلا جاتا ہے اس وقت اس کی زبان سے کچھ کیوں نہیں نکلتا؟ ہم لوگوں نے بھی نہ صرف جسمانی تکالیف برداشت کی ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ مصیبت ہے جو ہماری روح نے جھیلی ہے۔

"آسٹریا کی جمہوریت تباہ کر دی گئی، گو اس نے آخر دم تک مقابلہ کیا جس سے اس کی عظمت اور شان ہمیشہ قائم رہے گی اور ایک ایسی داستان باقی رہے گی جس سے شاید آئندہ پھر کبھی یورپ کی آزادی کی چنگاری روشن ہو جائے۔"

"یورپ اب آزادی کی سانس نہیں لے سکتا اس لئے کہ وہ آزاد نہیں رہا۔ اب وہاں صحیح قسم کے جذبات اور خیالات کا اظہار اور تبادلہ مفقود ہے، رفتہ رفتہ دم گھٹنے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اب سوائے اس کے کہ کوئی شدید لرزے کی کیفیت یا اندر ہی اندر سے کوئی تشنجی کیفیت ظاہر ہو اور خود بخود دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ مارنا شروع کر دیا جائے

تو شاید اس فالج سے بچ سکے جو دماغ پر گرنے والا ہے‘ ...... دریائے رھائن سے لے کر کوہ یورال تک یورپ ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔“

یہ وہ دل ہلانے والی عبارتیں تھیں جن کی صدائے بازگشت میرے دل سے بھی اٹھی لیکن اسی کے ساتھ میں حیرت سے سوچتا تھا کہ آخر ہندوستان کے متعلق کیا ہو گیا ہے؟ مینچسٹر گارجین یا آزادی کے دوسرے حامی جن کا وجود انگلستان میں یقیناً ہے ہماری حالت کی طرف سے ایسے بے خبر کیوں ہیں؟ جس بات کو دوسری جگہ وہ اس قدر جوش سے پیدا کرتے ہیں اس کی طرف سے یہاں کیسے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ایک بہت بڑے انگریز لبرل لیڈر نے جن کی تعلیم و تربیت اور پرورش انیسویں صدی کے ماحول اور روایات میں ہوئی تھی‘ جو طبعاً بہت محتاط اور بہت سنبھل کر گفتگو کرنے والے آدمی تھے‘ بیس سال ہوئے جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل کہا تھا کہ ”بجائے اس کے کہ میں خاموشی کے ساتھ قانون کے مقابلے میں تشدد کی اس افسوسناک کامیابی کا نظارہ دیکھوں میں یہ پسند کروں گا کہ ہمارا یہ ملک صفحۂ تاریخ سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔“ یہ ایک بہادرانہ خیال تھا جو نہایت فصاحت سے بیان کیا گیا اور انگلستان کے لاکھوں جاں باز نوجوان اس کے تحفظ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن آج اگر کوئی ہندوستانی مسٹر اسکوئتھ کی طرح کوئی بیان دینے کی جرأت کرے تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔

قوموں کی نفسی کیفیت بھی کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے نہ اپنے متعلق ہم میں سے اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ تو حق و انصاف پر ہیں باقی دوسرے لوگ اور دوسرے ممالک غلطیاں اور ناانصافیاں کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی طرح نہیں ہیں کچھ فرق ضرور ہے لیکن آداب شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے اور اگر خوش قسمتی سے ہم لوگ ایک حکمران قوم ہونے کی حیثیت سے دوسرے ممالک کی قسمتوں کے مالک ہوں تو پھر تو یہ یقین نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس بہترین دنیا

میں جو کچھ ہو رہا ہے یہی سب سے بہتر ہے اور جو لوگ اس کے خلاف شور کرتے ہیں وہ یا تو خود غرض ہیں یا فریب خوردہ احمق جو ہماری بخشی ہوئی نعمتوں اور برکتوں پر ناشکری کرتے ہیں۔

برطانوی لوگ ایک جزیرے کی رہنے والی قوم ہیں اور مسلسل کامیابی اور مرفہ الحالی کی وجہ سے وہ تمام دوسرے لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ کسی نے ان کے متعلق کہا ہے کہ ان کے خیال میں تو حبشیوں کی بستی کیلے سے شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ الفاظ بہت زیادہ عام ہیں۔ غالباً برطانیہ کے اعلیٰ طبقوں کی نظر سے دنیا کو تقریباً حسب ذیل درجوں میں تقسیم کیا جائے گا (۱) برطانیہ۔ اس کے بعد بہت جگہ چھوڑ کر پھر (۲) برطانوی نوآبادیات (صرف گورے رنگ کی آبادیاں) اور امریکہ (لیکن صرف اینگلو سیکسن۔ باقی دوسرے یورپی ملکوں کے مہاجر اس میں شامل نہیں) (۳) مغربی یورپ (۴) یورپ کا باقی حصہ (۵) جنوبی امریکہ (لاطینی اقوام) اس کے بعد پھر بہت جگہ چھوڑ کر (۶) ایشیا اور افریقہ کی سانولے، زرد اور سیاہ رنگ کی اقوام سب کو کم و بیش ایک ہی طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم آخری درجے والے ان بلندیوں سے کتنی دور ہیں جہاں ہمارے حکمراں رہتے ہیں! پھر یہ کیا کوئی تعجب کی بات ہے کہ جب کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے ہیں تو انہیں سب دھندلا دھندلا دکھائی دیتا ہے اور پھر جب ہم لوگ لگتے ہیں آزادی اور جمہوریت کی بات چیت کرنے تو انہیں اس سے چڑ ہوتی ہے۔ یہ الفاظ (آزادی و جمہوریت) شاید ہم لوگوں کے لئے نہیں بنے ہیں۔ ایک بہت بڑے لبرل مدبر جان مارلے نے کیا یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ مستقبل بعید میں بھی وہ ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت کا تصور کبھی نہیں کر سکتے۔ کناڈا کے بالوں والے لبادے کی طرح ہندوستان کی آب و ہوا کے لئے جمہوری نظام حکومت موزوں اور مناسب ہی نہیں ہے۔ اور بعد میں برطانیہ کے مزدوروں کی جماعت نے جو تحریک اشتراکیت کی علم بردار اور غریبوں کی حامی اور مددگار سمجھی جاتی ہے اپنی فتح و کامیابی کے جوش میں ہم لوگوں کو ۱۹۲۴ء میں جو تحفہ دیا وہ بنگال

آرڈیننس کی تجدید کی صورت میں تھا۔ اور ان کے دوسرے دورِ حکومت میں ہماری قسمت پہلے سے بھی زیادہ کھوٹی نکلی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں، اور جب وہ اپنے واعظانہ انداز میں ہمیں مخاطب کر کے کہتے ہیں "پیارے اور محبوب بھائیو" تو ان کا دل نیکی کے احساس سے یقیناً منور ہو جاتا ہے لیکن بہرحال ہم ان کی نظروں میں وہ نہیں ہو سکتے جو وہ خود ہیں اور ہمیں دوسرے ہی معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ جب ایک انگریز اور ایک فرانسیسی لسانی اور تمدنی اختلافات کی وجہ سے ہم خیال نہیں ہو سکتے تو پھر ایک انگریز اور ایک ایشیائی میں کتنا زبردست فرق ہوگا۔

حال ہی میں ہندوستان کے اصلاحات کے مسئلے پر دارالامرا میں بحث و مباحثے ہو رہے تھے اور معزز امرا نے کئی بصیرت افروز تقریریں کیں۔ ان میں سے ایک تقریر لارڈ لٹن کی تھی جو ہندوستان کے ایک صوبے میں سابق گورنر رہ چکے ہیں اور جنھوں نے کچھ عرصے تک وائسرائے کی قائم مقامی بھی کی تھی۔ ان کے متعلق اکثر کہا گیا ہے کہ وہ آزاد خیال اور بہت بہادر گورنر تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا[۱] کہ "مجموعی حیثیت سے حکومت ہند ہندوستان کی اس سے کہیں زیادہ نمائندگی کرتی ہے جتنی کہ کانگریسی سیاسئین۔ حکومت ہند نمائندگی کر سکتی ہے حکام کی طرف سے، فوج اور پولیس کی طرف سے، والیانِ ریاست کی طرف سے اور ہندو مسلمان دونوں کی طرف سے۔ برخلاف اس کے کانگریس کے سیاسئین جملہ فرقوں میں کسی ایک فرقے کی بھی نیابت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔" آگے چل کر انھوں نے اپنے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیا کہ "جب میں ہندوستان کی رائے عامہ کا ذکر کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہیں جن کے تعاون عمل پر مجھے بھروسا کرنا پڑا تھا اور آئندہ بھی وائسرائے اور گورنروں کو جن کے تعاون پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔"

---

[۱] دارالامرا، ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء

اس تقریر سے دو بہت دلچسپ باتیں نکلتی ہیں، ایک تو یہ کہ ہندوستان سے مطلب صرف وہ ہندوستان ہے جو برطانیہ کی مدد کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں سب سے زیادہ نمائندہ جماعت ہے اس لئے اس ملک میں سب سے زیادہ جمہوری ادارہ یہی ہے۔ چونکہ یہ دلیل سنجیدگی سے پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہر سویز کے اس پار انگریزی الفاظ کے معنی کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دلیل کے بعد بظاہر دوسرا دعویٰ یہ کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ بادشاہ ہر شخص کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے مطلق العنان حکومت سب سے زیادہ نمائندہ اور جمہوری ہوتی ہے۔ اور اس صورت سے ہم لوگ ایک بار پھر اس نظریے پر پہنچ جاتے ہیں کہ بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے اور "ریاست کیا ہے میں ہی ریاست ہوں۔"

واقعہ یہ ہے کہ حال ہی میں خالص مطلق العنانی کی حمایت بھی ایک بہت ہی ممتاز شخص نے کی ہے۔ انڈین سول سروس کے مایۂ ناز رکن سر میلکم ہیلے نے بحیثیت گورنر صوبجات متحدہ ۵ نومبر ۱۹۳۴ء کو بنارس میں تقریر کرتے ہوئے دیسی ریاستوں میں مطلق العنانی کی حمایت کی تھی۔ حالانکہ اس قسم کی نصیحت کی چنداں ضرورت نہ تھی اس لئے کہ کوئی دیسی ریاست خود اپنی مرضی سے مطلق العنانی کو ترک کرنے والی نہیں معلوم ہوتی۔ اور ایک دلچسپ بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مطلق العنانی کی حمایت کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یورپ میں جمہوریت ناکامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسماعیل نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ "ایک طرف پارلیمنٹری جمہوریت ہر جگہ زوال پذیر ہے اور دوسری طرف کا پا پلٹ دینے والی اصلاحات کی تائید کی جا رہی ہے" اور "مجھے یقین ہے کہ اس ریاست کا ضمیر گواہی دے گا کہ ہمارا موجودہ دستور اساسی ہماری تمام ضروریات کے لئے عملاً کافی طور پر جمہوری ہے۔"[1]

---

[1] میسور، ۱۲ جون ۱۹۳۴ء، ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۳ کا حاشیہ۔

ریاست میسور کا ضمیر غالباً مہاراجہ اور دیوان کے لئے ایک مابعد الطبیعی تصور ہے۔ میسور میں جس قسم کی جمہوریت اس وقت رائج ہے اس میں اور مطلق العنانی میں کوئی فرق نہیں۔

اگر ہندوستان کے لیے جمہوری نظام حکومت موزوں نہیں ہے تو یقیناً مصر کے لئے بھی اسی طرح یہ نظام جمہوری ناموزوں ہوگا۔ میں نے ابھی اسٹیٹسمین[٥] میں (اس لئے کہ یہ اخبار اب موجودہ جیل میں مجھے دیا جاتا ہے) قاہرہ کا ایک طویل مراسلہ پڑھا ہے۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ وزیر اعظم نسیم پاشا نے "ذمہ دار حلقوں میں اپنے اس اعلان سے کچھ کم خطرہ نہیں پیدا کیا ہے کہ انھیں توقع ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں سے اور بالخصوص وفد جماعت سے اشتراک عمل حاصل ہوگا اور یا تو ایک مقامی کانفرنس ہوگی یا Constituent Assembly کے لئے انتخابات ہوں گے لیکن بہر صورت ایک جدید دستور اساسی کی تشکیل کی جائے گی۔ اس کا مطلب بالآخر صرف یہ ہوگا کہ ایک جمہوری نظام حکومت کی طرف پھر عود کیا جائے حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے لئے یہ طرز حکومت ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوا، اس لئے کہ ماضی میں اس نے ہمیشہ عوام الناس کے خراب سے خراب جذبات کا پاس اور لحاظ کیا۔ جو شخص بھی مصری سیاست کی اندرونی حالت سے کچھ بھی واقف ہے اس کو ایک لمحے کے لئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انتخابات میں ایک بار پھر وفد جماعت اکثریت کے ساتھ منتخب ہوگی۔ اس لئے اگر اس طریق کار کو روکنے کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تو کچھ عرصے کے بعد ایک بار ہمارے سر ایک ایسی حکومت ڈالی جائے گی جو ضرورت سے زیادہ جمہوری، پردیسیوں کی مخالف، انقلابی حکومت ہوگی۔"

یہ تجویز کی گئی ہے کہ انتخابات اس طرح کرائے جائیں کہ وفد جماعت کے توڑ کے لئے حکومت کے اثر اور اقتدار سے کام لیا جائے لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم کا "دماغ اتنا

---

[٥] ١٩ دسمبر ٣٤ء

زیادہ قانونی واقع ہوا ہے" کہ وہ اس قسم کی کوئی بات نہیں کرسکتے۔ اس کے علاوہ دوسری صورت یہ باقی رہ گئی ہے کہ وھائٹ ہال مداخلت کرے اور" یہ جتلا دے کہ اس قسم کی حکومت کو وہ دوبارہ برداشت نہ کرے گا۔"

اب یہ میں نہیں جانتا کہ وھائٹ ہال اس معاملے میں کوئی کارروائی کرے گا یا نہیں یا مصر میں کیا ہوگا[1] لیکن اس سے جو غالباً ایک حریت پسند انگریز نے پیش کی ہے ہمیں ہندوستان اور مصر کے حالات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں کسی قدر مدد ضرور ملے گی۔ اسٹیٹسمین نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ: "خرابی کی جڑ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ مصری رائے دہندے کا طرز زندگی اور زاویۂ نگاہ اس طرز زندگی اور زاویۂ نگاہ سے مطابقت نہیں رکھتا جس سے جمہوریت کی نشوونما ہوتی ہے۔" اس عدم مطابقت کی مثال آگے چل کر دی گئی ہے "یورپ میں بالعموم جمہوریت کا قائمہ اس لئے ہوا کہ وہاں بہت زیادہ جماعتیں تھیں اور مصر میں یہ مشکل درپیش ہے کہ وہاں صرف ایک ہی جماعت ہے یعنی وفد۔"

ہندوستان میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری فرقہ وارانہ تقسیم ہماری جمہوری ترقی میں حائل ہے اور اس لئے اس ناقابل تردید منطق کی وجہ سے ان تقسیموں کو مستقل طور پر قائم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ پورے طور پر متحد نہیں ہیں۔ مصر میں کوئی فرقہ وارانہ اختلافات نہیں ہیں اور بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مکمل سیاسی اتحاد قائم ہے۔ اس کے باوجود یہی اتحاد آزادی اور جمہوریت کی راہ میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ جمہوریت کا راستہ بالکل سیدھا اور تنگ ہے۔ ایک مشرقی ملک کے لئے جمہوریت کے معنی صرف یہ معلوم ہوتے ہیں کہ فرماں روا سلطنت کے احکام کی تعمیل کی جائے اور اس کے مفاد کو نہ چھوا جائے۔ صرف اس ایک شرط کے بعد جمہوری آزادی بلا روک ٹوک یہاں پھل پھول سکتی ہے۔

---

[1] نومبر ۱۹۳۵ء میں برطانوی تسلط کے خلاف مصر بھر میں بلوے ہوئے تھے۔

(۶۱)

اُداسی

"اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنا سر اس جگہ رکھ دوں جہاں گھاس ٹھنڈی ٹھنڈی اور خوشگوار ہو۔ اے ماں یہ تھکا ہوا بچہ تیرے قدموں میں پڑا ہے، اس کے سارے خواب اس کے دل سے محو ہو گئے ہیں۔"

اپریل کا مہینہ آگیا۔ باہر کے واقعات کی کچھ اُڑتی اُڑتی خبریں علی پور جیل کی کوٹھری میں میرے کانوں تک پہنچیں۔ اور یہ خبریں بہت ناخوشگوار اور پریشان کن تھیں۔ ایک روز جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اور باتوں کے سلسلے میں مجھ سے یہ کہا کہ مسٹر گاندھی نے تحریک سول نافرمانی کو روک دیا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہ خبر میرے لئے خوش آئند نہ تھی اور مجھے اس چیز کے ختم ہو جانے کا قلق ہوا جس میں میں نے اپنے آپ کو کئی سال سے محو کر دیا تھا۔ پھر بھی اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ اس کا خاتمہ تو بہرحال ہونا ہی تھا۔ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت سول نافرمانی کو کم از کم کچھ مدت کے لئے بند کرنا ہی پڑے گا، افراد تو بے شک نتائج کی پروا کئے بغیر ایک غیر محدود مدت تک مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن قومی ادارے اس طریقے سے کبھی کام نہیں کرتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں مطلق شبہ نہ تھا کہ گاندھی جی نے عام ملک کی اور اکثر کانگریسی کارکنوں کی ذہنی کیفیت کا صحیح اندازہ کیا ہے اس لئے ہرچند کہ یہ جدید تبدیلی ناخوشگوار تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

میں نے یہ افواہ بھی سنی کہ کونسلوں میں جانے کی غرض سے سوراج پارٹی کو دوبارہ

زندہ کرنے کی ایک نئی تحریک اٹھائی گئی ہے۔ یہ چیز بھی ناگزیر سی معلوم ہوتی تھی اور ایک عرصے سے میری یہ رائے تھی کہ کانگرس آئندہ انتخابات سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتی۔ جیل خانے سے باہر پانچ مہینے کی آزادی کے زمانے میں میں نے اس رجحان کو روکنے کی کوشش کی تھی اس لئے کہ میں اسے قبل از وقت سمجھتا تھا اور مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے عملی جدوجہد ٹھنڈی پڑ جائے گی اور پھر عام کانگریسیوں میں سماجی تبدیلیوں کے متعلق جو نئے نئے خیالات کا خمیر اٹھ رہا ہے ان کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی۔ میں سمجھتا تھا کہ جتنی دیر تک یہ کشمکش جاری رہے گی اتنے ہی زیادہ یہ خیالات عوام میں اور تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی پھیلیں گے اور ہماری سیاست اور معیشت کی تہ میں جو حقائق ہیں وہ صاف صاف ظاہر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ لنن نے کسی جگہ کہا ہے "ہر قسم کی سیاسی کشمکش مفید ہوتی ہے اس لئے اس کی وجہ سے چھپی ہوئی باتیں کھل جاتی ہیں اور میدان سیاست میں جو اصل قوتیں کارفرما ہیں وہ ظاہر ہو جاتی ہیں واقعات منظر عام پر آجاتے ہیں اور لوگ حقیقت کے سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" مجھے بھی یہ توقع تھی کہ اس طریقے سے کانگرس کے خیالات سلجھ جائیں گے، اس کی منزل مقصود واضح ہو جائے گی اور اس کا شیرازہ زیادہ مضبوطی سے بندھ جائے گا۔ غالباً کچھ کمزور عناصر اس میں سے نکل جائیں گے لیکن اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور جب وہ وقت آئے گا کہ اصولی حیثیت سے بھی عملی جدوجہد کے طریقے کو ترک کر کے آئینی اور قانونی طریقوں کی طرف رجوع کیا جائے تو کانگرس کا ترقی پسند اور کام کرنے والا عنصر ان طریقوں کو بھی اپنے اصل مقصد کے وسیع نقطۂ نظر سے استعمال کر سکے گا۔

بظاہر تو وہ وقت اب آگیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ جو لوگ کانگرس کے موثر کام اور سول نافرمانی کی تحریک کے روح رواں سمجھے جاتے تھے وہ تو پیچھے ہٹ رہے تھے اور دوسرے حضرات جنھوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا برسر اقتدار ہوتے جاتے تھے۔

کچھ روز بعد ہفتہ وار اسٹیٹسمین میرے پاس آیا اور اس میں گاندھی جی کا وہ بیان تھا جو انھوں نے تحریک سول نافرمانی واپس لیتے وقت شائع کیا تھا۔ میں نے اس کو حیرت سے پڑھا اور مجھے اس قدر رنج ہوا کہ دل بیٹھنے لگا۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا اور سول نافرمانی اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو دماغ میں تھا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ شکوک و شبہات اور خیالات کی کشمکش نے لے لی۔ گاندھی جی نے یہ لکھا تھا کہ "ستیہ گرہ آشرم کے رہنے والوں سے ایک نجی بات چیت اس بیان کی محرک ہوئی .... ایک گفتگو کے دوران میں مجھے یہ عبرت انگیز اطلاع ملی کہ میرے ایک قابل قدر قدیم رفیق نے جیل خانے کا مقررہ کام پورا کرنے میں تامل کیا اور اپنے کتب بینی کے شغل کو اس پر ترجیح دی۔ بلاشبہ یہ بات ستیہ گرہ کے اصولوں کے خلاف ہے لیکن اپنے ان عزیز دوست کی خامی سے بھی زیادہ مجھے خود اپنی خامیوں کا اتنا احساس ہوا جتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے دوست نے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کی کمزوریوں سے واقف ہوں لیکن میں اندھا تھا اور ایک قائد کا اندھا ہونا ہرگز قابل معافی نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال صرف مجھی کو سب کی طرف سے سول نافرمانی کرنی چاہیے۔"

گاندھی جی کے ان دوست کی خامی یا قصور، اگر اسے قصور کہا جا سکتا ہے، ایک بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ میں خود اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے بارہا یہ جرم سرزد ہوا ہے اور مجھے اس کا مطلق افسوس اور پچھتاوا نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ معاملہ سنگین بھی تھا تو کیا ایک اتنی وسیع قومی تحریک کو جس میں بیسیوں ہزار آدمی بلاواسطہ اور لاکھوں آدمی بالواسطہ شریک تھے، محض اس لیے بند کر دینا چاہیے تھا کہ ایک فرد سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی؟ مجھے تو یہ بات بالکل خلاف عقل اور منافی اخلاق معلوم ہوئی۔ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ کونسی بات ستیہ گرہ کے مطابق ہے اور کون سی نہیں ہے لیکن اپنی بساط کے لائق میں نے بھی بعض اصولوں کی پیروی کی کوشش کی ہے اور گاندھی جی کے اس بیان سے یہ سارے اصول درہم برہم ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ عموماً گاندھی جی اپنے وجدان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ میں اسے "صدائے

باطن" یا دعاؤں کے جواب کے بجائے وجدان ہی کہوں گا، اور اکثر ان کا وجدان صحیح بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے بار بار یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام کی ذہنیت کو سمجھنے اور ترنت کے وقت کام کرنے کا انھیں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ بعد میں وہ اپنے عمل کی جو توجیہیں کرتے ہیں وہ عموماً تکملۂ بعد از وقوع کی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو مطمئن کر سکیں۔ ہر لیڈر، یا عملی آدمی کو نازک موقعوں پر ہمیشہ تحت شعوری طور پر کام کرنا پڑتا ہے اور پھر وہ اپنے عمل کی توجیہیں تلاش کرتا ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ نافرمانی کو ملتوی کرنے میں گاندھی جی نے وہی کیا جو قرین مصلحت تھا لیکن جو دلیل انھوں نے دی وہ میرے نزدیک عقل و فہم کے لئے باعث توہین تھی اور ایک قومی تحریک کے لیڈر سے بہت بعید تھی۔ انھیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے آشرم والوں کے ساتھ جو چاہتے کرتے۔ ان حضرات نے طرح طرح کے عہد کئے تھے، ایک خاص ضابطے کی پابندی کا اقرار کیا تھا لیکن کانگریس نے ایسا نہیں کیا تھا اور نہ میں نے کیا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ہم اس طرح ٹھکرائے جائیں۔ ان وجوہ کی بنا پر جو میرے نزدیک تصوف یا مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کیا یہ تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی سیاسی تحریک اس بنیاد پر چل سکتی ہے؟ میں نے اپنی خوشی سے ستیہ گرہ کے اخلاقی پہلو کو جہاں تک کہ میں اس کو سمجھ سکتا تھا (بعض شرائط کے ساتھ) تسلیم کیا تھا۔ اس کا بنیادی اصول مجھے پسند تھا اور میں سمجھتا تھا کہ وہ سیاست کو بلند تر اور برتر سطح پر پہنچا دے گا۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار تھا کہ اچھے مقصد کے لئے بُرے ذرائع اختیار کرنا جائز نہیں لیکن اس نئی تاویل کے نتائج بہت دور تک پہنچتے تھے اور اس میں ایسے پہلو نکل سکتے تھے جن سے مجھے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

اس پورے بیان نے مجھے سخت تردد اور پریشانی میں ڈال دیا۔ آخر میں کانگریس والوں کو یہ نصیحت کی گئی تھی "انھیں لازم ہے کہ ایثار اور اختیاری افلاس کی خوبیوں کو سمجھیں اور اس کی عادت ڈالیں۔ انھیں چاہئے کہ قومی تعمیر کے کاموں میں لگ جائیں یعنی خود

چرخا کات کر اور کپڑا بن کر کھدر کو رواج دیں، زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر کے مختلف فرقوں میں قلبی اتحاد پیدا کریں، اپنی ذات سے چھوت چھات کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو دور کر دیں، ان لوگوں پر جو نشے کے عادی ہیں ذاتی اثر ڈال کر اور خود ہر لحاظ سے پاک صاف زندگی بسر کر کے ترک منشیات کی تلقین کریں۔ ان خدمات کے ذریعے سے انسان اتنا کما سکتا ہے کہ غریبوں کی سی زندگی گذارے۔ لیکن جو لوگ اس قدر عسرت سے بسر نہیں کر سکتے انھیں چاہئے کہ ان چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو جو قوم کے لئے مفید ہیں اور جن میں زیادہ آمدنی کی گنجائش ہے اختیار کر لیں۔"

یہ وہ سیاسی پروگرام تھا جس پر ہم لوگوں کو عمل کرنا تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اور گاندھی جی کے درمیان ایک بہت بڑا خلیج حائل ہو گیا۔ درد کی ایک ٹیس کے ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ اطاعت اور وفاداری کے جن رشتوں نے سالہا سال سے مجھے ان کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گئے۔ ایک عرصے سے میرے اندر ایک ذہنی کشمکش جاری تھی۔ گاندھی جی کی بہت سی باتیں یا تو میری سمجھ میں نہیں آئی تھیں یا مجھے پسند نہیں آئی تھیں۔ ان کے فاقے، 'تحریک سول نافرمانی' کے زمانے میں جب ان کے ساتھی لڑائی میں مصروف تھے، ان کا دوسرے مسائل میں منہمک ہو جانا، ان کی ذاتی اور خود پیدا کی ہوئی پابندیاں جن کی بدولت انھیں یہ عجیب و غریب روش اختیار کرنی پڑی کہ جیل کے چھوٹنے کے بعد بھی اپنے عہد کی رو سے سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، ان کا پرانے تعلقات اور عہد و پیمان کو نظر انداز کر کے اور ان کاموں کو جو بہت سے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شروع کئے تھے ناتمام چھوڑ کر نئے تعلقات اور نئے عہد و پیمان میں الجھ جانا، ان سب باتوں سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

مجھے اپنی رہائی کے مختصر زمانے میں یہ اور دوسرے اختلافات پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ میرے اور ان کے مزاج کا اختلاف ہے لیکن

شاید یہ اختلافات اختلافِ مزاج سے کچھ بڑھ کر تھے اور میں یہ دیکھتا تھا کہ اکثر معاملات کے متعلق میں ایک صاف اور صریح رائے رکھتا ہوں جو ان کی رائے کے مخالف ہے۔ اس کے باوجود اب تک میں نے یہ کوشش کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اپنے خیالات کو اس بڑے مقصد یعنی قومی آزادی کے تابع رکھوں جس کے لئے کانگرس کام کر رہی تھی۔ میں اپنے لیڈر اور اپنے رفیقوں کا وفادار رہا اس لئے کہ میرے اصولِ اخلاق میں وفاداری بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ جب مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرے عقیدے کی کشتی کا لنگر ٹوٹا جاتا ہے تو مجھے سخت روحانی کشمکش کا سامنا ہوتا تھا۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح مفاہمت کر لیا کرتا تھا۔ شاید میں نے غلطی کی، اس لئے کہ یہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ اپنے عقیدے کا لنگر ٹوٹ جانے دے۔ بہرحال مقاصد کی کشمکش میں اپنے رفیقوں کی وفاداری پر قائم رہا اور یہ یقین کرتا رہا کہ واقعات کی پر زور رفتار اور ہماری جد و جہد کی ترقی ان ساری مشکلات کو جو میری راہ میں حائل ہیں دور کر دے گی اور میرے رفیقوں کو میرے نقطۂ نظر سے قریب تر کر دے گی۔

مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کروں؟ یکایک مجھے علی پور جیل کی اس کوٹھری میں، شاید تنہائی کا احساس ہونے لگا، زندگی ایک وحشت ناک صحرا کی طرح سنسان نظر آنے لگی۔ مجھ پر اس تلخ ترین حقیقت کا انکشاف ہوا کہ کسی اہم معاملے میں دوسرے پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کو زندگی کا سفر تنہا طے کرنا چاہیے۔ دوسروں پر بھروسا کرنے سے دل ٹوٹ جاتا ہے۔

میرے دل میں جو غصہ بھرا ہوا تھا وہ میں مذہب اور جذبۂ مذہب پر اتارنے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ وضاحتِ خیال اور استقامتِ رائے کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ اس کی بنیاد محض جذبے اور جوش پر ہے۔ اسے روحانیت کا دعویٰ ہے مگر حقیقت میں یہ روحانیت سے کوسوں دور ہے۔ اسے تو بس دوسری دنیا کی فکر ہے۔ انسانی مقاصد، سماجی مقاصد اور سماجی انصاف سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اپنے من مانے عقائد میں مگن رہتا ہے اور زندگی کی حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ کہیں یہ ان عقائد سے ٹکرا نہ جائے۔ اس لئے

اپنی بنیاد حق پر رکھی ہے لیکن اس گھمنڈ میں کہ اس نے حق کی کامل معرفت حاصل کر لی ہے وہ تلاش حق کی زحمت نہیں گوارا کرتا اور اب اس کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ دوسروں کو تلقین کرے۔ حق پرستی اور عقیدہ پرستی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے۔ وہ تلوار کے جبر و تشدد کو برا کہتا ہے لیکن اس جبر و تشدد کو نہیں دیکھتا جو خاموشی کے ساتھ امن کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور کروڑوں غریبوں کو فاقوں مار ڈالتا ہے اور اس سے بدتر یہ کہ بظاہر کوئی جسمانی تکلیف پہنچائے بغیر، ذہن کو شل کر دیتا ہے، روح کو کچل دیتا ہے اور دل کو توڑ دیتا ہے۔

اور اس کے بعد مجھے پھر اس شخص کا خیال آیا جو میرے اندر یہ ہیجان برپا کرنے کا باعث تھا۔ گاندھی جی بھی کس قدر عجیب و غریب آدمی ہیں۔ ان میں ایک حیرت انگیز کشش اور ایک پراسرار تاثیر ہے۔ ان کی تحریروں سے اور ان کے اقوال سے کوئی ان کی ذات کو نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بلند ہے جتنا ان چیزوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی انھوں نے کس قدر زبردست خدمت کی ہے۔ انھوں نے اس ملک کے باشندوں میں ہمت اور مردانگی، انضباط اور تحمل کی صفات پیدا کیں، انھیں مقصد کی خاطر قربانی کرنا سکھایا، اور اپنے عجز و انکسار کے باوجود ان کے دلوں کو فخر و تمکنت سے معمور کر دیا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سیرت کی محکم بنیاد صرف ایک ہی ہے یعنی ہمت۔ بغیر ہمت کے نہ اخلاق کوئی چیز ہے، نہ مذہب اور نہ محبت۔ "جب تک انسان ڈرتا ہے اس وقت تک نہ وہ حق کی پیروی کر سکتا ہے نہ محبت کی راہ پر چل سکتا ہے۔" تشدد سے اس قدر بیزار ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ "بزدلی ایسی چیز ہے جو تشدد سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے" اور "انضباط اس کی دلیل ہے کہ انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔ ایثار، انضباط اور ضبط نفس کے بغیر نہ فلاح کی امید ہے اور نہ نجات کی صورت۔ جب تک انضباط نہ ہو صرف ایثار و قربانی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" بظاہر یہ خالی خولی الفاظ ہیں یا افادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ان

الفاظ کے پیچھے ایک قوت تھی اور سارا ہندوستان یہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹا سا انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔

ان کی ذات ہندوستان کی نمائندہ اور اس قدیم اور مظلوم ملک کی روح کی مظہر بن گئی گویا وہ مجسم ہندوستان تھے اور ان کی تمام کمزوریاں ہندوستان کی کمزوریاں تھیں۔ اگر کوئی ان کی توہین کرے تو یہ ایک محض ذاتی معاملہ نہیں بلکہ سارے ملک کی توہین تھی اور وائسرائے یا دوسرے حضرات جو ان کے ساتھ حقارت کا اظہار کرتے تھے یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر ۳۱ء میں گول میز کانفرنس سے واپسی کے وقت جب پاپائے اعظم نے گاندھی جی سے ملاقات کرنے سے انکار کیا تو مجھے کتنا رنج ہوا تھا۔ میرے نزدیک ان کے انکار سے ہندوستان کی توہین ہوئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ انکار قصداً کیا گیا تھا اگرچہ غالباً اس سے ان کی توہین مقصود نہ تھی۔ کیتھولک کلیسا اپنے حلقے کے باہر رہنماؤں اور سنیاسیوں کی بزرگی تسلیم نہیں کرتا اور چونکہ چند پروٹسٹنٹ پادریوں نے گاندھی جی کو ایک بہت بڑا مذہبی آدمی اور سچا عیسائی کہا تھا اس لئے کلیسائے روم کے لئے یہ اور ضروری ہو گیا کہ اس الحاد سے اپنی بے تعلقی ظاہر کر دے۔

اسی زمانے میں یعنی اپریل ۳۴ء میں میں نے علی پور جیل کے اندر برنرڈ شا کے نئے ڈرامے پڑھے اور "چٹانوں کے اوپر" کا دیباچہ اور اس میں حضرت مسیح اور پائلٹ کا مباحثہ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہمارے زمانے پر صادق آتا ہے جب کہ ایک اور سلطنت کا ایک مذہبی آدمی سے مقابلہ ہے۔ اس دیباچے میں حضرت مسیح پائلٹ سے کہتے ہیں کہ "میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو خون کو ترک کر دے۔ روم کی عظمت کے متعلق بے کار باتیں نہ کر۔ جسے تو روم کی عظمت کہتا ہے وہ سوائے خوف کے اور کچھ نہیں۔ ماضی کا خوف، مستقبل کا خوف، غریبوں کا خوف، امیروں کا خوف، مہنتوں کا خوف، ذی علم یہودیوں اور یونانیوں کا خوف، وحشی گالوں گاتھوں اور ہنوں کا خوف، اس کارتھیج کا خوف جسے تم نے

اس لئے برباد کیا کہ تم اس سے ڈرتے تھے اور اب سے بڑھ کر خود اپنے تراشے ہوئے بت قیصر روم کا خوف اور مجھ جیسے غریب بے کس کا خوف جو در بدر ذلتیں سہتا اور دھکے کھاتا پھرتا ہے، غرض خوف ہر چیز کا سوائے خوف خدا کے، اور کسی چیز پر ایمان نہیں سوائے خون اور لوہے اور سونے کے۔ تم جو روم کی حمایت کے لئے کھڑے ہو دنیا بھر کے بزدل ہو اور میں جو سلطنت الٰہی کی حمایت کے لئے کھڑا ہوا ہوں ہر مصیبت کا مقابلہ کیا، سب کچھ کھو دیا اور ایک ابدی تاج حاصل کر لیا۔"

لیکن اس وقت گاندھی جی کی عظمت، یا ان کی ملکی خدمات، یا ان بے شمار احسانات کا جو انھوں نے مجھ پر کئے ہیں، کوئی سوال نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ ممکن تھا کہ بعض معاملات میں وہ سراسر غلطی پر ہوں۔ میں اس الجھن میں تھا کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ سالہا سال سے میرے ان کے گہرے تعلقات ہیں لیکن آج تک ان کا مقصد صاف طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور مجھے شبہ ہے کہ شاید وہ خود بھی اسے صاف طور پر نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے لئے بس ایک قدم کافی ہے۔ نہ وہ مستقبل کے متعلق غور کرتے ہیں اور نہ کوئی واضح مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ تم وسائل اور ذرائع کی فکر کرو مقصد اپنی فکر آپ کرے گا۔ اپنی انفرادی زندگی کو نیک بناؤ پھر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا لیکن یہ طرز خیال نہ سیاسی ہے اور نہ علمی اور نہ غالباً اخلاقی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک تنگ نظرانہ ناصحانہ انداز ہے اور اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیکی کیا ہے؟ یہ محض انفرادی چیز ہے یا اجتماعی؟" گاندھی جی سیرت پر سارا زور دیتے ہیں اور ذہنی تربیت اور نشو و نما کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ ذہنی قابلیت بغیر اخلاقی سیرت کے خطرناک ہوتی ہے لیکن سیرت بغیر ذہنی قابلیت کے کیا معنی رکھتی ہے؟ آخر سیرت کی نشو و نما کیوں کر ہوتی ہے؟ گاندھی جی کو قرون وسطے کے عیسائی ولیوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور ان کے بہت سے اقوال ان لوگوں کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہیں۔ لیکن موجودہ نفسیاتی تجربات اور طریقوں کے ساتھ یہ باتیں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں۔

لیکن اور جو کچھ بھی ہو مقصد کا مبہم ہونا میرے خیال میں بہت افسوس ناک ہے۔ اگر عمل کو مؤثر بنانا ہے تو ایک معین اور واضح مقصد سامنے ہونا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی سراسر منطق کی پابند نہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے مقصد میں تبدیلی کرنا پڑے گی لیکن کوئی نہ کوئی مقصد ہمیشہ صریحی طور پر پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

غالباً مقصد کے متعلق گاندھی جی کے خیالات اتنے زیادہ مبہم نہیں ہیں جتنے بہ ظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد ہے اور وہ دل و جان سے اسے حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں لیکن اس میں اور دور حاضر کے حالات اور خیالات میں بھی پورا اختلاف ہے اور وہ اب تک ان دونوں چیزوں میں مطابقت نہیں پیدا کر سکے اور نہ ان وسائل کو سوچ سکے جن سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات مبہم معلوم ہوتے ہیں اور وہ خود انھیں واضح کرنے سے بچتے ہیں لیکن ان کا عام رجحان چوتھائی صدی سے بالکل صاف اور واضح رہا ہے جب سے کہ انھوں نے جنوبی افریقہ میں اپنے فلسفے کو ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی ان کے وہی خیالات ہیں جو ان ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ شائد اب ان میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے مگر پھر بھی ان تحریروں سے ان کے خیالات کی بنیاد کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں انھوں نے لکھا تھا کہ "ہندوستان کی نجات اس پر موقوف ہے کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر اس نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو بھلا دے۔ ریلیں، تار، ہسپتال، وکلا، ڈاکٹر اور اس قسم کی تمام چیزیں ختم ہو جانی چاہئیں اور جو اونچے طبقے کہلاتے ہیں انھیں شعوری اور ارادی طور پر جوش اور خلوص کے ساتھ کسان کی سادہ زندگی اختیار کرنی چاہئے یہ جان کر کہ حقیقی مسرت اسی زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔" "ہر مرتبہ جب میں ریل گاڑی یا موٹر میں سوار ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے عقیدے پر ظلم کر رہا ہوں۔" "انتہا درجے کی مصنوعی اور تیز رفتار سواریوں کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی کوشش کرنی طلب محال

سے کم نہیں۔"

میرے نزدیک یہ تمام اصول بالکل غلط، مضر اور ناقابل حصول ہیں۔ ان کی تہ میں افلاس مصیبت اور راہبانہ زندگی کی محبت اور قدر پوشیدہ ہے جو گاندھی جی کے دل میں ہے۔ ان کے نزدیک ترقی اور تہذیب بلند معیار زندگی یا احتیاجات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اس پر موقوف ہے کہ "انسان بالقصد اور خوشی سے اپنی احتیاجات کو محدود کرے، اسی سے حقیقی خوشی اور قناعت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے خدمت کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔" اگر یہ مقدمات ایک بار تسلیم کر لیے جائیں تو پھر گاندھی جی کے بقیہ خیالات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور ان کے عمل کی نوعیت بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ ان کے ان اصولوں کو تو تسلیم نہیں کرتے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ ان کا عمل ہماری پسند کے مطابق ہو اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر شکایت کرتے ہیں۔

ذاتی طور پر میں افلاس اور مصیبت کی تعریفوں کو برا سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک دونوں چیزیں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں اور ان کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اسی طرح میں راہبانہ زندگی کو اجتماعی مقصد کی حیثیت سے پسند نہیں کرتا اگرچہ ممکن ہے کہ وہ بعض افراد کے لیے موزوں ہو۔ سادگی، مساوات اور ضبط نفس کا میں بھی قائل ہوں مگر نفس کشی کا نہیں۔ میرے خیال میں جس طرح ورزش کرنے والے کو جسم کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نفس اور عادتوں کی تربیت کرنا اور انھیں قابو میں لانا بھی ضروری ہے۔ یہ توقع کرنا حماقت ہوگی کہ ایک شخص جو بہت آرام طلب ہے موقع پر سخت تکلیفیں اٹھا سکے گا، غیر معمولی ضبط نفس سے کام لے سکے گا یا کوئی بہادری کا کام کر سکے گا۔ اخلاقی صحت کے لیے کم از کم اتنی ہی تربیت اور محنت کی ضرورت ہے جتنی جسمانی صحت کے لیے۔ مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ رہبانیت اور نفس کشی اختیار کی جائے۔

اور نہ مجھے یہ پسند ہے کہ کسان کی سادہ زندگی کو اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے۔

مجھے تو اس زندگی سے وحشت ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ میں خود اس کو اختیار کروں میں چاہتا ہوں کہ کسانوں کو اس سے نجات دلاؤں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دیہات کو شہر بنا دیا جائے بلکہ یہ ہیں کہ دیہاتی علاقوں میں شہر کی تمدنی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ یہ زندگی بجائے اس کے کہ اس زندگی سے مجھے مسرت حاصل ہو میرے لئے قید سے کم نہ ہوگی۔ "بھاؤڑا چلانے والے آدمی" میں کون سی ایسی خوبی ہے کہ اس کی اس قدر تعریف کی جائے؟ وہ پشتہا پشت سے اس قدر لوٹا اور کچلا گیا ہے کہ جن جانوروں کے ساتھ وہ رہتا ہے ان میں اور اس میں بہت تھوڑا سا فرق رہ گیا ہے۔

"کس نے اسے اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ نہ اسے رنج کا احساس ہے نہ مسرت کا،
نہ اس کے دل میں امید کی لگن ہے نہ یاس کی خلش،
وہ بیل کی طرح ٹھس اور مٹھا ہو کر رہ گیا ہے۔"

یہ خواہش کہ عقل کو خیر باد کہہ کر اس ابتدائی عہد کی طرف رجوع کیا جائے جس میں عقل کسی شمار میں نہ تھی، میرے لئے بالکل ناقابل فہم ہے۔ اس چیز کو جو انسان کی عظمت و شان کی بنیاد ہے برا کہا جاتا ہے اور ایک خالص حیوانی اور مادی زندگی، جس میں ذہنی اور روحانی نشوونما کی گنجائش نہ ہو، پسندیدہ قرار دی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ تہذیب میں بہت سی خرابیاں ہیں لیکن اس میں خوبیاں بھی بہت ہیں اور وہ اپنی خرابیوں کو دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ لیکن اسے جڑ سے کھود کر پھینک دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی یہ صلاحیت مٹا دی جائے اور ایک بے کیف، تاریک اور مصیبت کی زندگی کی طرف رجوع کیا جائے۔ نہ ہم انقلابات اور تغیر کے اس سیلاب کو روک سکتے ہیں اور نہ اس سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔ اور نفسیاتی حیثیت سے ہم لوگ جو جنت عدن کے سیب کا مزہ چکھ چکے ہیں، اس مزے کو کبھی نہیں بھول سکتے اور ابتدائی زندگی کی طرف ہرگز نہیں لوٹ سکتے۔

لیکن یہاں بحث اور دلیل سے کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ یہ دونوں نقطۂ نظر ایک

دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ گاندھی جی ہمیشہ شخصی نجات کے اور گناہ کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگوں کا نصب العین سماج کی فلاح و بہبود ہے۔ گناہ کے تخیل کو سمجھنا میرے لئے دشوار ہے اور شاید اسی لئے میں گاندھی جی کے طرز خیال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ انھیں سماجی زندگی کے نظام کا بدلنا مقصود نہیں بلکہ وہ افراد کے نفس کو گناہ سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "سودیشی کا ماننے والا یہ لاحاصل کوشش نہیں کرتا کہ دنیا کی اصلاح کرے اس لئے کہ اس کا ایمان ہے کہ دنیا خدا کے بنائے ہوئے قاعدوں کے مطابق چلتی ہے اور ہمیشہ چلتی رہے گی۔" اس کے باوجود دنیا کی اصلاح کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے پیش نظر انفرادی اصلاح ہے یعنی جبلّات اور خواہشات پر جن کا پورا کرنا گناہ ہے قابو حاصل کرنا۔ غالباً وہ آزادی کی اس تعریف سے اتفاق کریں گے جو ایک قابل رومن کیتھولک مصنف نے فاشزم کے متعلق اپنی ایک کتاب میں کی ہے:۔ "آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ گناہ کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔" لندن کے لاٹ پادری نے جو الفاظ اب سے دو سو سال پہلے لکھے تھے وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہیں:۔ "عیسائیت جو آزادی بخشتی ہے وہ آزادی ہے گناہ کی زنجیروں سے، شیطان سے اور انسان کے جذبات، شہوات اور ناجائز خواہشات کی حکومت سے۔"[1]

اگر یہ نقطۂ نظر ایک بار اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر جنسی تعلقات کے متعلق گاندھی جی کا طرز خیال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ آج کل کے عام آدمیوں کو عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک "اگر اولاد کی خواہش مقصود نہ ہو تو پھر ہر قسم کا جماع جرم ہے" اور "منع حمل کے مصنوعی طریقے اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ نامردی اور اعصاب کی کمزوری ہوگا۔" "اپنے عمل کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرنا ناجائز اور منافی اخلاق

---

[1] یہ خط پہلے صفحہ ۱۶۷ پر نقل کیا جا چکا ہے۔

ہے ...... اس کے لئے یہ برا ہے کہ شہوانی خواہشات کو دل کھول کر پورا کرے اور ان کے نتائج سے بچنے کے لئے سفوفات اور دوسری دواؤں کا استعمال کرے۔ اور یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ اپنی خواہشوں کو نہ روکے مگر اپنے فعل کے فطری نتیجے (یعنی حمل) کو روکنے کی کوشش کرے۔"

میں ذاتی طور پر اس طرزِ خیال کو خلافِ فطرت اور خوفناک سمجھتا ہوں۔ اور اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو میں ایک مجرم ہوں اور عنقریب نامردی اور اعصابی کمزوری میں مبتلا ہونے والا ہوں۔ رومن کیتھولک مذہب والوں نے بھی بہت شدت سے ضبطِ تولید کی مخالفت کی ہے لیکن وہ منطقی استدلال کی اس انتہا تک نہیں پہنچے جہاں گاندھی جی پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے مصلحت سے کام لیا ہے اور انسانی فطرت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔[1] لیکن گاندھی جی نے اپنے دلائل کو اُدھر تک پہنچا دیا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی جماع کے جواز اور ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی فطری جنسی کشش ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اصول ناقابلِ عمل ہے اور میں نے اس فطری کشش کا لحاظ نہیں رکھا جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے۔ میں اسے ہرگز نہیں مانتا کہ جس شہوانی کشش کا بیان ذکر کیا گیا ہے وہ کسی

---

[1] پاپائے اعظم پائس یازدہم اپنے فرمان میں، جو عیسائیوں کے نکاح کے متعلق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جاری کیا تھا، فرماتے ہیں "یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شادی شدہ لوگ قانونِ فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں اگر وہ اپنے وقوف کا استعمال فطری اور معقول وجوہ کی بنا پر کریں، چاہے اس صورت میں وقت کے حالات یا کسی نقص کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان نہ بھی ہو۔" "وقت کے حالات" کا اشارہ صریح طور پر اس "بے خطر" زمانے کی طرف ہے جب استقرارِ حمل کا احتمال نہ ہو۔

صورت میں بھی فطری کہی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر ہماری تباہی یقینی ہے۔ عورت اور مرد کا فطری تعلق اور کشش تو وہ ہے جو بھائی بہن، ماں بیٹے، باپ بیٹی کے درمیان ہوتی ہے، اور یہی فطری کشش ہے جس سے دنیا قائم ہے" اور اس سے بھی زیادہ پرزور الفاظ میں "نہیں، میں اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان شہوانی کشش خلاف فطرت ہے۔"

اس زمانے میں جب اڈیپس گرہ[۱] اور فرائڈ اور تحلیل نفسی کا دور دورہ ہے یہ عقیدہ، جو اس زور شور سے ظاہر کیا گیا ہے، عجیب اور دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو انسان اس عقیدے پر ایمان لائے یا اس سے انکار کر دے۔ کوئی درمیانی راہ اختیار کرنا ناممکن ہے اس لئے کہ یہ عقل کا نہیں بلکہ عقیدے کا سوال ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی اس معاملے میں سراسر غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض خاص صورتوں کے لئے ان کا مشورہ موزوں ہو لیکن اگر یہ عام اصول قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر مایوسی، نفسی رکاوٹ، خلل اعصاب اور طرح طرح کی جسمانی اور اعصابی بیماریاں ہوں گی۔ ضبط نفس یقیناً پسندیدہ چیز ہے لیکن مجھے یہ شبہ ہے کہ گاندھی جی کے اصول کی پابندی سے ضبط نفس کا فروغ پانا دشوار ہے۔ یہ اصول بے حد سخت ہے اور اکثر لوگ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے اس لئے یا تو وہ اپنے پرانے طریقے پر قائم رہتے ہیں یا پھر میاں بیوی میں ان بن ہو جاتی ہے۔ بظاہر گاندھی جی کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید کا منشا لازمی طور پر نفس پرستی اور بے اعتدالی ہے، اور اگر عورت و مرد کے درمیان جنسی کشش کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر مرد ہر عورت کے پیچھے اور ہر عورت ہر مرد کے پیچھے دوڑتی پھرے گی۔ لیکن یہ دونوں نتیجے بے انصافی پر مبنی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی

---

[۱] تحلیل نفسی کا یہ نظریہ کہ ماں بیٹے اور باپ بیٹی کے درمیان جنسی کشش ہوتی ہے۔

کے ذہن پر جنسی مسئلہ، وہ کتنا ہی اہم سہی، کیوں اس قدر مسلط ہو گیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ "سیاہ وسفید" کا سوال ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور رنگ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ضبط نفس اور نفس پرستی دونوں کو انتہائی صورت میں پیش کرتے ہیں جو میرے نزدیک غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے۔ شاید یہ ان جنسیات کی کتابوں کا رد عمل ہو جو آج کل سیلاب کی طرح امڈ رہی ہیں۔ میرا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ میں ایک طبعی انسان ہوں اور میری زندگی میں جنسی جذبات کو بھی دخل رہا ہے، لیکن نہ یہ کبھی میرے نفس پر مسلط ہوئے اور نہ ان کی وجہ سے میرے دوسرے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ یہ محض ایک ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔

اصل میں ان کی روش ایک تارک الدنیا راہب کی سی ہے جو زندگی کی نفی کرتا ہے اور اس کو شر محض سمجھتا ہے۔ ایک راہب کے لئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے، لیکن اس اصول کو دنیادار مردوں اور عورتوں پر، جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور اس سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، نافذ کرنا دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح ایک برائی سے بچنے کے لئے بہت سی دوسری برائیوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔

بات میں بات نکل آئی اور میں اپنے موضوع سے دور ہو گیا۔ لیکن علی پور جیل میں ان مصیبت کے دنوں میں میرے دل پر ان خیالات کا ہجوم تھا اور وہ بھی ربط اور سلسلے کے ساتھ نہیں بلکہ بے حد بے ترتیبی اور پریشانی کی حالت میں جس سے مجھے سخت الجھن اور کوفت تھی۔ اور پھر تنہائی اور اداسی کا احساس تھا جس میں جیل اور اس کال کوٹھری کی دم گھوٹنے والی فضا نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو اس صدمے کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہتا بلکہ میں بہت جلد نئے حالات سے نبٹ لیتا اور اظہار خیال اور عمل سے تسکین حاصل کرتا۔ مگر جیل میں اس قسم کی تسکین کی کوئی صورت نہ تھی اور میں نے کچھ دن بڑی مصیبت اور تکلیف میں گذارے۔ خوش قسمتی سے میری طبیعت میں اتنی لچک ہے کہ مجھے مایوسی کے دورے سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری یہ افسردگی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی اور اس کے

بعد جیل میں کملا سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ بھی ہو کم سے کم ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو موجود ہیں۔

---

(۶۲)

متضاد باتیں

جو لوگ گاندھی جی سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اور صرف اُن کی تحریروں کو پڑھتے ہیں وہ غالباً یہ خیال کرتے ہوں گے کہ گاندھی جی اسی قسم کے آدمی ہیں جیسے مذہبی پیشوا ہوا کرتے ہیں، یعنی رونی صورت۔ بسورتی شکل کے زاہد خشک، کالوینی فرقے کے پیرووں کی طرح خوشی اور زندہ دلی کے دشمن، ان پادریوں سے کچھ کچھ مشابہ "جو سیاہ چغے پہنے ہوئے پیدل پھرا کرتے ہیں" لیکن ان کی تحریریں ان کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں، اور ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ ہم صرف ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان پر تنقید کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کالوینی پادریوں کے بالکل برعکس ہیں۔ اُن کی مسکراہٹ دل کو لبھاتی ہے، ان کی ہنسی روتوں کو ہنساتی ہے، ان کی ذات فرحت و انبساط کا سرچشمہ ہے۔ اُن میں بچوں کا سا بھولا پن ہے جس میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تازہ ہوا کا جھونکا آگیا جس نے فضا کی کثافت کو دور کر دیا۔

وہ ایک عجیب مجموعۂ اضداد ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سالہا سال سے میں اس اُلجھن میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور تعلق کے باوجود جو انھیں غریبوں کے ساتھ ہے، وہ کیوں ایک ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور پھر

انھیں کچلتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشرتی نظام کے حامی ہیں جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اُس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے وہ چار ناچار موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انھیں جو اعتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے۔ اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں، لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انھیں کے ذہن میں ہیں اور ان کی اشتراکیت سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کی تقلید میں بہت سے ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے اور اس سے اُن کی مراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انھیں حضرات کے مخصوص نہیں بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ چنانچہ ان کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ[۱] کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے۔ مسٹر

---

[۱] - اپنے ایک پیام میں جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کو جس کا جلسہ جنوری ۱۹۳۵ء میں اڈنبرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا مسٹر ریمزے میکڈانلڈ (بقیہ صفحہ ۴۰۷ پر

جانتا ہوں کہ گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں انھوں نے معاشیات اشتراکیت، بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلۂ خیال کر چکے ہیں، لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ ہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرسکتے۔ ولیم جیمس نے لکھا ہے، "اگر تمھارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمھارا دماغ تمھیں کبھی قائل نہیں کرسکتا" جذبات ہمارے تصورِ زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ شوپنہار نے کہا ہے "انسان جو ارادہ کرلے وہ کرسکتا ہے مگر ارادہ اُس کے اختیار میں نہیں"

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے انھیں بے حد متاثر کیا اور ان کا سارا تصوّرِ زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے اُن کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں اور ان کا دماغ نئی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں اُن کی باتوں کو وہ بہت صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں، لیکن اس دلچسپی کے باوجود جو وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں، کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے۔ وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے

(صفحہ ۴۰۰ کا بقیہ) فرماتے ہیں "زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں یہی حقیقی اشتراکیت ہے، یہی حقیقی قومیت بھی ہے بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے۔"

علاوہ اور تمام باتیں اُن کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے' جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہوجائیں گے۔ اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔

یہ میرے نزدیک اُن کے خیالات کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اشتراکیت خصوصاً مارکسیت کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے کہ یہ تحریکیں تشدّد سے وابستہ ہیں" طبقوں کی جنگ" کے الفاظ ہی سے ان کو تشدّد اور لڑائی کی بو آتی ہے اور اس لئے انھیں اس سے نفرت ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے نہ پائے' اس لئے کہ بلند معیار زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ عیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہوجائیں گے۔ یہی کیا کم بُرا ہے کہ تھوڑے سے خوش حال لوگ عیش پرست بن گئے ہیں' یہ اور بھی بُرا ہوگا کہ اُن کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے ایک خط لکھا تھا جس سے اس قسم کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوئلے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں اُن کے پاس انگلستان سے آیا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملے میں مزدوروں کو شکست ہوگی کیونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انھیں چاہئے کہ ضبط تولید کا طریقہ استعمال کرکے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے سلسلے میں لکھا تھا کہ "آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود جیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ اولاد ہوتی ہے بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں بھی ضبط نفس سے کام نہیں لیتے' اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو ان کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا

اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل نہ پیش کر سکتے جس کا ثبوت آسان ہو کیا ان کے لئے شراب نوشی، جوا کھیلنا، تمباکو پینا ضروری ہے؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں اور پھر بھی غالب رہتے ہیں اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتے تو انھیں دنیا کی ہمدردی چاہنے کا کیا حق ہے؟ کیا یہ کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی یہ نہ ہو کہ ہم انھیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت بڑے پیمانے پر پیدا کر دیں۔ لہ

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش انگریز کان کنوں، ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انھیں کچلے ڈالتا تھا۔ گاندھی جی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کر دی گئی تھی اور وہ کام سے ہٹا دئے گئے تھے بہرحال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ اور نہ اس سے غرض ہے کہ کان کن مزدور ضبط تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ

لہ ۔ ضبط نفس اور نفس پرستی مصنف ایم کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے - یہ نقطۂ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بھی کوسوں دور ہے - یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر شخص کے کھانے پہنے، رہنے سہنے کا معقول بند و بست کر سکتی ہے اور اُن کے معیار زندگی کو بہت بلند کر سکتی ہے بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں، تو اُس سے اُنھیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قایل ہی نہیں - چنانچہ اشتراکیت سے جو اُمیدیں ہیں وہ اُن کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں بلکہ ان کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابل برداشت ہے اس لئے کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے - انھیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے نبھا رہے ہیں اس لئے کہ یہ اُتنی بری نہیں، اور پھر یہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا -

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات اُن کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے اور اُن کی تقریر و تحریر میں ہمیں جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ ان کے خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے - وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں، بُری عادتوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں، اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی مادّی زندگی کی سطح کو بلند

کریں بلکہ خود ان کی سطح پر اُتر آئیں اور مساوی حیثیت سے اُن کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہو جائے گی یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اُس بیان میں جو انھوں نے ۱۱ستمبر ۱۹۳۴ء کو شائع کیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بے کار ہے اس لئے کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعث شرم ہے۔ اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے جس کی یہ آرزو ہے کہ انھیں کی سی زندگی بسر کرے۔ اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہی کہ جہاں تک ہو سکے اس سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں۔"

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار، یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا بجز اس کے کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کرلیں اور اپنے تعیشات اور بلند تر معیار زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں۔ جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطۂ نظر رکھتا ہے شائد کسی حد تک اس سے متفق ہو۔ اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ہر چیز کو ماضی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں، زمین آسمان کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا۔ مٹھی بھر دولت مند آدمی اس زمانے میں سماج کے روح رواں تھے اور اُن کا ہونا نظام دولت آفرینی کے لئے

ضروری تھا۔ اس لئے اخلاقی معلموں، مصلحوں اور اہل دل نے اُن کے وجود کو جائز رکھا
لیکن اسی کے ساتھ انھیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے حاجت مند بھائیوں کا بھی ان
پر کچھ حق ہے۔ وہ غریبوں کے امانت دار ہیں۔ انھیں خیرات کرنا چاہئے چنانچہ خیرات
کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے، گاندھی جی بھی ہمیشہ
اس نظریے پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ، بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار
غریبوں کے امانت دار ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں
پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے "امیروں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے خدمت
خلق پر مامور ہیں اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں، اور خود حضرت مسیح نے
غریبوں کی قسمت اُن کے سپرد کی ہے۔" ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔
یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد،
دھرم شالے بنواتے ہیں۔ اپنی وافر دولت میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے
غریبوں کو خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دین دار ہیں۔

دنیائے قدیم کے مذہبی نقطۂ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم لیو سیزدہم کا
مشہور فرمان "ریرم نوارم" ہے جو مئی ۱۸۹۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی
حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غرض مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا نوع انسانی
کی قسمت میں لکھا ہے۔ انسان چاہے جتنی کوشش کرے، کوئی طاقت اور کوئی تدبیر
انسانی زندگی کو اس درد و الم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو اسے
ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف دعوے کرتے ہیں اور
مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انھیں رنج و الم سے نجات مل جائے گی اور
دائمی راحت و عشرت نصیب ہوگی، دھوکا دے رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے
ہیں اور اُن کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کر دیں گے۔ انسان کی

فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اُس کی اصلی حالت میں دیکھے اور ان مصیبتوں کا علاج کہیں اور تلاش کرے۔"

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے " اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُن کی صحیح قدر کر سکتے ہیں، جب تک اس زندگی کا لحاظ نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی .... جس حقیقت عظمیٰ کا سبق خود فطرت نہیں دیتی ہے، وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اُس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اُن آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اُس نے اِس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلاوطنی کی جگہ بنایا ہے نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں جنھیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ......"

یہ مذہبی طرز خیال اُس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈھا جائے لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے اور انسان کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہوگئی جو زمانۂ قدیم میں انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلط ہیں، البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں، کیتھولک عیسائی ہنوز بارھویں اور تیرھویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں (یہ وہی زمانہ ہے جسے دوسرے لوگ عہد مظلمہ کہتے ہیں) اور اسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں، جب اولیا کا دور دورہ

تھا، عیسائی فرماں روا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے، اور گوتھک طرز کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے، اُن کے خیال میں یہ زمانہ "سچی عیسائی جمہوریت کا تھا جو پیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اُس درجہ پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ اس سے پہلے کبھی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد" مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہد خلافت کی "اسلامی جمہوریت" اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہابھارت کے زمانے کی دُھن میں رہتے ہیں اور "رام راج" کا خواب دیکھا کرتے ہیں مگر تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ اس عہد ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی اور اُسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمراں طبقہ کو فرصت اور فراغت حاصل ہو لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اُٹھانے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوت لایموت کی جد و جہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے اُس شخص کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں، اُسے تو بس ایک ہی فکر ہوگی کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی بُرائیاں لایا ہے، جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے، اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہوگئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی

اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیرداری کو اور مستحکم کر دیا ہے اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے بجائے انھیں اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دُنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا امرا کا طبقہ بالکل بے کار ہے اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پُرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کیجائے اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی، کفایت شعاری اور نیک چلنی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں سے بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے۔ اور دو طرح سے بے کاری کو بڑھاتا ہے یعنی ایک تو ان لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے اور فاقہ کرنے پر مجبور کرتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گذرا لکھا تھا "ان لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں، خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا

کہ محنت کرکے روٹی کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں"۔
"تھیوری" دنیائے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض الجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا اس کے علاوہ جاگیردار ہر دلہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں، کشتیوں، پلوں، مفاد عامہ کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا، جانور آج بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کردئے گئے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں برابر حقوق ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کمپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ۔ جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے۔ رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں جنہیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہئے اور اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں مفاد عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی کام کرے، خواہ اس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو اور پرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے، آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں۔ ہم "مستقل حقوق" کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں، لیکن آج کل ایک نیا "مستقل حق" اور تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے، اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رو سے املاک اور سرمایہ معدوم نہیں ہو جاتے، بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے ان اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے سماج اُن سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی، اور روحانی اصلاح ہے اور اس کے ذریعے سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بُری عادتوں کو اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں، وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس بارے میں اختلاف رائے ہو کہ ان میں کون چیز زیادہ بُری ہے اور کون کم، کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطۂ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر لالچ، خودغرضی، زر پرستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کشمکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں ہیں ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آمیز جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے اور جس کا عمل اس پُرانے مقولے پر ہے "جس میں طاقت ہو وہ چھین لے اور جو رکھ سکے وہ رکھے"۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر لڑائی جھگڑا پیدا کرتی ہے، اور سارا نظام انسان کی غارت گرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اُسے ان سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ

جذبات کو بھی ابھارتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے۔ کامیابی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر ان کی جگہ لے لی جائے۔ جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ہمارے بہترین آدمی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا گاندھی جی یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کر لیں گے ؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں انھیں ضرور کامیابی ہوگی، لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں، کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی۔ اُس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کا نہیں ہے بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کے مکابر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منصفانہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں اور اس دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں رہا ہے۔

مگر گاندھی جی کی اکثر کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لیجانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گانوؤں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ پس قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔ بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گی کہ عسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیارِ زندگی بیحد پست ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے لیکن اوروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں ان سے قطع تعلق کرنا بالکل ناممکن ہے اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہئے اور اس نقطۂ نظر سے محدود قومی معیشت کا کوئی سوال ہی نہیں اور میں تو ذاتی طور پر اسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

پھر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں، یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کیجائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہئے، یہ ایک جداگانہ سوال ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام

سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو اُن کو مٹا دینا چاہیئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہو گی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں، لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے۔

کھادی کی تحریک یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ آجکل کے کسی اہم مسئلہ کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے آئندہ بھی اس وقت تک پہنچا رہے گا جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کرلے گی جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جا سکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصے میں بیکار رہتے ہیں۔ حکومت نے بے روزگاری کو

دور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں - اور چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے - مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے وہ نفسیاتی تبدیلی ہے - کھادی نے کسی حد تک اس فصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا - اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا - اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے - اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آ گئی ہے، نمود و نمائش اور بدمذاقی کم ہو گئی ہے، اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملے میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت اور شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی ریشم اور ساٹن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی فوقیت کا احساس رکھتے ہیں - غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے - کھادی پہننے والوں کے بڑے مجمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی - اس میں بھی شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی - اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے -

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھاتے

چلے جائیں کھادی ہی نے روکا ورنہ پہلے ان کی روک تمام صرف بدیسی اور خصوصاً لنکاشائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانہ میں، تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں۔ ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دل عزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس قسم کا موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے مثلاً جنگ چھڑ جائے جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے۔ کھادی کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجائش ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے۔ باقی رہے تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی اس سے کام چلتا رہے۔ لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہو گی کہ زراعتی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لیے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں جن پر لاکھوں

روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام آراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم اور بڑے پیمانے پر معقول طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے جدید عہد کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کا اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے بعض شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہو لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے۔ یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو لیکن یہ رجحان اس میں بہر حال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکار زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں ورنہ لگان یا مالگذاری کی ادائیگی کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے۔ اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے زمیندار

یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا۔ اگر پیداوار کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے اس سے فوری طور پر ضرور فائدہ ہوگا جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما نمونے جو مٹ رہے تھے محفوظ ہو جائیں گے لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد کلوں کی اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں "ہریجن" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں "کلوں کو رواج دینا اُس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو اور کرنے والے تھوڑے ہوں لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے ...... ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں فرصت کا وقت نکالا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اُن کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے۔" یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو

بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں دقت کام کی کمی کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، آبپاشی کی اسکیم، حفظان صحت، طبی وسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی، سماجی اور تمدنی خدمات، تعلیم، اور اُن بیسیوں ضروری اشیا کی فراہمی جس کی لوگوں کو ضرورت ہے، ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو اور سماج کی تنظیم مفاد عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویٹ یونین میں او رچا ہے جو نقائص ہوں لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار نہیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح و ترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو لڑکے، مزدوروں اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلی میں اصلاح و ترمیم کی جائے اور اُن کی قوت پیداوار بڑھائی جائے۔ یہ بھی تو اوزار اور کل کو ترقی دینے کی کوشش ہے اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی تو بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی

بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے) تو منافع کی خواہش پھر نمودار ہوجاتے اور اُس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہوگی جس کو "ضرورت سے زیادہ پیداوار" اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ ان ضروری مادی اور تمدنی اشیا کو بھی تیار نہیں کرسکتیں جو ہمیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیوں کر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو رد کیا مفید ہے اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سب سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لیے ان کا استعمال موزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں مٹائی جاسکتی ہیں؟

یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے جب ہمارے یہاں ریلیں، بجلی، نقل و حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں تو یا تو ہم چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت کرسکتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لئے دوسری بنیادی صنعتیں درکار ہیں اور پھر کلیں بنانے کی صنعت ضروری ہوجاتی ہے جب یہ بنیادی صنعتیں قائم ہوجاتی ہیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ غرض یہ سلسلہ کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف ہماری مادی

اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے۔ جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو اُن کے لئے پھر بھی کچھ موقع ہے، مگر نظام سرمایہ داری میں اُن کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جاسکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی(۱) ہے، اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا برائی ہے کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے کہ خواہ اُن کی ضرورت پوری نہ ہو لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں تیار نہ کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے۔

ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے۔ کسان اس پر مجبور رہے کہ اپنی

---

(۱) ۳ رجنوری سنہ ۳۰ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا نہیں کرنا چاہتے جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔"

چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے اور وہی قیمتیں رکھے جو اور ملکوں میں ہیں۔ قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور اس کو اپنا مقررہ لگان یا مالگذاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیز بوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کر سکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے تاکہ وہ اور اُس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاملے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبوراً گنے کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوگئے اور گنے کی مانگ بہت بڑھ گئی، لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی، کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کر دیا، اور گنے کی قیمت گر گئی

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کئے جاسکیں اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں۔ اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں،

پھر مجھے اس مجموعہ اضداد یعنی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے[1]۔ باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں لیکن کیا جہنمی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہو چکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پرانے نظام کے بچے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں، مثلاً دیسی ریاستیں بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام۔ ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا "امانت داری" کے اس نظریئے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دئے جائیں اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفاد عامہ

---

(۱) ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگرس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروروں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گانوؤں میں پھیلے ہوئے ہیں، چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا "ہندی ہند" کے۔ جن جن گروہوں کی اغراض کانگرس کے نزدیک قابل حمایت ہیں ان میں سب پر مقدم ان بے زبانوں کی فلاح ہے اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں تو میں بے ڈھڑک کہتا ہوں کہ کانگرس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروروں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی"۔

کے لیے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جا سکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کو اٹھانے کے اہل ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق ما فوق الانسان ان پر مسلط کر دئے جائیں، لیکن دنیا میں نہ تو کوئی ما فوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے، اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے۔ تشدد سے یا عدم تشدد سے۔ اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہر حال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہیے اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہیے۔ جب تک سیاسی اور ذہنی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بیان نہیں کرتے اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور ان سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود انھیں اچھی طرح سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقا میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیر زمیندار، نیک نیت اور بامروت سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا؟ بیشک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں بلکہ میں خود اس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولتمندوں سے میل جول رکھتا ہے، میں خود ایک نمونے کا "بورژوا"[1] ہوں، اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی اور اسی کے خیالات نے ابتدا میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے "پیٹی بورژوا"[2] کہا تھا اور بالکل ٹھیک کہا تھا۔ غالباً اب وہ مجھے "اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا بورژوا" کہیں گے لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں کہ میں کیا ہوں۔ یہ بالکل مہمل بات ہے کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے۔ وہی احباب جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں، برابر یہ دعوے کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گنہگار سے۔ میں اتنا بڑا دعوے نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا ایک نظام سے ہے نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے اور جو شخص نظام کو بدلنا چاہتا ہے اُسے ان افراد اور جماعتوں سے لڑنا ہی یا انھیں اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ اگر کوئی نظام اب ہمارے لئے مفید نہیں رہا اور ترقی کی راہ میں حائل ہے تو وہ مٹ کر رہے گا اور جو طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں ان کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی۔ اس عمل تغیر میں جہاں تک ہو سکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہئے، لیکن بدقسمتی سے صورت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگزیر ہے۔ بہرحال

---

(۱) اوسط طبقے کا شہری (۲) نیچے اوسط طبقے کا شہری

یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اتنی بڑی بُرائی کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی بُرائیاں نہ اُٹھ کھڑی ہوں۔ یہ بُرائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں اور ان کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

ہر قسم کی انسانی جماعتیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی کسی نہ کسی فلسفے پر مبنی ہوتی ہیں، اور جب ان جماعتوں میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس بنیادی فلسفے میں بھی تبدیلی کی جائے تاکہ وہ نئے خیالات کے ساتھ کھپ سکے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے مگر عموماً فلسفہ واقعات کی رفتار سے پیچھے رہ جاتا ہے اور اسی سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی میں جمہوریت اور سرمایہ داری کی نشوونما ساتھ ساتھ ہوئی لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں ایک بنیادی تضاد تھا کیونکہ جمہوریت اس بات پر زور دیتی تھی کہ زیادہ لوگوں کو سیاسی قوت حاصل ہو اور سرمایہ داری اصل قوت کو صرف چند افراد تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کا بے تکا ساتھ اس لئے نبھ گیا کہ سیاسی پارلیمنٹی جمہوریت خود ایک بہت محدود قسم کی جمہوریت ہے اور اس نے قوت کے چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہونے اور اجارہ داری کی نشوونما میں بہت کم مداخلت کی مگر جوں جوں جمہوریت کے خیال کو ترقی ہوتی گئی ان دونوں کا نباہ مشکل ہوتا گیا اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ پارلیمنٹی جمہوریت اب بہت بدنام ہو گئی۔ یہ اسی کا ردعمل ہے کہ دنیا میں طرح طرح کی نئی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہندوستان میں بھی برطانوی حکومت اور زیادہ رجعت پسند بن گئی ہے اور اسے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا ہے کہ سیاسی آزادی کی ظاہری شکلوں سے بھی ہمیں محروم رکھے۔ لطف تو یہ ہے کہ ریاستیں بھی پارلیمنٹی جمہوریت کی ناکامی کو اپنی غیر محدود

مطلق العنانی کے جائز ہونے کی دلیل قرار دیتی ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے یہ ارادہ ظاہر کرتی ہیں کہ اپنے یہاں وہی قرون وسطےٰ کا طرز قائم رکھیں گی جس کا دنیا میں کہیں اور وجود نہیں (۱)۔

---

(۱) ۲۲ جنوری سنہ ۳۵ء کو مہاراجہ پٹیالہ چانسلر مجلس روسا نے چیمبر کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے بعض سیاسی وفاقی نظام کی تائید اس امید پر کرتے ہیں کہ حالات خود بخود دیسی ریاستوں کو اس پر مجبور کر دیں گے کہ وہ بھی اپنے یہاں جمہوری طرز حکومت قائم کریں۔ اس کے متعلق انھوں نے یہ فرمایا " اگرچہ دیسی ریاستیں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی ہیں کہ اپنی رعایا کے لئے وہ سب کچھ کریں جو اُن کے لئے بہتر ہے اور آئندہ بھی وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلیں اور اپنی ریاستوں کے دستور اساسی میں مقتضائے وقت کے لحاظ سے ترمیم کریں ہم صاف صاف یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر برطانوی ہند اس دھوکے میں ہے کہ وہ ہمارے تندرست سیاسی جسم کو ایک بدنام سیاسی نظریے کی اُترن پہننے پر مجبور کر دے گا تو وہ ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں"۔ (صفحہ ۴۹ پر دیوان میسور کی تقریر کا حوالہ بھی ملاحظہ ہو) اسی روداد مجلس روسا میں تقریر کرتے ہوئے مہاراجہ بیکانیر نے فرمایا "ہم دیسی ریاستوں کے فرمانروا قسمت آزمائی کرنے والے سپاہی نہیں ہیں، میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کئی صدی کی خاندانی روایات کی بنا پر ہم یہ دعوے کرسکتے ہیں کہ حکومت ہماری گھٹی میں پڑی ہے اور حکمت عملی اور تدبر میں ہمیں تھوڑا بہت حصہ ملا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے کہ کہیں دوسروں کے دباؤ میں آکر ہم عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں ...... اگر اجازت ہو تو میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کروں گا کہ ہندوستانی رئیس ہرگز اس کے لئے تیار نہیں (باقی صفحہ ۴۴ پر)

لیکن پارلیمنٹی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئی ہو بلکہ یہ ہے کہ وہ زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ گئی ہے ۔ یہ جمہوریت ناقص تھی اس لئے کہ اس نے معاشی جمہوریت کو نظر انداز کر دیا ۔ اس کا طریق کار بہت سست اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے لئے بالکل ناموزوں تھا ،،

دیسی ریاستیں غالباً آج دنیا میں انتہائی مطلق العنانی کا نمونہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برطانیہ کی محکوم ہیں ۔ لیکن برطانوی حکومت ان کے معاملات میں صرف اسی حد تک دخل دیتی ہے جہاں تک برطانوی مفاد کا تقاضا ہے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ قدیم جاگیرداری نظام کے نمونے جو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح غیر ملکی حکومت کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں کیونکہ بغیر کسی تغیر اور تبدیلی کے بیسویں صدی تک باقی رہے ۔ وہاں اب تک ہوا بند اور بھاری ہے ، پانی دھیرے دھیرے بہتا ہے اور ایک نووارد جو تبدیلی اور حرکت کا عادی ہے ملک شاید اس سے کسی قدر گھبرا بھی گیا ہے ، وہاں پہنچ کر اونگھنے لگتا ہے اور اس پر ایک جادو کی سی کیفیت چھا جاتی ہے ۔ ایک بے جان تصویر سی نظر آتی ہے جو وقت کی حرکت سے محفوظ ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتی ہے ۔ تقریباً بالکل غیر محسوس طریقے پر دیکھنے والا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳۳)

کہ کسی سے دب کر حکومت سے دست بردار ہو جائیں اور اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا وقت آ گیا کہ تاج برطانیہ اپنے عہد ناموں کے شرائط کے مطابق دیسی ریاستوں کی حفاظت نہ کر سکا تو رئیس اور ریاستیں مرتے دم تک میدان سے ہٹنے والی نہیں ،،

ماضی کے تصور میں ڈوب جاتا ہے اور بچپن کے خواب اس کی نظروں میں پھرنے لگتے ہیں۔ طرح دار جوان زرہ بکتر سے آراستہ حسین لڑکیاں، منارہ دار قلعے سورماؤں کا زمانہ، سپاہیانہ آن بان، بے نظیر شجاعت اور جاں بازی ۔ خصوصاً اگر وہ راجپوتانے کے علاقے میں ہے جو رومان اور من چلے پن کے کارناموں کا گھر ہے ۔

لیکن بہت جلد یہ تصور دھندلا پڑ جاتا ہے اور ہوا کی کثافت سے دم گھٹنے لگتا ہے سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے دھیرے دھیرے بہنے والے تالاب کی تہہ میں بند پانی کی سڑاندھ محسوس ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر طرف سے گھرا ہوا ہے اور اس کا جسم اور دماغ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، ایک طرف پرجا کی انتہائی پستی اور مصیبت اور دوسری طرف راجا کے محل کے ٹھاٹ کو دیکھ کر دل پر عجیب اثر پڑتا ہے ۔ ریاست کی دولت کا کتنا بڑا حصہ محل میں رئیس کے تعیشات اور ذاتی ضروریات کی نذر ہوتا ہے اور کتنا تھوڑا حصہ عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ یہ رئیس ریاست کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ ان پر اتنا خرچ کرکے اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ان ریاستوں پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اخبار وہاں پنپنے نہیں دیے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ادبی یا نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار چل سکتا ہے، بیرونی اخبارات کا داخلہ اکثر بند کر دیا جاتا ہے۔ سوائے چند جنوبی ریاستوں کے مثلاً ٹراونکور اور کوچین وغیرہ (جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد برطانوی علاقے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے) اور ریاستوں میں عام تعلیم بہت کم ہے۔ سب سے اہم خبریں جو ریاستوں سے آتی ہیں وہ یہ ہوتی ہیں :-

وائسرائے کی تشریف آوری کا تزک و احتشام، دربار، ایک دوسرے کی تعریف میں تقریریں، رئیس کی شادی یا سال گرہ کا پر تکلف جشن، یا پھر کسانوں کی شورش۔ خود برطانوی ہند میں رئیسوں کو لوگوں کی نکتہ چینی سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص قوانین بنا دئے گئے ہیں اور ریاست کے اندر تو معمولی سے معمولی تنقید بھی نہایت سختی کے ساتھ دبا دی جاتی ہے۔ عام جلسے، قریب قریب مفقود ہیں، یہاں تک کہ وہ جلسے بھی جو کسی معاشرتی مقصد سے کئے جائیں اکثر روک دئے جاتے ہیں۔(۱)" اکثر باہر کے سربرآوردہ قومی کارکنوں کا داخلہ ریاستوں میں روک دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں مسٹر سی۔ آر۔ داس بہت بیمار تھے اور انھوں نے صحت حاصل کرنے کی غرض سے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں کوئی سیاسی غرض نہیں تھی مگر کشمیر کی سرحد پر پہنچنے کے بعد وہ آگے بڑھنے سے روک دئے

---

(۱) حیدرآباد دکن کی ایک اخباری اطلاع مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء مظہر ہے "گاندھی جی کی سالگرہ منانے کے لئے جو عام جلسہ وویک وردنی تھیٹر میں ہونے والا تھا وہ نہیں ہو سکا جلسے کا انتظام حیدرآباد ہریجن سیوک سنگھ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس انجمن کے سکرٹری نے اخبارات کے نام ایک خط میں بیان کیا ہے کہ جلسے کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پہلے حکام نے یہ اطلاع دی کہ جلسہ کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی جائے گی کہ دو ہزار روپیے کی نقد ضمانت داخل کی جائے اور یہ وعدہ کیا جائے کہ سیاسی نوعیت کی تقریر نہ کی جائے گی اور حکام ریاست کے کسی سرکاری فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جائے گی۔ چونکہ اتنا وقت نہ تھا کہ داعی حکام سے مل کر معاملات طے کر سکتے اس لئے جلسے کا خیال مجبوراً ترک کر دیا گیا۔"

گئے۔ مسٹر جناح کو بھی حیدر آباد میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی، اور مسز نائڈو جن کا گھر خاص حیدر آباد شہر میں ہے ایک مدت تک وہاں نہیں جانے پائیں۔

جب ریاستوں کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ کانگریس کو ریاست کے باشندوں کے بنیادی حقوق کی حمایت اور ان کی پامالی پر نکتہ چینی کرنی چاہیے تھی لیکن گاندھی جی نے ریاستوں کے متعلق ایک انوکھی پالیسی ایجاد کی یعنی "ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت"۔ اس "چپ چپ" کی پالیسی پر وہ ان تمام غیر معمولی اور افسوسناک واقعات کے باوجود قائم رہے جو ریاستوں میں پیش آئے۔ حالانکہ ریاستوں کی حکومتیں بے وجہ کانگریس پر حملے کرتی رہیں بظاہر شاید یہ خطرہ ہے کہ کانگریس کی نکتہ چینی رئیسوں کو ناراض کر دے گی اور پھر اُن کو ہم خیال بنانا اور زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے اپنے جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں جو انھوں نے ریاستوں کی رعایا کی کانفرنس کے صدر مسٹر این۔ سی کیلکر کے نام لکھا تھا۔ اپنے اس خیال کو دہرایا کہ عدم مداخلت کی پالیسی بالکل صحیح اور دانشمندانہ ہے۔ ان ریاستوں کی آئینی اور قانونی حیثیت کے متعلق جو خیال انھوں نے ظاہر کیا وہ عجیب و غریب تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "یہ دیسی ریاستیں برطانوی قانون کے مطابق بالکل آزاد حیثیت رکھتی ہیں اور ہندوستان کے اس حصے کو جو برطانوی ہند کہلاتا ہے ان ریاستوں کی پالیسی کی تشکیل کا اس سے زیادہ اختیار نہیں جتنا کہ مثلاً افغانستان اور سیلون کی پالیسی میں دخل دینے کا"۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیسی ریاستوں کی رعایا کی نرم اور اعتدال پسند کانفرنس اور لبرل پارٹی نے بھی اُن کی رائے اور مشورے پر اعتراض کیا۔

لیکن یہ خیالات رئیسوں کو بہت پسند آئے۔ انھوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ہی مہینے کے اندر حکومت ٹراونکور نے اپنے حدود

ین نیشنل کانگریس کو ممنوع قرار دے دیا، اس کے تمام جلسوں کو اور ممبر بنانے کی تحریک کو روک دیا۔ اس کارروائی کے ساتھ اس نے یہ اعلان کیا کہ ذمہ دار لیڈروں نے خود ہی یہ مشورہ دیا ہے (صریحاً یہ اشارہ گاندھی جی کے بیان کی طرف تھا)۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت اس وقت کی گئی جب برطانوی ہند میں سول نافرمانی موقوف ہو چکی تھی (ریاستوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا) اور حکومت ہند نے کانگریس کو دوبارہ مطابق قانون قرار دے دیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حکومت ٹراونکور کے مشیر قانونی اس وقت سر سی۔ پی رام اسوامی آئر تھے (اور اب تک ہیں) جو ایک زمانے میں کانگریس اور ہوم رول لیگ دونوں کے جنرل سکریٹری تھے آگے چل کر لبرل بن گئے اور حکومت ہند اور حکومت مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

کانگریس کی پالیسی اور گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق حکومت ٹراونکور کے اس بے وجہ حملے کے جواب میں جو امن کے زمانے میں کانگریس پر کیا گیا اس کی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا؟[1] حالانکہ بعض لبرل حضرات نے بڑے زور شور سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ حقیقۃً ریاستوں کے معاملے میں گاندھی جی نے لبرل پارٹی سے کہیں زیادہ اعتدال اور احتیاط کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سر برآوردہ قومی لیڈروں میں شاید صرف پنڈت مدن موہن مالوی ایک ایسے شخص ہیں جو بہت سے رئیسوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اسی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ والیان ریاست کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے

---

[1] سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو بڑودے میں تقریر کرتے ہوئے اسی عدم مداخلت کی پالیسی پر زور دیا انھوں نے کہا کہ ریاستوں کے کارکنوں کو چاہئے کہ ریاست کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے دائرے میں رہ کر اپنا کام کریں اور ریاست کے کام پر نکتہ چینی کرنے کے بجائے یہ کوشش کریں کہ رعایا اور راعی کے درمیان عمدہ تعلقات قائم رہیں۔

گاندھی جی پہلے رئیسوں کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط نہ تھے ۱۹۱۶ء
کے مشہور موقع پر جب بنارس میں ہندو یونیورسٹی کی افتتاحی رسمیں
ہو رہی تھیں، انھوں نے ایک جلسے میں تقریر کی تھی جس کے صدر ایک
مہاراجہ تھے اور جس میں بہت سے اور رئیس شریک تھے۔ وہ نئے نئے
افریقہ سے واپس آئے تھے اور ہندوستان کی سیاست کا بوجھ ہنوز ان کے
دل پر نہ تھا۔ سچے مصلحانہ جوش سے انھوں نے ان حضرات کو ہدایت کی
کہ اطوار کو درست کریں اور خود پسندانہ عیش و عشرت اور شان و شوکت
چھوڑ دیں۔ انھوں نے کہا "رئیسو جاؤ اور اپنے زیور اور جواہرات کو بیچ ڈالو"
زیورات اور جواہرات تو وہ کیا بیچتے مگر جلسے ضرور گڑبڑ ہو گیا۔ ... کی حالت
میں ایک دو دو کرکے سب رئیس وہاں سے اٹھ گئے یہاں تک کہ جناب
صدر بھی مقرر کو تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ مسز بسنٹ بھی جو اس وقت وہاں
تھیں گاندھی جی کی باتوں سے خفا ہو گئیں اور جلسے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

ایک خط میں جو گاندھی جی نے مسٹر کیلکر کے نام لکھا تھا وہ فرماتے
ہیں "میں چاہتا ہوں کہ ریاستیں اپنی رعایا کو خود اختیاری حکومت عطا کر دیں
اور اپنے آپ کو جمہور کا امانت دار سمجھیں۔ اگر واقعی اس "امانت داری"
کے دعوے میں کوئی بات ہے تو پھر ہم برطانوی حکومت کے اس دعوے پر
اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی حکومت کی امانت دار ہے"
اس لئے کہ وہ بدیسی ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانی رئیسوں میں کیا فرق ہے؟
جہاں تک نسل اور تہذیب کا اختلاف ہے تو خود ہندوستان کے لوگوں میں
موجود ہے۔"

گذشتہ چند سال سے ریاستوں میں تیزی کے ساتھ برطانوی حکام ٹھونسے جا رہے ہیں۔ رئیس عموماً اس کے مخالف ہیں مگر وہ بالکل بے بس ہیں۔ یوں تو حکومت ہند ہمیشہ سے ریاستوں پر تسلط رکھتی ہے مگر اب ریاستیں اندر سے بھی جکڑ دی گئیں ہیں۔ چنانچہ جب کبھی ریاستوں کی زبان سے کچھ نکلتا ہے تو اصل میں یہ حکومت ہند کی بدلی ہوئی آواز ہوتی ہے جو جاگیرداری نظام کے پردے سے بولتی ہے۔

یہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ ریاستوں میں ہمیشہ اُس قسم کی جدوجہد جیسی برطانوی ہند میں ہوتی ہیں ممکن نہیں۔ خود برطانوی ہند کے مختلف صوبوں کی زراعتی صنعتی، فرقہ وارانہ اور انتظامی حالت میں بھی بہت فرق ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی پالیسی سب کہیں قابل عمل ہو لیکن جدوجہد کے طریقے میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ہونا اور بات ہے۔ ہماری عام پالیسی مختلف علاقوں میں مختلف نہیں ہونی چاہیئے اور جو چیز ایک جگہ بُری سمجھی جاتی ہے وہ دوسری جگہ بُری سمجھی جانی چاہیئے۔ ورنہ ہم پر یہ الزام لگایا جائے گا اور لگایا جا چکا ہے کہ ہم کوئی مستقل پالیسی اور اصول نہیں رکھتے بلکہ ہمارا مقصد صرف قوت اور اقتدار حاصل کرنا ہے۔

مختلف ملتوں اور دوسری اقلیتوں کو جُداگانہ حق انتخاب دینے کے خلاف بجا طور پر بہت کچھ نکتہ چینی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ جمہوریت کے ساتھ کسی طرح نہیں کھپ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب حلقہ ہائے انتخاب مذہبی جماعتوں میں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں تقسیم کر دیے جائیں تو جمہوریت یا ذمہ دار حکومت کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن جو لوگ اس پر بڑے زور شور سے نکتہ چینی کرتے ہیں مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی

یا ہندو سبھا کے لیڈر۔ تعجب ہے کہ وہ ریاستوں کے حالات سے مطمئن ہیں اور بظاہر اس پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ استبدادی ریاستوں اور جمہوری برطانوی ہند (یہ حضرات اسے جمہوری کہتے ہیں) کے درمیان وفاقی اتحاد ہو جائے۔ اس سے زیادہ بے تکا اور نامعقول اتحاد مشکل سے تصور میں آ سکتا ہے لیکن ہندو سبھا کے حامیان جمہوریت و قومیت بے تکلف اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم زبان سے تو منطقی صحت اور استقامت کا دعوے کرتے ہیں مگر ہمارے عمل کا بنیادی محرک اب تک جذبات کے سوا کچھ نہیں۔

غرض ریاستوں کے متعلق کانگریس کا رویہ ایک عجیب معما ہے۔ مجھے ٹامس پین کا ایک جملہ یاد آگیا جو اس نے تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے برک کے متعلق کہا تھا کہ "انھیں پروں پر ترس آتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ چڑیا مری جاتی ہے" گاندھی جی مرتی ہوئی چڑیا کو تو دیکھتے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پروں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔

کم و بیش یہی صورت تعلقہ داریوں اور بڑی زمینداریوں کے نظام کی ہے۔ اس معاملہ میں تو اب کسی دلیل و بحث کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی کہ یہ نیم جاگیرداری نظام فرسودہ ہو گیا ہے اور دولت آفرینی اور عام ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ خود سرمایہ داری کے ترقی پذیر نظام کے ساتھ اس کا نبھنا ممکن نہیں۔ چنانچہ قریب قریب دنیا کے سب ملکوں میں بڑی بڑی زمینداریاں غائب ہوتی جاتی ہیں اور کاشتکار زمیندار ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ میرا اب تک یہی خیال تھا کہ ہندوستان میں اگر کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جن زمینداروں سے زمین چھینی جائے انھیں اس کا کوئی معاوضہ دیا جائے لیکن

سال گذشتہ مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ گاندھی جی موجودہ تعلقہ داری نظام کو فی نفسہ پسند کرتے ہیں اور اُسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جولائی ۱۹۳۴ء میں انھوں نے کانپور میں کہا تھا "زمیندار اور کسان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ان کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔ پھر دونوں امن اور سلوک سے رہ سکتے ہیں۔ میں ہرگز تعلقہ داری اور زمینداری نظام کو مٹا دینے کا حامی نہیں ہوں اور جو لوگ اس کو مٹانا چاہتے ہیں وہ خود اپنے خیالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے" (یہ انھوں نے بڑی بے انصافی کی بات کہی)

آگے چل کر انھوں نے فرمایا "میں ہرگز اس کوشش میں شریک نہیں ہوں گا کہ املاک رکھنے والے طبقے سے اس کی املاک چھین لی جائے، میرا مقصد آپ کے دلوں پر اثر ڈالنا اور آپ کو اپنا ہم خیال بنانا ہے (وہ بڑے بڑے زمینداروں کے ایک وفد سے مخاطب تھے) تاکہ آپ اپنی ذاتی املاک کو رعایا کی امانت کے طور پر رکھیں اور اس کا اصل مصرف ان کی فلاح و بہبود کو سمجھیں... .... اگر بے انصافی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ آپ کی جائداد آپ سے چھین لی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی طرف سے لڑوں گا۔۔۔ مغرب کی اشتراکیت، اور اشتمالیت کی بنیاد ایسے تصورات پر ہے جو بنیادی طور پر ہمارے تصورات سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے .... اس لئے ہماری اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد عدم تشدد پر اور مزدور اور سرمایہ دار زمیندار اور کاشتکار کے ہم آہنگ تعاون پر ہونی چاہئے" میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرق اور مغرب کے بنیادی تصورات میں اس قسم کا اختلاف ہے یا نہیں، ممکن ہے کہ ہو مگر اس زمانے میں تو

صریحی اختلاف یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ دار اور زمیندار، مزدوروں اور کسانوں کے مفاد سے مغربی سرمایہ داروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ غفلت اور بے پرواہی برتتے ہیں۔ ہندوستان کے زمیندار نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ کسانوں کی فلاح وبہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ ایک یورپی مسٹر ایچ۔ این بریلس فورڈ نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ہندوستانی ساہوکار اور زمیندار ایسی خون چوسنے والی جونکیں ہیں جن کی مثال کسی موجودہ سماجی نظام میں نہیں مل سکتی"[1] لیکن غالباً ہندوستانی زمیندار کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ وہ خود زمانے کے حالات سے مجبور ہے۔ اس کی حالت گرتی چلی جاتی ہے اور اب ایسی مشکل میں پڑ گیا ہے جس سے نجات پانا اس کے بس کی بات نہیں۔ مہاجنوں نے اکثر زمینداروں کی جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور چھوٹے زمیندار اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اسی زمین پر جس کے وہ کسی زمانے میں مالک تھے کاشتکار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ شہر کے مہاجنوں نے جائدادیں رہن رکھیں اور روپیہ وقت پر ادا نہ ہونے سے فائدہ اٹھا کر ان پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ زمیندار بن بیٹھے۔ گاندھی جی کے قول کے مطابق یہ لوگ امانت دار ہیں ان غریبوں کے جن سے انھوں نے خود زمینیں چھینی ہیں اور ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی آمدنی کا اصل مصرف اسامیوں کی فلاح وبہبود کو سمجھیں گے۔

اگر واقعی تعلقہ داری نظام اچھا ہے تو اسے سارے ہندوستان میں کیوں نہ رائج کیا جائے؟ ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کسان حق ملکیت رکھتا ہے، کیا گاندھی جی اسے پسند کریں گے کہ گجرات میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار بنا دیے

---

[1] "ملکیت یا امن؟" مصنفہ ایچ این بریلس فورڈ۔

جائیں؟ میرے خیال میں تو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صوبہ متحدہ، یا بہار یا بنگال کے لئے تو کوئی اور نظام اچھا ہو اور گجرات یا پنجاب کے لئے کوئی اور غالباً شمالی اور جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے، اور ان کے بنیادی تصورات ایک ہی ہیں۔ مطلب اصل میں یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی رہے "حالت موجودہ" میں کوئی تغیر نہ کیا جائے۔ نہ تو کسی معاشی تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز لوگوں کے لئے سب سے زیادہ مناسب اور مفید ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت صرف اس کی ہے کہ لوگوں کے دل میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی جائے۔ یہ زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے کا خالص مذہبی نقطۂ نظر ہے اور اسے سیاسیات، معاشیات اور اجتماعیات سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ مگر گاندھی جی مذہب کے دائرے سے آگے بڑھ کر سیاسی اور قومی معاملات میں بھی اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔

اس قسم کے متضاد حالات اور خیالات آجکل ہندوستان کے سامنے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں بہت سی گتھیاں ڈالی ہیں جن کو سلجھائے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ مگر یہ جذبات کی مدد سے نہیں سلجھ سکتیں۔ اب سے بہت پہلے اسپنوزا نے یہ سوال کیا تھا کہ کون سی چیز بہتر ہے "علم اور عقل کے ذریعے آزادی حاصل کرنا یا جذبات کی زنجیروں میں جکڑے رہنا؟" اس نے پہلی صورت کو ترجیح دی تھی۔

(۶۴)

خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا

سولہ برس گذرے گاندھی جی نے ہندوستان پر اپنے اہنسا کے اصول کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس وقت سے اب تک ہندوستانی سیاست پر اس کا تسلط رہا ہے۔ بیشمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تائید کی، بعض نے اسے بڑی کش مکش کے بعد مشروط یا غیر مشروط طور پر قبول کیا۔ اور بعض نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا ہماری سیاسی اور سماجی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ یوں تو یہ اصول اس وقت سے چلا آتا ہے جب سے انسان میں قوت فکر پیدا ہوئی لیکن غالباً گاندھی جی پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اس سے بڑے پیمانے پر سیاسی اور سماجی تحریکوں میں کام لیا۔ ابتداً یہ ایک انفرادی چیز تھی اور اس وجہ سے اس کی حیثیت دراصل مذہبی تھی۔ اس کا مقصد انفرادی ضبط نفس ہوتا تھا اور اس کے ذریعے سے انسان ذاتی اغراض سے بری اور دنیاوی کش مکش سے بلند ہو کر ایک قسم کی شخصی آزادی اور نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس میں یہ مقصد پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے سماجی مسائل کو حل کیا جائے اور سماجی حالات میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ ہاں بالواسطہ اس کا کسی قدر اثر سماجی زندگی پر پڑتا تھا۔ اصل میں موجودہ سماجی نظام اور اس کی بے انصافیوں اور عدم مساوات کو لوگ اٹل سمجھ کر بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے۔ گاندھی جی نے یہ کوشش کی کہ اس شخصی نصب العین کو بدل کر ایک اجتماعی

سبب اِن بنا دیں۔ وہ سیاسی اور سماجی حالات دونوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے بالارادہ اس اہنسا کے طریقہ کو اس وسیع اور نئے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جو لوگ انسانوں کے ماحول اور ان کے حالات زندگی میں کوئی اہم تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ سوسائٹی میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کریں۔ اس کے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں یا تشدد اور جبر سے کام لیا جائے یا اہنسا پر عمل کیا جائے جبر کا دباؤ انسان کے جسم پر پڑتا ہے اور اس سے کام لینے والا خود ذلیل ہوتا ہے اور دوسرے کو پست کرتا ہے لیکن اہنسا کا دباؤ جو خود تکلیف اٹھا کر مثلاً فاقہ کشی کے ذریعے ڈالا جائے اس سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ جن لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے جسم پر نہیں بلکہ ان کی اخلاقی قوتوں پر اثر ڈالتا ہے اور انھیں تقویت پہنچاتا ہے۔" (۱)

یہ خیال ایک حد تک ہندوستانی فلسفہ سے ہم آہنگ ہے۔ اس لئے لوگوں نے اس کو کم سے کم سطحی طور پر نہایت جوش کے ساتھ قبول کرلیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنی دور تک پہنچتے ہیں اور جنھیں تھا انھوں نے بھی اس کے نظری پہلو کو سمجھے بغیر محض عقیدے اور عمل کے دامن میں پناہ لی۔ مگر جب عمل کا جوش کم ہوا تو لوگوں کے ذہن میں بیشمار سوالات پیدا ہوئے جن کا جواب دینا مشکل ہوگیا۔ ان سوالوں کا کوئی خاص اثر اس موجودہ سیاسی طرز عمل پر نہیں پڑا۔ بلکہ یہ در اصل اس تمام فلسفہ حیات سے متعلق تھے جس پر اس قسم کے بے تشدد مقابلے کی بنیاد ہے۔ سیاسی نقطہ نظر سے اس تحریک کو ابھی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان اب تک

---

(۱) یہ اقتباس گاندھی جی کے ایک بیان سے لیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے ایک برت کے موقع پر ستمبر ۱۹۳۲ء کو دیا تھا

شہنشاہیت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے ابھی کسی زبردست سماجی انقلاب کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ مگر باوجود اس کے اگر کسی شخص میں تھوڑی سی نظر بھی ہے تو دیکھ سکتا ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں کس قدر زبردست تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے ان میں سیرت کی پختگی، قوت اور خود اعتمادی پیدا کر دی ہے اور یہ ایسی صفات ہیں جن کے بغیر سیاسی اور سماجی ترقی حاصل کرنا یا اس کا قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ اس کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا کہ یہ فوائد کہاں تک اہنسا کے اصول کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں اور کہاں تک ہماری سیاسی کش مکش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بہت سی قوموں کو اکثر موقعوں پر یہ تمام فوائد ایسی کش مکش سے بھی حاصل ہوئے ہیں جس میں تشدد کو دخل تھا۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس اعتبار سے عدم تشدد (اہنسا) کا طریقہ ہمارے ملک کے لئے بیحد مفید ثابت ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں سوسائٹی میں وہ "ذہنی ہیجان" پیدا کرنے میں مدد ملی ہے جس کی طرف گاندھی جی نے اشارہ کیا تھا گو یہ واقعہ ہے کہ وہ ہیجان بعض بنیادی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہے۔ اس نے عام لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جو ہر انقلاب کی تمہید ہوا کرتی ہے۔

اہنسا کی یہ خوبی تو کھلی ہوئی ہے مگر یہ بجائے خود کافی نہیں۔ اصل شبہات اس سے دور نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے خود گاندھی جی سے اس مسئلے کے حل میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔ انھوں نے اس موضوع پر بے شمار موقعوں پر تقریریں کی ہیں اور مضامین لکھے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انھوں نے کبھی پبلک میں اس کے تمام فلسفیانہ اور علمی نتائج پر روشنی نہیں ڈالی (۱)۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ذرائع مقصد سے

(۱) رچارڈ بی۔ گریگ نے اپنی کتاب "عدم تشدد کی قوت" میں اس مسئلے پر علمی بحث کی ہے (باقی ۴۴۸ پر)

زیادہ اہم ہیں، روحانی اثر، جبر سے بہتر ہے اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو حق اور جبر سے تعبیر کریں بلکہ وہ اکثر انھیں ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک رجحان یہ بھی ہے کہ ان سب لوگوں کو جو اس اصول سے اتفاق نہ کریں حلقۂ خاص میں شامل نہ کیا جائے اور وہ قانون اخلاق کی خلاف ورزی کے مجرم قرار دئے جائیں۔ گاندھی جی کے بعض چیلوں پر اس کا لازمی طور پر یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت مقدس سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن ہم میں سے جو لوگ اس قدر عقیدت نہیں رکھتے انھیں بہت سے شکوک اور شبہات ہیں۔ ان شکوک کا تعلق جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں فوری ضروریات سے نہیں بلکہ اس ذہنی ضرورت سے ہے کہ عمل کے لئے کوئی ایسا یکرنگ فلسفہ اختیار کیا جائے جو انفرادی نقطۂ نظر سے اخلاقی قدر بھی رکھتا ہو اور سماجی لحاظ سے بھی مفید اور موثر ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں ابھی یہ شکوک باقی ہیں اور اس مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں جبر اور تشدد کو سخت ناپسند کرتا ہوں لیکن خود مجھ میں تشدد موجود ہے اور میں جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اکثر دوسروں پر جبر کرنا چاہتا ہوں۔ اور پھر یہ سوال ہے کہ اس ذہنی جبر سے بڑھ کر اور کونسا جبر ہو سکتا ہے جس سے گاندھی جی اپنے خاص پیرووں اور رفیقوں کے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔

مگر اصل سوال یہ ہے کہ آیا قومیں اور جماعتیں انسان کے اس انفرادی اصول کو پوری طرح اختیار کر بھی سکتی ہیں کیونکہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب نوع انسانی بحیثیت مجموعی محبت اور نیکی کی بلند تر سطح پر پہنچ جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا انتہائی نصب العین یہی ہونا چاہیے کہ انسانوں کو اس بلندی پر پہنچائیں اور نفرت، شر اور خود غرضی کو مٹائیں۔ یہ امر بجائے خود بحث طلب ہے کہ کبھی ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۴۷) ان کی کتاب بہت دلچسپ اور محرک فکر ہے۔

لیکن اس امید کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز بن جائے گی "کسی دیوانے کی کہانی جس میں شور ہی شور ہے مطلب کچھ نہیں" کیا اس مقصد کے حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم براہ راست ان اخلاقی خوبیوں کی تلقین کریں اور ان رکاوٹوں کا مطلق خیال نہ کریں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اور اس کے مخالف رجحانات کو تقویت پہنچاتی ہیں؟ یا یہ بہتر ہوگا کہ پہلے ان رکاوٹوں کو دور کرکے ہم ایک زیادہ موزوں اور سازگار ماحول تیار کریں جس میں محبت، حسن اور خیر نشو و نما پا سکیں؟ یا ان دونوں طریقوں کو ملانے کی ضرورت ہے؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تشدد اور عدم تشدد، روحانی اثر اور جبر کی حد فاصل اس قدر صاف اور واضح ہے جیسا عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اخلاقی قوت کا جبر جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کیا اہنسا اور حق ایک ہی چیز ہیں؟ حق کیا ہے؟ اس قدیم سوال کے ہزاروں جواب دئیے گئے ہیں اور پھر بھی یہ سوال آج تک حل نہیں ہوا۔ لیکن خواہ اس کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کو اہنسا کا ہم معنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تشدد بجائے خود بری چیز ہے لیکن لازمی طور پر خلاف اخلاق نہیں۔ اس کی بہت سی شکلیں اور بہت سے مدارج ہیں اور ممکن ہے کہ بعض حالات میں یہ اور طریقوں پر قابل ترجیح ہو۔ گاندھی جی نے خود کہا ہے کہ تشدد بزدلی، خوف اور غلامی سے بہتر ہے اور اس فہرست میں اور بھی بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عام طور پر تشدد کا تعلق نفرت اور بدخواہی سے ہوتا ہے لیکن کم از کم نظری طور پر یہ کوئی لازمی تعلق نہیں۔ یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ تشدد کی بنیاد خیر خواہی پر ہو (مثلاً ایک سرجن کا تشدد) اور جو چیز خیر خواہی پر مبنی ہو وہ اصولاً خلاف اخلاق نہیں ہو سکتی۔ اخلاق کا اصل معیار نیت کا اچھا یا برا ہونا ہے۔ لہٰذا اگرچہ تشدد اکثر اوقات اخلاقاً ناجائز ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کو خطرناک سمجھنا چاہئے

لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

زندگی میں جنگ اور تشدد کا دور دورہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً تشدد کا نتیجہ تشدد ہی ہوتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کو بالکل ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ایک بالکل ہی فلسفیانہ رو یہ اختیار کیا جائے جو زندگی سے سراسر بے تعلق ہے۔ موجودہ حکومت اور نظام معاشرت کی بنیاد تمام تر تشدد پر ہے۔ ریاست کے تشدد کے بغیر نہ ٹیکس وصول ہو سکتے ہیں نہ زمینداروں کو اپنی زمینوں کا لگان مل سکتا ہے۔ نہ ذاتی ملکیت قائم رہ سکتی ہے۔ قانون۔ فوجی قوت کی امداد سے ایک شخص کو دوسرے کی ذاتی ملکیت میں دخل دینے سے روکتا ہے۔ خود قومی ریاست کی بنیاد جارحانہ دفاعی تشدد اور مدافعانہ تشدد پر قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کا اہنسا کا اصول محض ایک منفیانہ نظریہ نہیں ہے یہ عدم مقاومت نہیں بلکہ بے تشدد مقاومت ہی جو اس سے بالکل مختلف اور ایک مثبت اور موثر طریق کار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے نہیں جو موجودہ حالات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ تو جاری ہی اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ سوسائٹی میں ایک ہیجان برپا کیا جائے اور اس طرح موجودہ حالات میں تبدیلی کی جائے۔ خواہ یہ روحانی اثر ڈالنے کی نیت سے جاری کیا گیا ہو مگر عملاً یہ جبر کا ایک پرزور آلہ ثابت ہوا ہے اگرچہ یہ جبر بہت ہی مہذب اور معقول قسم کا تھا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود گاندھی جی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں "جبر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ چیمز فورڈ وائسرائے ہند کی اس تقریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جو انھوں نے پنجاب میں مارشل لا کے مظالم کے متعلق کی تھی وہ لکھتے ہیں:-

ہز ایکسلنسی نے کونسل کی افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی اس سے ایک ایسا ذہنی رجحان ظاہر ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی خوددار شخص کے لئے ان کے یا ان کی

حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا ممکن نہیں۔ پنجاب کے متعلق جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی تلافی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم "مستقبل" قریب کے مسائل پر اپنی پوری توجہ صرف کریں! ہمارے لئے مستقل کا فوری مسئلہ یہ ہے کہ ہم گورنمنٹ کو مجبور کریں کہ اس نے جو کچھ پنجاب میں کیا ہے اس پر پچھتائے اور اس کی تلافی کرے، مگر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بہ خلاف اس کے ہز اکسلنسی معترضوں کا جواب دینے سے بچنا چاہتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تمام اہم مسائل میں جن کا تعلق ہندوستان کی قومی خودداری سے ہے ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ تمام معاملات کو تاریخ کے فیصلہ پر چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کے الفاظ سے ہندوستانیوں کو اور زیادہ اشتعال ہوگا۔ تاریخ کا فیصلہ ان غریبوں کے کس کام آئے گا۔ جن پر ظلم کیا گیا ہے اور جو اب تک ایسے حکام کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں کا سراسر نااہل ثابت کیا ہے۔ پنجاب کے ساتھ انصاف کرنے سے صریحاً انکار کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ تعاون عمل کی دعوت دینا سراسر ریاکاری ہے۔"

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ حکومتوں کا قیام تشدد پر منحصر ہے اور یہ تشدد محض فوجی قوت کا کھلا ہوا تشدد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک اور چھپا ہوا تشدد ہوتا ہے جس میں جاسوسوں، مخبروں، حکومت کے گرگوں سے کام لیا جاتا ہے، مدرسوں اور اخباروں وغیرہ کے ذریعے پروپگنڈا کیا جاتا ہے مذہب اور دوسری قوتوں کا دباؤ ڈالا جاتا ہے، افلاس اور فاقہ کشی سے کمر توڑ دی جاتی ہے۔ جہاں تک حکومتوں کے باہمی معاملات کا تعلق ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ نہ صرف جنگ کے زمانے میں بلکہ صلح کے زمانے میں بھی ہر قسم کا جھوٹ اور دغا بازی جائز

ہے بشرطیکہ وہ پوشیدہ رہے۔ تین سو برس گذرے سر ہنری ووٹن نے جو شاعر تھے اور برطانوی سفیر بھی تھے۔ سفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی کہ "وہ دیانتدار آدمی جو اپنے ملک کی خاطر جھوٹ بولنے کے لئے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے" آج کل سفیروں کے ساتھ بہت سے فوجی، بحری، اور تجارتی مددگار ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ملکوں میں جاسوسی کریں جہاں وہ تعینات ہیں۔ ان کی مدد کے لئے خفیہ پولیس کا وسیع نظام ہوتا ہے جس کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا جال دور دور تک پھیلا ہوتا ہے جس میں اپنے جاسوس الگ ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے جاسوسوں کی کاٹ کرنے والے الگ، جن میں جرائم پیشہ لوگوں سے کام لیا جاتا ہے، رشوت کے ذریعے انسانی فطرت ذلیل کی جاتی ہے، اور لوگ پوشیدہ طور پر قتل کرائے جاتے ہیں یہ چیزیں امن کے زمانے میں بھی کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن جنگ میں ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور ان کا تباہ کن اثر ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جو جھوٹا پروپگنڈا کیا گیا، مخالف ملکوں کے متعلق جو غلط خبریں پھیلائی گئیں اور اس کام پر اور محکمہ جاسوسی پر جو بے اندازہ رقمیں صرف ہوئیں ان کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے لیکن آج کل امن بھی محض دو جنگوں کے درمیان کے وقفے اور جنگ کی تیاری کا نام ہے اور اس زمانے میں بھی اقتصادی میدان اور دوسرے میدانوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔ فاتحوں اور مفتوحوں، شہنشاہی حکومتوں اور ان کی نوآبادیوں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں میں برابر ایک کشمکش رہتی ہے۔ غرض اس نام نہاد صلح میں بھی ایک حد تک جنگ کی فضا مع اپنے لوازم یعنی فریب و تشدد کے قائم رہتی ہے اور فوجی اور ملکی ملازموں کو اسی کی تربیت دی جاتی ہے۔ لارڈ وزلی نے اپنی کتاب "فیلڈ سروس کی پاکٹ بک" میں لکھا ہے "ہم اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے رہیں گے کہ دیانتداری سب سے بہتر پالیسی ہے" اور جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے" یہ جملے ایک بچے کی کاپی پر بہت اچھے معلوم ہوتے

ہیں لیکن جو شخص جنگ میں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنی تلوار میان میں رکھ لے۔"

آج کل قوموں اور جماعتوں میں جو اختلافات اور کشمکش ہیں ان کی وجہ سے سیاسی زندگی کا تشدد اور جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہونا تقریباً ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے جو قومیں اور جماعتیں دوسروں سے زیادہ حقوق رکھتی ہیں وہ اپنے حقوق کو قائم رکھنا اور دوسروں کی نشوونما کے مواقع کو روکنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا وہ اس پر مجبور ہیں کہ تشدد، جبر اور جھوٹ سے کام لیں۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ جب رائے عامہ کا اثر زیادہ بڑھ جائے اور لوگ ان مخالفتوں اور رکاوٹوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہوجائیں تو اس تشدد میں کمی ہوجائے مگر واقعہ یہ ہے کہ حال میں جو کچھ تجربہ اس بارے میں ہوا ہے اس سے برعکس نتیجہ نکلتا ہے اور جوں جوں موجودہ اداروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ کیا گیا ان کا تشدد اور بڑھتا گیا۔ اگر کھلے ہوئے تشدد میں کچھ کمی بھی ہوئی تو اس نے زیادہ خطرناک اور پوشیدہ شکلیں اختیار کرلیں۔ تشدد کا یہ رجحان نہ تو عقلیت کی نشوونما سے رک سکا اور نہ مذہب و اخلاق سے۔ بے شک بعض افراد نے انسانیت کے مدارج میں ترقی کی ہے اور اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر اوسط درجے کے لوگ پہلے سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لحاظ سے سماج نے ترقی کی ہے اور ایک حد تک قدیم وحشیانہ جبلتوں پر قابو پانے کی کوشش بھی شروع ہوگئی ہے لیکن یہ افراد تک محدود ہے۔ جماعتوں اور گروہوں کے طرز عمل میں کوئی خوشگوار تغیر نہیں ہوا افراد کے مہذب ہو جانے سے ان کے بہت سے ابتدائی جذبات اور برائیاں جماعت کی طرف منتقل ہوگئی ہیں اور چونکہ تشدد کو ہمیشہ وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو اخلاقاً کمتر درجے کے ہوں۔ اس لئے ان جماعتوں کے لیڈر ان کے بہترین اشخاص نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ تشدد کی بدترین صورتیں رفتہ رفتہ دور ہوجائیں گی

اس وقت بھی ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ حکومت اور سماجی زندگی دونوں کے قیام کے لئے جبر کی ضرورت ہے۔ سماجی زندگی کے لئے کسی قسم کی حکومت ضروری ہے اور جو لوگ برسر حکومت ہوں وہ اس پر مجبور ہیں کہ وہ ان تمام انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی روک تھام کریں جو سر بسر خود غرضی پر مبنی ہیں اور جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ عموماً وہ اس معاملے میں ضرورت کی حد سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ حکومت اور قوت کا خاصہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے اخلاق کو خراب اور لپست کر دیتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواہ ان لوگوں کو آزادی سے کتنی ہی محبت ہو اور وہ جبر کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ سرکشوں پر جبر کریں۔ اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ملک کے تمام افراد اخلاقی حیثیت سے کامل، بے غرض، بے نفس اور دل و جان سے فلاح عامہ کے طالب نہ بن جائیں حکومت کے ارکین کو ان بیرونی جماعتوں کے خلاف بھی جبر و تشدد سے کام لینا پڑے گا جو ملک پر حملہ کریں یعنی انھیں قوت کے مقابلے میں قوت استعمال کر کے اپنی مدافعت کرنی پڑے گی اس کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ایک عالمگیر سلطنت قائم نہ ہو جائے۔

اگر قوت اور جبر بیرونی مدافعت اور اندرونی نظم و استحکام دونوں کے لئے ضروری ہے تو اس کی حدود کس طرح قائم کی جائیں؟ جیسا کہ رائن ہولڈ نائی بور[1] نے کہا ہے "جب ایک دفعہ اخلاق کی طرف سے سیاست کو جبر کی اجازت دے دی جائے اور اسے سماجی استحکام کا ایک لازمی ذریعہ تسلیم کر لیا جائے تو تشدد آمیز اور بے تشدد جبر کے درمیان کوئی معین حد فاصل قائم نہیں کی جاسکتی اور حکومت کے جبر اور انقلاب پسند کے جبر میں بھی تمیز نہیں ہو سکتی"۔

---

(۱) اپنی کتاب "نیک فرد اور بد جماعت" میں

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ گاندھی جی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس ناقص دنیا میں قومی ریاست کو بھی بیرونی طاقتوں کے حملوں کی مدافعت کے لئے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ یقیناً ریاست کو اپنے ہمسایوں اور دوسری ریاستوں سے دوستانہ اور پُرامن تعلقات کی توقع کرنی چاہیئے۔ لیکن حملے کے امکان سے انکار کرنا سراسر مہمل بات ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کو کچھ جبری اور تشدد آمیز قوانین بھی پاس کرنے پڑیں گے یعنی ایسے قوانین جن سے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کچھ حقوق اور مراعات ان سے چھین لئے جائیں گے! ور ان کی آزادیٔ عمل محدود ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہ کچھ جبر و تشدد تو سبھی قوانین میں پایا جاتا ہے۔ کانگریس کے کراچی والے پروگرام کے مطابق "عوام کی محنت سے جو ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اسے ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مفہوم میں اس ملک کی کروڑوں فاقہ کش باشندوں کی حقیقی معاشی آزادی کو بھی شامل کیا جائے" اس مناسب خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان لوگوں کو جنھیں آج ضرورت سے زیادہ مراعات حاصل ہیں اپنے حصے میں سے بہت کچھ انھیں دینا پڑے گا جو ان مراعات سے محروم ہیں۔ مزید برآں اس پروگرام میں یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو کم سے کم اتنا ضرور ملنا چاہیئے کہ ان کی زندگی بسر ہو سکے اور انھیں دوسری ضروری سہولتیں میسر آسکیں۔ نیز یہ کہ جائداد پر خاصے محاصل عائد کئے جائیں گے "ریاست بنیادی صنعتوں اور محکموں، معدنی ذرائع دولت، ریلوے، نہروں، جہازوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کی یا خود مالک ہوگی یا ان پر نگرانی رکھے گی" آبادی کی ایک کثیر تعداد اس کی مخالفت کرے گی۔ وہ اکثریت کی مرضی کو گوارا کریں گے لیکن اسی حالت میں جب ان کے دل میں نافرمانی کے نتائج کا خوف موجود ہوگا۔ دراصل جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔

اگر اکثریت کوئی ایسا قانون پاس کرتی ہے جس سے حقوق ملکیت پر اثر پڑتا ہے یا وہ بالکل منسوخ کر دیے جاتے ہیں تو کیا اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یہ جبر و تشدد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی طریقہ تمام جمہوری قوانین کے پاس کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے جبر و تشدد کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت غلطی پر ہے یا اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہے پھر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جس قانون کو اکثریت نے پاس کیا ہے وہ کسی اخلاقی اصول کے منافی تو نہیں لیکن اس کا فیصلہ کون کرے۔ اگر افراد اور جماعتوں کو یہ حق دیدیا جائے کہ اپنے مفاد کے مطابق اخلاقی قوانین کی تفسیر کر لیا کریں تو جمہوری طرز حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے اگر وہ ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے، افراد کو جماعت کے مقابلہ میں مجموعی طور پر ایک خطرناک اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو جماعت کے لئے سخت مضر ہے۔ میں اس اقتدار کو اخلاقی اصول کے خلاف اور شراب خواری سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ نقصان فرد کو پہنچتا ہے نہ کہ جماعت کو۔

بعض لوگ عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے اس لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس دلیل کو نہایت شدومد کے ساتھ وہ بڑے بڑے زمیندار میرے سامنے پیش کرتے ہیں جنھیں اپنے لگان کو حکومت کی امداد سے جبراً وصول کرنے میں مطلق باک نہیں اور وہ سرمایہ دار جو بیسیوں کارخانوں کے مالک ہیں اور جنھیں یہ گوارا نہیں کہ ان کے علاقے میں مزدور اپنی آزاد انجمن قائم کریں۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے بلکہ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے

نقصان پہنچنے والا ہے انھیں بھی راضی کرلینا چاہئے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو چند ارباب غرض جب چاہیں گے اچھی سے اچھی تبدیلیوں کو جن کی ضرورت بالکل مسلم ہو، روک دیں گے۔

دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔ معاشی اغراض کے سامنے نہ عقلی دلائل کا زور چلتا ہے نہ اخلاقی اصول کا۔ ممکن ہے افراد کے عقائد بدلے جا سکیں اور وہ اپنے امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیں، اگرچہ یہ بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ لیکن جماعتیں اور طبقے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اس لئے ایسی سب کوششیں جن کا مقصد یہ تھا کہ امتیازی حقوق رکھنے والے طبقے کا عقیدہ بدل دیا جائے تاکہ وہ اپنے اقتدار اور ناجائز حقوق سے از خود دست بردار ہو جائے، ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ آئندہ اس قسم کی کوشش کامیاب ہوں گی۔ رائن ہولڈ نیبور اپنی کتاب (1) میں ان معلمین اخلاق کی تردید کرتا ہے "جو یہ خیال کرتے ہیں کہ عقلیت کی ترقی یا مذہبی ہمدردی کی نشوونما سے لوگوں کی خود غرضی میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور انسانی جماعتوں اور گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ اسی عمل ترقی کو جاری رکھا جائے۔" وہ کہتا ہے "یہ معلمین اخلاق اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ انسانی جماعت میں انصاف قائم کرنے کے لئے سیاسی جدوجہد بھی ضروری ہے کیونکہ انھیں یہ احساس نہیں کہ انسان کے مجموعی عمل میں بعض طبیعی عناصر شامل ہیں جو کسی طور پر عقل یا ضمیر کے تابع نہیں ہو سکتے وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ جب کوئی مجموعی قوت چاہے وہ شہنشاہی کی شکل میں ظاہر

---

(1) Moral man & Immoral Society

ہوجاتا ہے طبقوں کے اقتدار کی شکل ہیں، کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کردیتی ہے تو اس کا توڑ قوت ہی سے ہوسکتا ہے۔" ایک جگہ اور وہ لکھا ہے" چونکہ سماجی معاملات میں عقل ایک حد تک ہمیشہ اغراض کی تابع ہوتی ہے۔ اس لئے سماجی انصاف محض اخلاقی اور عقلی دلیلوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے لئے جنگ کرنا لازمی ہوجاتا ہے اور اس جنگ میں قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کرنا پڑتا ہے۔"

اس لئے یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جاسکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہوجائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ بغیر مؤثر دباؤ ڈالے ہوئے یعنی بغیر جبر و تشدد سے کام لئے ہوئے کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھالے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہوجائے گا۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی بھی مؤثر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ اس کو جبر و تشدد نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک یہ دباؤ خود اپنی ذات پر تکلیف اٹھاکر ڈالا جاسکتا ہے۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ کیونکہ اس میں ایک مابعد الطبیعاتی عنصر شامل ہے جو کسی مادی پیمانے سے نہیں ناپا جاسکتا۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا حریف پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ اس سے اس کی اخلاقی مزاحمت کی قوت کمزور ہوجاتی ہے، اس کا ارادہ متزلزل ہوجاتا ہے، اس میں جو بہترین صفات ہیں وہ بیدار ہوجاتی ہیں اور مصالحت کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ محبت سے پیش آنے اور اپنے اوپر تکلیف اٹھانے کا نفسیاتی اثر دشمن پر اور دیکھنے والوں پر بہت قوی ہوتا ہے۔ اکثر شکاری اس بات سے واقف ہیں کہ ایک وحشی جانور کے نزدیک پہنچنے کے مختلف طریقوں سے کس قدر فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ جانور جارحانہ انداز کو دور سے محسوس

کر لیتا ہے اور اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ اگر آدمی کے دل میں خوف کا شائبہ بھی پیدا ہو جسے وہ خود پوری طرح محسوس نہیں کرتا تو جانور کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر حملہ کر دیتا ہے۔ اگر شیر کو سدھانے والے کی ہمت ایک لمحے کے لئے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے تو یہ خطرہ ہے کہ شیر فوراً حملہ کر دے گا۔ جو آدمی بالکل نڈر ہو اُسے وحشی جانوروں سے گزند پہنچنے کا بہت کم احتمال ہوتا ہے سوا اس کے کہ کوئی اتفاقی واقعہ پیش آ جائے۔ اس لئے یہ بالکل فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان بھی ان نفسی اثرات سے متاثر ہو۔ لیکن افراد پر اثر پڑنا اور چیز ہے، شبہ تو اس میں ہے کہ کسی طبقے یا جماعت پر بھی اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ جماعت من حیث الجماعت فریق مخالف سے ذاتی اور گہرے تعلقات نہیں رکھتی اور اسے جو خبریں پہنچتی ہیں وہ یک طرفہ اور مسخ شدہ ہوتی ہیں۔ بہر حال اُسے دوسرے فریق پر جو اس کی قوت کو توڑنا چاہتا ہے، اس شدت سے غصہ آتا ہے کہ اور سب چھوٹے چھوٹے جذبات اس غصے سے دب جاتے ہیں۔ وہ ایک مدت سے یہ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے کہ اس کا اقتدار اور اس کے امتیازی حقوق سماج کے مفاد کے لئے ضروری ہیں اور اگر کوئی اس سے اختلاف کرے تو وہ اسے کفر اور الحاد معلوم ہوتا ہے۔ نظم و امن اور موجودہ حالت کا قائم رکھنا اس کی نظر میں سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے اور اس کی مخالفت سب سے بڑا گناہ۔

اس لئے جہاں تک فریق مخالف کا تعلق ہے، عقائد کو بدلنے کی کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو اُسے دوسروں کی نیکی اور نرمی پر اور بھی غصہ آتا ہے کیونکہ اس سے اس کا غلطی پر ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جب آدمی کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہی غلطی پر ہے تو اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ جاتی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ عدم تشدد کے طریقے سے مخالفوں کے چند افراد متاثر ہوتے

ہیں اور مخالفت کی مجموعی قوت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ غیر جانبداروں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے اور دنیا کی رائے عامہ پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے لیکن یہاں بھی اس بات کا امکان ہے کہ حکمراں طبقہ خبروں کو باہر نہ جانے دے یا ان کو مسخ کر دے کیونکہ اشاعت کے جتنے ذرائع ہیں وہ اسی کے قبضے میں ہوتے ہیں اور وہ یہ کر سکتا ہے کہ لوگوں کو صحیح واقعات کا علم نہ ہونے دے۔ عدم تشدد کے طریقے کا سب سے قوی اور وسیع اثر اس ملک کے بے حس لوگوں پر پڑتا ہے جہاں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ان کے عقائد یقیناً بدل جاتے ہیں اور وہ اکثر نہایت جوش و خروش کے ساتھ تائید کرنے لگتے ہیں لیکن انھیں ہم خیال بنانا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ جو مقصد پیش نظر ہوتا ہے اس سے تو وہ متفق ہوتے ہیں کسی نصب العین کے لئے تکلیفیں اٹھانا ہمیشہ اچھا سمجھا گیا ہے اپنے مقصد کی خاطر سختیاں جھیلنے، ظلم و جور کا مقابلہ کرنے پر مگر ظالم سے انتقام نہ لینے میں وہ عظمت و شان ہے جو خواہ مخواہ دل پر اثر کرتی ہے لیکن اس میں اور بے بسی کی مظلومی میں بہت ہی کم فرق ہے اور یہ بے بسی کی مظلومی بہت جلد ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور انسان کے لئے باعث ذلت بن جاتی ہے۔ اگر تشدد میں اس کا خوف ہے کہ انسان کو ایذا رسانی کا شوق نہ ہو جائے تو عدم تشدد کی منفی صورتوں میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اسے ایذا اٹھانے کا چسکا نہ پڑ جائے اور پھر اس کا بھی امکان ہے کہ عدم تشدد اپنی کاہلی اور بزدلی کو چھپانے اور موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا بہانہ بنا لیا جائے۔

پچھلے چند سال سے جب سے ہندوستان میں بنیادی معاشرتی تبدیلیوں کے خیال نے اہمیت حاصل کی ہے، یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اس قسم کی تبدیلی میں لازمی طور پر تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اس لئے اس کی حمایت جائز نہیں طبقوں کی جنگ کا (چاہے وہ آج بھی موجود ہو) نام تک نہ لینا چاہئے اس لئے کہ اس سے

ہمارے اس خواب میں خلل پڑتا ہے کہ ہم سب طبقوں کے اتحاد عمل سے بغیر تشدد کے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہیں گے اور ایک روز کسی نہ کسی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ سماجی مسئلے کے حل کرنے میں کسی وقت تشدد سے کام لینا ضروری ہو جائے کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ حقوق رکھنے والی جماعتیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تشدد کے استعمال کرنے میں کبھی تامل نہ کریں گی لیکن اصولاً اگر عدم تشدد کے طریقے سے ایک زبردست سیاسی تبدیلی کا پیدا کرنا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقے سے بنیادی سماجی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن سمجھا جائے۔ اگر ہم تشدد کے ذریعے سے سیاسی آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا خاتمہ کر سکتے ہیں تو اسی کے ذریعے سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا مسئلہ اور دوسرے معاشرتی مسائل بھی حل کر سکتے ہیں اور اشتراکی ریاست بھی قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ واقعی یہ سب چیزیں عدم تشدد کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں یا نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ یا تو عدم تشدد کے ذریعے سے دونوں مقصد حاصل ہو سکتے ہیں یا دونوں میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ عدم تشدد کا طریقہ صرف ایک غیر ملکی حکمران کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ملک کے اندر خود غرض طبقوں اور ترقی کے دشمنوں کے خلاف اسے استعمال کرنا زیادہ سہل ہے کیونکہ ان پر اس کا نفسیاتی اثر کہیں زیادہ قوی ہوگا۔ البتہ جو لوگ تبدیلی سے ڈرتے ہیں ان پر اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں عدم تعاون اور سول نافرمانی کے اس تیزی سے پھیل جانے سے ثابت ہو گیا کہ کس طرح ایک بے تشدد تحریک بے شمار آدمیوں پر زبردست اثر ڈالتی ہے اور بہت سے لوگوں کو جو پہلے مذبذب تھے اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے اس کے مخالف تھے ان کو تو یہ ہم خیال نہیں بنا سکی۔ بلکہ اس تحریک کی کامیابی نے ان کے اندیشوں میں اور اضافہ کر دیا اور ان کی مخالفت

اور بڑھ گئی۔

اگر اس بات کو ایک دفعہ تسلیم کر لیا جائے کہ ریاست کو اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے جبر و تشدد استعمال کرنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے جبر و تشدد سے کام لینا جائز نہ سمجھا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تشدد کا طریقہ مصلحت کے خلاف ہو لیکن اسے ناجائز اور ممنوع نہیں کہہ سکتے محض اس سے کہ حکومت برسر اقتدار فرقے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے قبضے میں ملک کی مسلح افواج ہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے جبر و تشدد کے استعمال کرنے کا حق مل جاتا ہے جس سے وہ پہلے محروم تھی؟ اگر اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی جائے تو وہ اس کا مقابلہ کس طرح کرے گی؟ ظاہر ہے کہ وہ تشدد کے طریقے اختیار کرنے سے پرہیز کرے گی اور اس کی پوری کوشش کرے گی کہ پُر امن طریقے سے کام چلائے۔ لیکن وہ تشدد کے استعمال کا حق تو نہیں چھوڑ سکتی۔ جو لوگ تبدیلی کے مخالف ہیں ان میں بہت سے غیر مطمئن اور شورش پسند عناصر ہوں گے جو پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہیں گے۔ اگر انہیں یہ خیال ہوگا کہ ان کے تشدد کو روکنے کے لئے نئی ریاست سختی سے کام نہیں لے گی تو وہ اور دل کھول کر تشدد کریں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشدد اور عدم تشدد جبر سے کام لینے اور عقائد پر اثر ڈالنے میں کوئی واضح حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ مشکل سیاسی تبدیلیوں کے مسئلے میں بھی ہوتی ہے لیکن جب امیروں اور غریبوں کی کشمکش کا سوال ہو تو اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان میں آج کل یہ رجحان ہے کہ کسی مقصد یا پالیسی کو محض اس لئے بُرا کہا جائے کہ وہ عدم تشدد کے منافی ہے۔ میرے خیال میں مسائل پر غور کرنے کا یہ بالکل اُلٹا طریقہ ہے۔ ہم نے پندرہ سال ہوئے عدم تشدد کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کا سب سے معقول اور مؤثر طریقہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہمارا مقصد عدم تشدد

سے جُدا تھا۔ صرف اس کا ضمیمہ یا نتیجہ نہ تھا۔ اس وقت کسی شخص کے منہ سے یہ بات نہیں نکلی تھی کہ آزادی اور مکمل خود مختاری کی کوشش صرف اُسی صورت میں کرنی چاہئے جب یہ عدم تشدد کے طریقوں سے حاصل ہو سکیں۔ لیکن اب خود ہمارا مقصد عدم تشدد کے معیار پر پرکھا جاتا ہے اور اگر اس کے مطابق نہ نکلے تو رد کر دیا جاتا ہے غرض عدم تشدد کا تخیل ایک اٹل عقیدہ بنتا جاتا ہے جس پر کسی قسم کا اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے اسی لئے عقل کے نزدیک اس کی روحانی کشش زائل ہوتی جاتی ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ مذہب کی مسل میں نتھی ہو کر داخل دفتر کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی کشتی کے لئے لنگر کا کام دے رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ موجودہ حالت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے لئے عدم تشدد کا اصول اور بے تشدد جنگ کا طریق عمل بہت مفید ہے، اور گاندھی جی نے لوگوں کے خیالات اس کی طرف متوجہ کر کے زبردست خدمت انجام دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بنی نوع انسان انھیں مکمل طور پر اختیار کرنے کے لئے ابھی تک تیار نہ ہو۔ اے۔ ای کے ڈرامے Interpreters میں ایک شخص کہتا ہے کہ "تم اندھے کے ہاتھ میں شمع دیتے ہو لیکن وہ اس سے سینکنے کے سوا اور کیا کام لے سکتا ہے؟" تو یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی اس شمع کی روشنی زیادہ نہ پھیلے لیکن تمام بڑے خیالات کی طرح اس کا اثر رفتہ رفتہ بڑھے گا اور ہمارے اعمال کو روز بروز متاثر کرے گا۔ عدم تعاون یعنی اُس حکومت یا جماعت سے جو بُری سمجھی جاتی ہے، کسی قسم کا تعاون نہ کرنا بڑا قوی اور موثر اصول ہے۔ معدودے چند اخلاقی قدر رکھنے والے اشخاص بھی عمل کریں تو اس کا اثر پھیلتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے جب زیادہ تعداد میں لوگ اسے اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا ظاہری اثر اور بھی نمایاں

ہو جاتا ہے لیکن بعض خارجی چیزیں اس کے اخلاقی پہلو کو دھندلا کر دیتی ہیں۔ جب اس کا دائرہ وسیع کیا جاتا ہے تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ مجموعی ذہنیت رفتہ رفتہ شخصی ذہنیت پر غالب آجاتی ہے مگر خالص عدم تشدد پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے یہ چیز زندگی سے جدا اور دور ہو گئی ہے اور لوگ یا تو اسے آنکھ بند کر کے مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کر لیتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے۔ ذہنی عنصر بالکل دب کر رہ گیا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس کا تخویف پسندوں پر بڑا اثر پڑا تھا۔ ان میں سے بہت سے اس گروہ سے نکل آئے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ بھی شبہ میں پڑ جانے کی وجہ سے سست ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنے تشدد آمیز مشاغل کو روک دیا تھا۔ لیکن اب ان پر اس کا یہ اثر نہیں ہے۔ خود کانگریس کے اندر ایک اہم جماعت جس نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد کے طریقے کی شرائط پوری کرنے کی کوشش کی اب ملحد اور منکر سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے کانگریس میں رہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ اس کے لئے تیار نہیں کہ عدم تشدد کو اپنا دین و ایمان مانے اور اس مقصد کو ترک کر دے جو اسے دل سے عزیز ہے یعنی اشتراکی ریاست جس میں سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جائے اور ہر شخص کو برابر کے حقوق دئے جائیں، ایک منظم سوسائٹی جس کے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ امتیازی حقوق اور ملکیت کے حقوق میں سے اکثر منسوخ کر دئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی تک گاندھی جی کا بہت بڑا اثر ہے، ان کے عدم تشدد میں حرکت اور جارحانہ کیفیت پائی جاتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس روز وہ ملک میں برقی لہر دوڑا کر ترقی کی جد و جہد شروع کر دیں گے۔ وہ اپنی عظمت اور متضاد خصوصیات اور عوام میں حرکت پیدا کرنے کی غیر معمولی قوت کی وجہ سے عام معیاروں سے بہت بلند ہیں۔ ان کو ہم اس

پیمانے سے نہیں ناپ سکتے جس سے دوسروں کو ناپتے ہیں لیکن بہت سے لوگوں میں جو ان کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس قسم کی نکمی صلح پسندی اور عدم مزاحمت کی جھلک نظر آتی ہے جس کی تعلیم ٹالسٹائے نے دی ہے یا وہ ایک تنگ خیال فرقے کے رکن بن کر رہ جاتے ہیں جنھیں زندگی اور واقعات سے لگاؤ تک نہیں۔ ان لوگوں کے گرد بہت سے وہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا مفاد موجودہ نظام کے قائم رکھنے سے وابستہ ہے اور جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کی آڑ لیتے ہیں۔ اس طرح زمانہ سازی اور مصلحت پرستی کا قدم درمیان میں آجاتا ہے، مخالف کو ہم خیال بنانے کی کوشش کا انجام عدم تشدد کی بدولت یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود دشمن کا ہم خیال بن کر اسی کی طرف سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جب ہمارا جوش گھٹتا ہے اور ہم کمزور ہونے لگتے ہیں تو ہم پیچھے ہٹنے اور مصالحت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اپنا جی خوش کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ہم دشمن کو ہرا رہے ہیں اور بعض وقت یہ کامیابی ہم اپنے پرانے رفیقوں کو قربان کر کے حاصل کرتے ہیں ہم ان کی انتہا پسندیوں اور ان کے ان بیانات کی، جو ہمارے نئے دوستوں کو ناگوار ہوں۔ مذمت کرتے ہیں اور ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے ہم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جگہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ موجودہ نظام میں فراخ دلی اور احسان و مروت پیدا کر کے اس کی اصلاح کی جائے اور اونچے طبقوں کے مستقل حقوق بدستور قائم رہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ گاندھی جی نے وسائل کی اہمیت پر زور دے کر ہماری بہت بڑی خدمت انجام دی ہے مگر اس کے باوجود میری یہ قطعی رائے ہے کہ مقصد کو وسائل سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہئے جب تک ہم اس بات کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک اس رہرو کی طرح بھٹکتے پھریں گے جس کی کوئی منزل نہ ہو اور اپنی قوتوں کو ضمنی اور

غیر اہم مسائل پر ضائع کرتے رہیں گے لیکن ظاہر ہے کہ ذرائع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اخلاقی پہلو سے قطع نظر ان کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ بُرے اور غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنے سے اکثر اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور نہایت زبردست نئی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کسی شخص کے متعلق صحیح رائے اس کے مقصد کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان ذرائع کے لحاظ سے قائم کی جاتی ہے جو وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے، اگر ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا ہوں اور دلوں میں نفرت بڑھے تو راہ کی مشکلات بڑھتی جائیں گی اور منزل مقصود دور ہوتی جائے گی حقیقت یہ ہے کہ مقاصد اور ذرائع میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں اس لئے لازمی طور پر ذرائع ایسے ہونے چاہئیں جن سے مخالفت اور نفرت نہ پیدا ہو یا کم سے کم ایک حد سے آگے نہ بڑھے (کیونکہ اس کا پیدا ہونا تو ناگزیر ہے) اور باہمی محبت کو ترقی ہو، غرض سوال کسی خاص طریقہ کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ محض نیت ارادے اور مزاج کا چنانچہ گاندھی جی کا زور بھی اسی نیک نیتی پر ہے اور اگر انھیں ایک طرف انسانی فطرت کے بدلنے میں ناکامیابی ہوئی تو دوسری طرف ایک ایسی بڑی تحریک میں، جس میں لاکھوں آدمی شریک تھے یہ نیک نیتی پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی سخت اخلاقی ضبط وانضباط پر انھوں نے جو زور دیا وہ بھی بہت ضروری تھا اگرچہ ان کے انفرادی ضبط کے معیار کو شائد ہر شخص تسلیم نہ کرے۔ وہ انفرادی گناہوں اور کمزوریوں کو بہت زیادہ اور معاشرتی گناہوں کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس ضبط کی ضرورت بالکل واضح ہے کیونکہ مصیبت اور تکلیف کی زندگی کو چھوڑ کر ارباب اقتدار میں شامل ہونے کے لالچ نے بہت سے کانگریسیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ ہر مشہور کانگریسی کے لئے اس دنیاوی جنت

کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

ساری دنیا آج مختلف قسم کی کش مکش میں نظر آتی ہے لیکن ان میں سب سے سخت روحانی کش مکش ہے۔ مشرق میں یہ کش مکش خاص طور پر نمایاں ہے کیونکہ ایشیا کے ملکوں میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں ان کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی اس لئے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا یہاں اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ سیاسی مسئلہ جو اس وقت سب پر حاوی نظر آتا ہے نسبتاً سب سے کم اہمیت رکھتا ہے گو ہمارے لئے یہ مسئلہ سب سے مقدم ہے اور دوسرے اہم تر مسائل کو حل کرنے سے پہلے اس کا قابل اطمینان تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ گذشتہ کئی قرنوں سے ہم ایک غیر تغیر پذیر سماجی نظام کے عادی ہیں، ہم میں سے بہت سے لوگوں کا ابھی تک یہ عقیدہ ہے کہ صرف یہی نظام صحیح اور قابل عمل ہے، لیکن ماضی اور حال میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں اس طرح کی جاتی ہیں وہ لازمی طور پر ناکام رہتی ہیں۔ امریکہ کے ماہر معاشیات ویبلن نے لکھا ہے کہ "معاشی اخلاق اصل میں معاشی ضروریات کا تابع ہے" موجودہ زمانے کی ضروریات ہمیں مجبور کریں گی کہ ہم ان کے مطابق ایک نیا نظام اخلاق مرتب کریں۔ اگر ہمیں اس روحانی کش مکش سے نجات پانا ہے اور اس بات کو دریافت کرنا ہے کہ صحیح روحانی معیار کے مطابق آج کل کون سی قدریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں تو ہمیں ان مسائل پر جرأت اور دلیری کے ساتھ غور کرنا پڑے گا، مذہبی عقیدوں کی آڑ میں پناہ لینے سے کام نہیں چلے گا۔ مذہب کی تعلیم اچھی ہو یا بری لیکن اس کا طریقہ تعلیم اور اس کا یہ مطالبہ کہ ہم اس کے اصولوں کو آنکھ بند کرکے مان لیں ہمیں کسی مسئلے پر عقلی نقطہ نظر سے غور ہی نہیں کرنے دیتا۔ بہ قول فرائڈ کے مذہب کے ادعائی عقائد کو مان لینا چاہئے کیونکہ اول تو ہمارے آبا و اجداد انھیں ابتدا سے مانتے

آتے ہیں، دوسرے ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جو اسی قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں، تیسرے ہمیں ان کے بارے میں چون و چرا کرنے کی ممانعت کردی گئی ہے"(1)

اگر ہم عدم تشدد اور اس کے تمام لوازمات کو مذہب کے اذعانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس میں دلیل اور بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کی حیثیت ایک تنگ نظر فرقے کے معتقدات کی سی ہو جاتی ہے جن کا یا تو بے دلیل اقرار کیجئے ورنہ انکار کر دیجئے۔ نہ اس میں کوئی زندگی باقی رہتی ہے اور نہ اسے موجودہ مسائل سے تعلق رہتا ہے۔ لیکن اگر ہم موجودہ حالات کی روشنی میں اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں دنیا کی از سر نو تشکیل کرنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ اس صورت میں ہمیں ایک انسانی جماعت کی فطرت اور کمزوریوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کوئی تحریک جو عوام میں پھیلائی جائے خصوصاً ایسی تحریک جس کا مقصد بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کرنا ہو۔ صرف لیڈروں کی ذہنیت سے متاثر نہیں ہوتی، بلکہ اس پر عام حالات کا اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کے خیالات کا اثر پڑتا ہے جن سے وہ کام لیتی ہے۔

تشدد کا دنیا کی تاریخ میں بہت اہم حصہ رہا ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی شاید ایک عرصے تک کم نہیں ہوگی۔ ماضی کی اکثر تبدیلیاں تشدد اور جبر کے ذریعے ہوئی ہیں۔ ڈبلو۔ ای۔ گلیڈاسٹون نے ایک دفعہ کہا تھا "مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس ملک کے لوگوں کی سیاسی بے چینی کے زمانے میں صرف یہی وعظ سنایا جاتا کہ تشدد سے نفرت کرو، نظم و امن سے محبت کرو اور صبر سے کام لو تو ملک کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوئی ہوتی"

---

(1) The future of an illusion

جبر و قوت کو جو اہمیت حاصل رہی ہے اور اب بھی حاصل ہے اس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس سے انکار کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم زندگی کی حقیقتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تاہم تشدد بُری چیز ہے اور اس سے بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور تشدد سے بھی بدتر نفرت، ظلم، انتقام اور سزا کے وہ جذبے ہیں جو اکثر اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو تشدد بجائے خود اتنی بُری چیز نہیں ہے جتنے اُس کے یہ لوازم۔ تشدد ان جذبوں سے پاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا استعمال اچھے مقصد کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے اور برے مقصد کے لئے بھی۔ لیکن اُسے ان جذبوں سے پاک رکھنا سخت دشوار ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سے پرہیز کیا جائے مگر تشدد سے پرہیز کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اس سے بدتر چیزوں کو برداشت کرلے۔ دوسروں کے تشدد کے آگے سر جھکانا یا کسی غیر منصفانہ نظام حکومت کو قبول کرنا جس کی بنیاد تشدد پر قائم ہے۔ عدم تشدد کے اصول کے قطعاً منافی ہے۔ عدم تشدد کا طریقہ اسی وقت جائز قرار دیا جا سکتا ہے جب اس میں حرکت ہو اور غیر منصفانہ حکومت یا نظام جماعت کو بدلنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ عدم تشدد میں اس کی قابلیت ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ ہمیں ترقی کے مرحلے طے کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے مگر اس میں مجھے شبہ ہے کہ یہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ بہر حال جبر کی کوئی نہ کوئی شکل ناگزیر ہے کیونکہ جو لوگ اقتدار اور حقوق کے مالک ہوتے ہیں وہ انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ اس پر مجبور نہ کئے جائیں یا جب تک ایسے حالات نہ پیدا کر دئے جائیں کہ ان کے لئے ان حقوق کا نہ چھوڑنا چھوڑنے سے زیادہ مضر ہو۔ سماج کی موجودہ کش مکش یعنی قومی جنگ اور طبقوں کی جنگ کا تصفیہ بجز جبر کے اور کسی صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام

بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہوجائے اُس وقت تک معاشرتی تبدیلی کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہوسکے گی لیکن اس کے بعد چند اشخاص پر جبر کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس بنیادی اختلاف پر پردہ ڈال دیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ اس قسم کے اختلافات کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے ہم نہ صرف حق کو چھپانے کے مجرم ہوں گے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اصلی واقعات سے ناواقف رہیں گے موجودہ نظام کو ایک سہارا ملجائے گا اور حکمراں طبقوں کو اپنے امتیازی حقوق کے لئے ایک اخلاقی بنیاد ہاتھ آجائے گی جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام سے جنگ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان غلط مفروضات کی تردید کیجائے جن پر اُس کا دارومدار ہے اور حقیقت بے نقاب کردی جائے۔ تحریک عدم تعاون کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان جھوٹے مفروضات کی قلعی کھول دیتی ہے اور ہماری اس کوشش کو تقویت پہنچاتی ہے کہ ہم انھیں تسلیم کرنے اور ان سے اشتراک عمل کرنے سے انکار کردیں۔

ہمارے پیش نظر ایک ایسی سماج ہے جس میں مختلف طبقوں کا فرق مٹ جائے معاشی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں انصاف برتا جائے اور سب کو یکساں موقع دیا جائے۔ ایک منظم سماج جس کا مقصد یہ ہو کہ بنی نوع انسان بلند تر مادی اور تمدنی سطح پر پہنچ سکے اور اس میں روحانی صفات یعنی اشتراک عمل، بے غرضی، خدمت خلق، حق پسندی، ہمدردی اور محبت نشوونما پاسکیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ایک دن اس طرح کا ایک عالمگیر نظام قائم ہوجائے۔ اس راہ میں جو چیز حائل ہو اسے ہٹانا پڑے گا۔ اگر ممکن ہو تو نرمی سے ورنہ مجبوراً سختی سے یقینی بات ہے کہ جبر کی ضرورت اکثر پیش آئے گی۔ لیکن اگر قوت کا استعمال کیا جائے تو وہ نفرت اور

ظلم کے جذبے کے ساتھ نہ ہونا چاہئے بلکہ ٹھنڈے دل سے محض رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے۔ ظاہر ہے اس میں سخت دشواری پیش آئے گی۔ منزل بڑی کٹھن ہے اور قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے مگر ان مشکلات کا علاج یہ نہیں کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کی حقیقت کو سمجھیں اور بہادری سے ان کا مقابلہ کریں۔ بظاہر یہ باتیں خیالی اور دور از کار معلوم ہوتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت میں یہ اعلیٰ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن ہمیں انھیں پیش نظر رکھنا چاہئے اور ان پر زور دیتے رہنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان نفرتوں اور تلخیوں میں کمی واقع ہو جائے جن سے ہمارے دل بھرے ہوئے ہیں۔

ہمارا طریقہ وہی ہونا چاہئے جو ہمیں اس منزل تک پہنچا سکے اور ان جذبات پر مبنی ہو لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کی فطرت اجتماعی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے عام لوگ ہمیشہ ہماری تعلیم و تلقین پر دھیان نہیں دیں گے اور اعلیٰ اخلاقی اصول پر عمل نہیں کریں گے۔ اس لئے لوگوں کے خیالات پر اثر ڈالنے کے علاوہ ہمیں اکثر جبر سے بھی کام لینا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اس جبر کو محدود رکھیں اور اس سے اس طرح کام لیں کہ اس کی خرابیاں کم ہو جائیں۔

23/12/44 (٦٤)

پھر دہرہ جیل میں

علی پور جیل میں میری صحت اچھی نہیں تھی۔ میرا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور کلکتے کی ہوا اور گرمی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ دن سے یہ افواہیں سننے میں آتی تھیں کہ میری بدلی کسی بہتر آب و ہوا کے مقام پر ہو جائے گی۔ ۷ مئی کو مجھے حکم دیا گیا کہ اپنا بوریا بندھنا سنبھال کر یہاں سے چل دو۔ معلوم ہوا کہ دہرہ دون جیل بھیجا جا رہا ہوں۔ تین مہینے کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد شام کے ٹھنڈے وقت گاڑی میں کلکتے کی گلیوں سے گزرنا بہت بھلا معلوم ہوا اور ہوڑے کے اسٹیشن پر لوگوں کا مجمع دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

میں اپنی بدلی سے خوش تھا اور مجھے دہرہ دون پہنچنے کا اشتیاق تھا جہاں سے پہاڑ اس قدر قریب ہیں۔ وہاں آکر معلوم ہوا کہ جو حالت اب سے نو مہینے پہلے میرے چھٹتے جاتے وقت تھی وہ اب نہیں ہے۔ اب میں ایک نئی جگہ رکھا گیا۔ یہ ایک مویشیوں کے باندھنے کا سائبان تھا جس کی صفائی اور درستی کر لی گئی تھی۔

جیل کی کوٹھری کی حیثیت سے یہ اچھی خاصی جگہ تھی اس سے ملا ہوا کوئی پچاس فٹ لمبا صحن بھی تھا۔ یہ اس کوٹھری سے جو مجھے دہرہ دون میں پہلی بار ملی تھی بہتر تھی مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ چار دیواری جو پہلے دس فٹ اونچی تھی خاص طور پر میرے لئے چار پانچ فٹ اور اونچی کر دی گئی تھی پہاڑوں کا منظر جس کا مجھے اس قدر اشتیاق تھا بالکل چھپ گیا تھا صرف چند درختوں کی

چوٹیاں نظر آتی تھیں میں تین مہینے سے زیادہ اس جیل میں رہا اور مجھے پہاڑوں کی ایک جھلک تک دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ پہلی بار مجھے جیل کے دروازے کے سامنے ٹہلنے کی اجازت تھی مگر اب وہ بھی نہیں رہی۔ کوٹھری کے ساتھ کا چھوٹا سا صحن میری ورزش کے لئے کافی سمجھا گیا۔

یہ اور اسی قسم کی اور بندشیں بہت مایوس کن تھیں اور میں ان سے دق آگیا۔ طبیعت میں ایک منحنّا پن سا پیدا ہوگیا۔ اور جو تھوڑی بہت میرے لئے ورزش جائز رکھی گئی تھی اس کے کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کبھی تنہائی کا اور دنیا سے بےخبر ہونے کا اس قدر احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس مرتبہ ہو رہا تھا۔ اس قید تنہائی کا اثر میرے اعصاب پر پڑنے لگا اور میرے جسم اور دماغ کی قوت گھٹنے لگی۔ میں خوب جانتا تھا کہ دیوار کے پار صرف چند فٹ کے فاصلے پر تازگی اور فرحت کا سماں چھایا ہوا ہوگا۔ ہری ہری گھاس اور نرم نرم مٹی کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو آرہی ہوگی دور دور تک کا منظر نظر آرہا ہوگا۔ مگر یہ سب چیزیں میری پہنچ سے باہر تھیں اور میری آنکھیں ان دیواروں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ جیل کی معمولی زندگی کی چہل پہل بھی نہیں تھی اس لئے کہ میں اور قیدیوں سے الگ رکھا گیا تھا۔

چھ ہفتے کے بعد برسات شروع ہوگئی۔ اب ہوا کچھ اور ہی ہوگئی اور اس میں نئی زندگی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ حرارت کے کم ہونے سے جسم کو تو آرام ملا مگر آنکھوں کو اور دل کو چین نہ آیا۔ کبھی کبھی میرے احاطے کا پھاٹک کسی پہرے والے کے آنے جانے کے لئے کھلتا اور مجھے دم بھر کو باہر کی دنیا کی ایک جھلک نظر آجاتی ہرے بھرے کھیتوں اور درختوں کے شوخ رنگ اور ان پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے شبنم کے قطرے۔ مگر یہ صرف چند لمحے کا نظارہ ہوتا جو بجلی کی طرح کوند کر چھپ جاتا۔ پورا دروازہ شاید ہی کبھی کھلتا ہو۔ غالباً پہرے والوں کو

حکم تھا کہ اگر میں کہیں آس پاس موجود ہوں تو دروازہ ہرگز نہ کھلنے پائے اور جب کھلے بھی تو بس تھوڑا ہی سا۔ سبزی اور شادابی کی یہ جھلک دیکھ کر مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی بلکہ دبیس کا ٹھہرکا درد بن کر دل میں اٹھتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات دروازہ کھلتا تو اُدھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

اصل میں یہ ساری اُداسی جیل کی وجہ سے نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا بھی اس میں کچھ حصہ تھا۔ یہ باہر کے واقعات۔ کملا کی بیماری اور میری سیاسی پریشانیوں کا ردِ عمل تھا۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کملا کو پھر پُرانی بیماری نے آلیا ہے اور میں اپنی بے بسی پر کُڑھتا تھا کہ اُس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اُس کے پاس ہوتا تو اُسے بہت تقویت پہنچتی۔

بہ خلاف علی پور کے، دہرہ دون جیل میں مجھے ایک روزنامہ اخبار پڑھنے کو ملتا تھا۔ باہر کے سیاسی واقعات اور دوسرے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ تقریباً تین سال کے بعد (اس مدت کے بہت بڑے حصے میں وہ خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) پٹنہ میں ہوا تو اس کی کارروائی بہت مایوس کرنے والی تھی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد اس پہلے جلسے میں صورت حال کا جائزہ لینے اور واقعات پر مفصل بحث کرنے پُرانی لیکھ سے ہٹنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ گاندھی جی دور سے دیکھنے میں اپنی قدیم تحکمانہ شان میں نظر آرہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ "اگر تم میرے پیچھے چلنا چاہتے ہو تو تمھیں میری شرطیں ماننی پڑیں گی"۔ یہ مطالبہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا اس لئے کہ اگر انھیں ساتھ لینا تھا تو ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے دلی عقیدوں کے خلاف عمل کریں، مگر معلوم ہوتا تھا کہ حکم منوانے پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور آپس کے مشورے سے ایک پالیسی تجویز کرنے پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے یہ عجیب

بات ہو کہ گاندھی جی دلوں پر اپنی مرضی کا سکہ بٹھا دیتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ لوگ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں بہت کم شخصوں کو جمہور کی عقیدت اور اطاعت اس حد تک نصیب ہوئی جتنی انھیں حاصل ہے۔ اور لوگوں کو اس وجہ سے قصوروار ٹھہرانا کہ وہ ان کے اونچے معیار تک نہیں پہنچ سکتے، بے انصافی ہے۔ پٹنے کے جلسے میں گاندھی جی آخر تک ٹھہرے بھی نہیں اس لئے کہ انھیں اپنا ہریجنوں کی اصلاح کا دورہ جاری رکھنا تھا۔ انھوں نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو رائے دی کہ مستعدی سے کام کرے اور ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیوشن بھیجے ہیں انھیں جلدی سے نبٹا دے یہ کہہ کر وہ چل دیئے۔

مگر غالباً زیادہ طول طویل بحث سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ کمیٹی کے ممبروں کے خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ معاملات کو وضاحت سے نہیں سوچ سکتے تھے اعتراض کرنے کو تو بہت سے لوگ تیار تھے مگر تعمیری تجویز ایک بھی پیش نہیں ہوئی۔ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ قدرتی بات تھی اس لئے کہ تحریک نافرمانی کا سارا بوجھ انھیں لوگوں پر، جو مختلف صوبوں کے لیڈر تھے پڑا تھا اور ان کے جسم اور دماغ تھکے ہوئے تھے۔ اس بات کا ایک دھندلا سا احساس سب کو تھا کہ سول نافرمانی کو روک دینا چاہئے۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کے بعد کیا کیا جائے؟ لوگوں کے دو فریق ہو گئے تھے، ایک تو یہ چاہتا تھا کہ کونسلوں کے ذریعے سے خالص آئینی جدوجہد کی جائے اور دوسرا کچھ دھندلے سے اشتراکی خیالات رکھتا تھا۔ ممبروں کی بہت بڑی تعداد دونوں فریقوں میں سے کسی میں شریک نہیں تھی۔ وہ آئینی طریقوں کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ اشتراکیت سے بھی ڈرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ اُن میں پھوٹ پیدا کرے گی۔ یہ لوگ کوئی تعمیری خیالات نہیں رکھتے تھے اور انھیں جو کچھ امید تھی اور جو کچھ سہارا تھا وہ

گاندھی جی کی ذات سے تھا۔ پہلے کی طرح وہ ان کی طرف مڑ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے حالانکہ وہ ان کی رائے سے پوری طرح متفق نہیں تھے۔ گاندھی جی کی مدد سے اعتدال پسند اور آئین پسند حضرات کو کمیٹی میں اور کانگریس میں غلبہ حاصل ہو گیا۔

ان سب باتوں کی پہلے ہی سے توقع تھی لیکن ان کے ردعمل سے کانگریس اس قدر پیچھے ہٹ گئی جس کا مجھے خیال بھی نہیں تھا پچھلے پندرہ سال میں یعنی ترک موالات کی تحریک کے بعد سے کانگریس کے لیڈروں نے اس قدر آئین پسندی کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ پرانی سوراج پارٹی بھی، جو خود ردعمل کا نتیجہ تھی، ان نئے لیڈروں سے بہت آگے تھی اور پھر ان میں ایسی زبردست شخصیتیں بھی نہیں تھیں جیسی سوراج پارٹی میں تھیں۔ بہت سے لوگ جو کانگریس کی تحریک سے جب تک اس میں شریک ہونا خطرناک تھا، دور ہی دور رہتے تھے اب آموجود ہوئے اور انھیں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔

گورنمنٹ نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دینے کا حکم منسوخ کر دیا اور وہ ایک جائز انجمن بن گئی۔ مگر اس کی بہت سی ملحقہ اور ماتحت جماعتیں مثلاً سیوا دل، کسان سبھائیں اور تعلیمی ادارے اور نوجوان سبھائیں جن میں بچوں کی ایک انجمن بھی شامل تھی، بدستور خلاف قانون تھیں خصوصاً خدائی خدمت گار، جو سرحد کے سرخ پوش کہلاتے تھے، اب تک قانون کے باغی سمجھے جاتے تھے۔ یہ انجمن ۱۹۳۱ء میں باقاعدہ کانگریس میں شامل کی جا چکی تھی اور صوبہ سرحد کی کانگریس کی شاخ قرار دی گئی تھی۔ یعنی باوجود اس کے کہ کانگریس نے عملی احتجاج بالکل ترک کر دیا اور آئینی طریقوں کی طرف لوٹ آئی، حکومت نے وہ تمام خاص قانون جو سول نافرمانی کو روکنے کے لئے بنے تھے اسی طرح قائم رکھے بلکہ کانگریس کی اہم ماتحت جماعتوں کو خلاف قانون رہنے دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی انجمنوں کو دبانے کا خاص اہتمام کیا گیا اور دیہ

یہ تھی کہ بڑے بڑے حکام نے زمینداروں کے پاس جا کر تاکید کی کہ تم اپنی تنظیم کرو۔
داروں کی انجمنوں کے لئے تمام سہولتیں بہم پہنچائی گئیں چنانچہ صوبہ متحدہ کی دو بڑی
ن کا چندہ سرکاری طور پر مال گذاری کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔

یوں تو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ دارانہ انجمنوں کو ہمیشہ سے ناپسند
ہوں مگر ایک واقعے کی وجہ سے خاص طور پر مجھے ہندو مہاسبھا سے سخت رنج
۔ اس کے ایک سکرٹری نے یہ غضب کیا کہ بغیر کسی تعلق کے اس حکم کی تائید کر ڈالی
سرحد کی سرخ پوش جماعت کو خلاف قانون قرار دینے کے لئے جاری کیا گیا تھا اور
ست کو اس فعل پر شاباشی دی۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ لوگوں سے ان سے معمولی
حقوق چھیننے کی حمایت کی جا رہی ہے اور وہ بھی اس وقت جب کوئی جارحانہ تحریک
جود نہیں ہے۔ اصول کے سوال کو چھوڑ کر دیکھا جائے تب بھی ہر شخص جانتا تھا کہ ان سرحد
وں نے تین سال کی کش مکش میں کمال کر دکھایا اور ان کا لیڈر خان عبدالغفار خاں
ں کا سا بہادر اور کھرا آدمی ہندوستان میں مشکل سے نکلے گا، اب تک جیل میں ہے
ں وہ بغیر عدالتی تحقیقات کے شاہی قیدی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا میرے نزدیک
نہ وارانہ تعصب کی اس سے بدتر مثال نہیں ہو سکتی اور مجھے توقع تھی کہ ہندو مہاسبھا
ے بڑے بڑے لیڈر فوراً اپنے رفیق کار کی اس رائے سے بے تعلق ہونے کا اعلان
یں گے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ان میں سے کسی نے اس معاملے کے متعلق ایک
نظ بھی نہیں کہا۔

ہندو مہاسبھا کے سکرٹری کے اس بیان سے مجھے سخت پریشانی تھی۔ یہ
بائے خود بہت بری چیز تھی مگر میرے لئے اس وجہ سے اور زیادہ تکلیف دہ تھی کہ
یں اسے ملک کی موجودہ حالت کا ایک نمونہ سمجھتا تھا۔ اس دن سہ پہر کو گرمی سے
نڈھال ہو کر سو گیا تو ایک عجیب خواب نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ خان عبدالغفار خاں

پر لوگ ہر طرف سے حملہ کر رہے ہیں اور میں ان کو بچانے کے لئے لڑ رہا ہوں۔ آنکھ کھلی تو طبیعت بہت پست اور اداس تھی اور سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس پر مجھے تعجب ہوا اس لئے کہ جاگتے میں کبھی میرے جذبات کا جوش اس طرح ظاہر نہیں ہوا کرتا۔

بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے اعصاب بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ سوتے میں بے چینی رہتی تھی، جو میرے لئے غیر معمولی چیز تھی، اور طرح طرح کے بھیانک خواب نظر آتے تھے۔ بعض وقت میں نیند میں چیخ اٹھتا تھا۔ ایک بار شاید بہت زور کی چیخ نکل گئی۔ اس لئے کہ جب میں چونکا تو دیکھا کہ دو پہرے والے میرے شور و غل سے پریشان میرے پاس کھڑے ہیں۔ میں نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔

اسی زمانے میں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ریزولیوشن سے بھی مجھے تکلیف ہوئی۔ اس ریزولیوشن کے پاس کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ "ذاتی املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ کی ضرورت کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور کی جا رہی ہیں" اور اس میں کانگرس والوں کو یہ یاد دلایا گیا تھا کہ کراچی کے ریزولیوشن "میں نہ تو بغیر معقول وجہ اور مناسب معاوضے کے ذاتی املاک کی ضبطی کی تجویز ہے اور نہ طبقوں کی جنگ کی حمایت۔ ورکنگ کمیٹی کی رائے میں املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ، کانگرس کے عقیدہ عدم تشدد کے منافی ہے" اس ریزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ترتیب دینے والے طبقوں کی جنگ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی زد صریحی طور پر کانگرس سوشلسٹ پارٹی پر تھی، جو نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ سچ پوچھئے تو اس جماعت کے کسی ذمہ دار رکن نے ضبطی کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ بہت لوگوں نے کہا تھا کہ طبقوں کی جنگ اس وقت بھی موجود ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن میں یہ اشارہ پایا جاتا تھا کہ کوئی شخص

جو طبقوں کی نزاع کا قائل ہو، کانگریس کا معمولی ممبر بھی نہیں ہو سکتا۔ کانگریس پر کبھی یہ الزام نہیں لگایا گیا تھا کہ اس نے اشتراکیت اختیار کرلی ہے یا وہ ذاتی املاک کے خلاف ہے۔ البتہ اس کے بعض ممبر یہ خیالات رکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو اس ہمہ گیر قومی انجمن کے معمولی ممبروں کی صف میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔

یہ بات کئی بار کہی جا چکی تھی کہ کانگریس راجا سے لے کر پرجا تک قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی نمائندگی کرتی ہے۔ قومی تحریکیں اکثر یہ دعوے کرتی ہیں جس کے معنی غالباً یہ ہوتے ہیں کہ وہ بڑی اکثریت کی نمائندہ ہیں اور ان کی پالسی سب کے فائدے کے لئے ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ دعوے صحیح نہیں اس لئے کہ کوئی سیاسی انجمن متضاد اغراض رکھنے والے طبقوں کی نمائندہ نہیں ہو سکتی اور اگر ہونا چاہے گی تو وہ ایک بے شکل، بے رنگ اور بے معنی جماعت بن کر رہ جائے گی۔ کانگریس یا تو ایک سیاسی پارٹی ہے جو سیاسی قوت حاصل کرنے اور اُسے قوم کے فائدے کے لئے استعمال کرنے کا ایک واضح (یا دھندلا) مقصد اور اصول رکھتی ہے یا محض ایک رفاہ عام کی انجمن ہے جو اپنے کوئی خاص خیالات نہیں رکھتی بلکہ ہر شخص کا بھلا چاہتی ہے۔ اگر وہ سیاسی پارٹی ہے تو وہ صرف انھیں لوگوں کی نمائندہ کہلائے گی جو مجموعی طور پر اس کے مقصد اور اصول سے اتفاق رکھتے ہیں جو اس مقصد کے مخالف ہیں۔ وہ اس کے نزدیک قوم کے جملہ سماج کے مخالف اور رجعت پسند قرار پائیں گے اور ان کے اثر کو روکنا یا توڑنا اس کے اصول کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھا جائے گا۔

کانگریس کی تحریک شہنشاہی کے خلاف اٹھی ہے اور اُسے سماج کی باہمی نزاع سے تعلق نہیں ہے اس لئے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کے اتفاق رائے کی گنجائش ہے۔ اسی لئے اسے ہندوستانیوں کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندگی کم و بیش حد تک حاصل ہو گئی ہے اور اس میں مختلف خیالات کی جماعتیں

شریک ہوگئیں جو صرف ایک چیز میں یعنی شہنشاہی کی مخالفت میں متحد تھیں اور ان کی اس مخالفت میں بھی درجوں کا فرق تھا وہ لوگ جو شہنشاہی کی مخالفت کے بنیادی مسئلے میں کانگرس کے ہم رائے نہیں تھے اس سے الگ ہوگئے اور کم وبیش برطانوی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔ غرض کانگرس کئی جماعتوں کی متحدہ انجمن بن گئی جن میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا مگر سب کی سب ایک مشترک مقصد اور گاندھی جی کی بااقتدار شخصیت کے رشتے میں مربوط تھیں۔

بعد میں ورکنگ کمیٹی نے طبقوں کی جنگ کے متعلق اپنے رزولیوشن کی تاویل کی کوشش کی۔ اس رزولیوشن کے الفاظ کی یا اس اصول کی جو اس میں بیان کیا گیا تھا اس قدر اہمیت نہیں تھی جتنی اس بات کی کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگرس کی پالیسی کس رُخ جارہی ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات تھی کہ یہ رزولیوشن کانگرس کی نئی کونسل پارٹی کے اثر سے پاس ہوا ہے جو اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں سرمایہ داروں کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان کے کہنے سے کانگرس رفتہ رفتہ رجعت پسندی کی طرف سرکتی جاتی تھی۔ اور ملک کے اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں کو رجھانے کی فکر کررہی تھی۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے کانگرس کے دشمن تھے اور نافرمانی کے زمانے میں حکومت کا ساتھ دے چکے تھے ان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں ہورہی تھیں۔ شور مچانے والے اور نکتہ چینی کرنے والے انتہاپسندوں کی پارٹی اس تالیف قلوب میں سدراہ سمجھی جاتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن اور کئی حضرات کے شخصی بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ کانگرس کے ارباب اختیار انتہاپسندوں کے اعتراضات کی وجہ سے اپنی راہ سے ہٹنے والے نہیں اور اگر یہ شرارت سے باز نہ آئے تو سزا پائیں گے اور کانگرس سے نکال دیے جائیں گے۔

کانگرس کے لیڈروں میں گاندھی جی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور

ب تھے جنھوں نے قومی آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے کارنامے دکھائے تھے اور اپنی
نت داری اور بہادری کی وجہ سے سارے ملک میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے
ہے۔ مگر نئی پالسی کی وجہ سے کانگرس کی دوسری بلکہ پہلی صف میں بعض ایسے لوگ
پنچ گئے جو کسی طرح اصول پرست نہیں کہے جا سکتے تھے۔ یوں تو کانگرس کے حلقوں
ں اب بھی اصول پرستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی مگر اب مطلب پرستوں
ے لئے اس میں داخل ہونا اتنا سہل ہوگیا جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ گاندھی جی کی
ہر اشخصیت کے علاوہ جو سب پر چھائی ہوئی تھی، کانگرس کے دو رُخ نظر آتے تھے
ب تو خالص سیاسی رُخ جس نے ایک خفیہ شورے کی شکل اختیار کرلی تھی (یعنی چند
دمی مل کر ہر معاملے کا فیصلہ کرلیتے تھے اور اُسے کانگرس سے منوا لیتے تھے) اور
وسرا مذہبی رُخ جس میں ایک پرارتھنا منڈلی کی شان تھی اور زہد و تقوے اور رقت
لب کا جوش تھا۔

حکومت کے یہاں فتح کے شادیانے بج رہے تھے کیونکہ اس کے خیال میں
فرمانی کی تحریک اور اس کی شاخوں کو کچلنے کی پالسی پوری طرح کامیاب ہوگئی تھی۔
پریشن بخیر و خوبی ہوگیا تھا۔ مریض مرتا ہے یا جیتا ہے اس سے فی الحال بحث نہیں
ھی اگرچہ کانگرس اس وقت کسی حد تک ہموار ہوگئی تھی مگر حکومت نے تھوڑی بہت
تبدیلی کے ساتھ اپنی وہی پالسی جاری رکھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جب تک اصل مسئلے طے
ہو قومی پالسی میں اس طرح کے تغیرات محض عارضی ہیں اور اگر ذرا ڈھیل دی گئی تو
یہ آگ پھر بھڑک اٹھے گی۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کانگرس کے کسانوں اور
مزدوروں کی جماعت کے انتہا پسندوں پر سختی کرنے سے ان کانگرسی لیڈروں کو کچھ زیادہ
شکایت نہیں ہوگی جو احتیاط کی راہ پر چل رہے ہیں۔

میرے خیالات دہرہ دون جیل میں کچھ اسی قسم کے تھے۔ سچی بات یہ ہے

کہیں دور ہونے کی وجہ سے واقعات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ علی پور میں تو مجھے کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ دہرہ دون میں حکومت کا تجویز کیا ہوا اخبار دیکھنے کو ملتا تھا جس میں خبریں ایک خاص رنگ میں پیش کی جاتی تھیں اور کبھی کبھی بالکل یکطرفہ ہوتی تھیں۔ اگر مجھے اپنے ان ساتھیوں سے جو جیل کے باہر تھے ملنے کا اور واقعات کو غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا تو شاید میری رائے تھوڑی بہت بدل جاتی۔

حال کے تصور سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اس لئے میں ماضی کا تصور کرنے لگا اور یہ سوچنے لگا کہ جب سے میں نے قومی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا ہندوستان میں سیاسی واقعات کی کیا رفتار رہی ہے اور ہم نے جو کچھ اب تک کیا اس میں کونسی بات بجا تھی اور کونسی بے جا تھی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں اسے لکھ ڈالوں تو میرے خیالات زیادہ باترتیب اور مفید ہوں گے۔ اور ایک معین کام میں لگ جانے سے مجھے اس پریشانی اور اداسی سے بھی نجات مل جائے گی۔ چنانچہ جون ۱۹۳۴ء میں میں نے دہرہ دون جیل کے اندر یہ **آپ بیتی** لکھنی شروع کی اور پچھلے آٹھ مہینے برابر یہ کرتا رہا کہ جب کبھی لہر آ گئی بیٹھ کر اسے لکھ ڈالا۔ بیچ میں کئی ایسے وقفے آئے کہ لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ ان میں سے تین وقفے تین تین مہینے کے تھے مگر کسی نہ کسی طرح یہ کام چلتا ہی رہا یہاں تک کہ اب خاتمے پر آ پہنچا ہے۔ اس کا بڑا حصہ میں نے غیر معمولی پریشانی کے زمانے میں لکھا ہے جب میرے دل پر رنج اور اداسی چھائی ہوئی تھی شاید اس کی جھلک اس کتاب میں بھی آ گئی ہے مگر اس کے لکھنے ہی سے مجھے ان پریشانیوں سے نجات ملی۔ لکھتے وقت میں نے پڑھنے والوں کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ میرا خطاب اپنے دل سے تھا۔ میں آپ ہی سوال کرتا تھا اور آپ ہی جواب دیتا تھا جس پر مجھے بعض اوقات ہنسی بھی آ جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو جذبات سے الگ ہو کر

سے بے لاگ طریقے سے غور کروں - اور میں سمجھتا تھا کہ ماضی کے اس جائزے سے مجھے اس میں مدد ملے گی -

جولائی کے آخر میں کملا کی طبیعت بگڑنے لگی اور چند روز میں حالت نازک ہو گئی ۱۱ اگست کو یکایک مجھے دہرہ دون جیل سے رخصت ہونے کا حکم دیا گیا اور اسی روز رات کو میں پولیس کی حراست میں الہ آباد روانہ کر دیا گیا - دوسرے دن تک شام کو ہم الہ آباد کے پریاگ اسٹیشن پہنچے اور وہاں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی کہ تم اپنی بیوی کی عیادت کے لئے عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہو اس دن میری گرفتاری کو پورے چھ مہینے ہو گئے تھے -

(۶۵)

گیارہ دن

تلوار اپنے نیام کو گھس ڈالتی ہے
اور روح جسم کو ریت کر رکھ دیتی ہے

(بائرن)

میری رہائی عارضی تھی۔ مجھ سے یہ کہا گیا تھا کہ مجھے دو ایک روز کے لئے یا اتنی مدت کے لئے جتنی ڈاکٹر اشد ضروری سمجھیں آزادی دی جاتی ہے۔ اس بے اطمینانی کی حالت میں جم کر کوئی کام کرنا ناممکن تھا۔ اگر میعاد مقرر ہوتی تو مجھے ایک اندازہ ہو جاتا اور میں اس کے لحاظ سے اپنے اوقات کا تعین کرتا۔ اب تو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ نہ جانے کب دوبارہ جیل بھیج دیا جاؤں۔

یہ تبدیلی یکایک ہوئی اور میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ دم بھر میں قید تنہائی سے نکل کر بھرے گھر میں پہنچ گیا جہاں ڈاکٹروں، نرسوں اور عزیزوں کا مجمع تھا۔ میری لڑکی اندرا بھی شانتی نکیتن سے آگئی تھی۔ دوست احباب کملا کی عیادت کے لئے برابر چلے آ رہے تھے۔ رہنے سہنے کا ڈھنگ بالکل بدل گیا تھا۔ گھر کی آسائشیں میسر تھیں، اچھا کھانا مل رہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا مگر کملا کی علالت کی فکر سب پر غالب تھی۔

وہ نحیف و نزار بستر پر پڑی تھی اور معلوم ہوتا تھا یہ کملا نہیں کملا کی پرچھائیں ہے۔ اس میں مرض سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اور اس کی جدائی کا خیال میرے لئے سوہان روح بن گیا تھا۔ ہماری شادی کو ساڑھے اٹھارہ برس گذر چکے تھے۔ وہ دن اور اس کے بعد کا زمانہ

میری آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ شادی کے وقت میں چھبیس برس کا تھا اور وہ کوئی سترہ برس کی دبلی پتلی بھولی بھالی لڑکی۔ ہم دونوں کی عمر میں بہت فرق تھا مگر اس سے بھی زیادہ فرق ہمارے خیالات میں تھا اس لیے کہ میں اس سے زیادہ پختہ کار تھا۔ مگر اس عقل و شادی کے دکھاوے کے باوجود مجھ میں بہت لڑکپن تھا اور مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس نازک حساس لڑکی کے نفس کی کلی کھل کر پھول بن رہی ہے اور اس کی پرداخت بڑی نرمی اور احتیاط سے ہونی چاہیئے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی اس لیے آپس میں اچھی طرح نبھ رہی تھی مگر ہمارے خیالات کی بنیادیں الگ الگ تھیں اور ان میں میل نہ تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ان بن رہتی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو جایا کرتے تھے۔ مگر یہ بچپن کے قصے زیادہ طول نہیں کھینچتے تھے اور ہم رہ بھڑ کر پھر ایک ہو جاتے تھے۔ ہم دونوں تیز مزاج اور حساس طبیعت کے تھے اور بچوں کی طرح اپنی آن پر جان دیتے تھے پھر بھی ہماری محبت بڑھتی گئی اگرچہ خیالات کا اختلاف بہت آہستہ آہستہ کم ہوا۔ ہماری شادی کے ۲۱ مہینے بعد ہماری اکلوتی لڑکی اندرا پیدا ہوئی۔

جن دنوں ہماری شادی ہوئی قریب قریب اسی زمانے میں ہندوستان کی سیاست نیا رنگ بدل رہی تھی اور میرا انہماک اس میں بڑھتا جاتا تھا۔ یہ ہوم رول کا دور تھا اور تھوڑے ہی دن بعد پنجاب میں مارشل لا اور اسی کے ساتھ ترک موالات شروع ہو گیا اور میں روز بروز قومی کاموں کے چکر میں پڑتا گیا۔ مجھے ان چیزوں سے اتنا شغف ہو گیا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں اس کی طرف سے قریب قریب غافل ہو گیا اور اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ یہی زمانہ تھا جب اسے میری مدد کی بہت ضرورت تھی۔ اس سے مجھے جو محبت تھی وہ قائم رہی بلکہ اور بڑھ گئی اور مجھے بڑا اطمینان رہتا تھا کہ وہ میری تسلی کے لئے موجود ہے۔ مجھے تو اس سے تقویت پہنچتی تھی مگر اسے میری بے پروائی سے ضرور صدمہ پہنچا ہو گا۔ وہ اس طبیعت کی تھی کہ اگر میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس غفلت اور کم التفاتی سے ہوئی ہو گی۔

اس کے بعد اس پر رہ رہ کر بیماری کے حملے ہونے لگے اور میں برسوں جیل میں رہنے لگا۔
اس عرصے میں ہم دونوں کا ملنا بس کبھی کبھی جیل کے دروازے پر ہو جایا کرتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں وہ ہماری فوج کی صف اول میں پہنچ گئی اور جب اسے قید کی سزا ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے۔ ہم ملاقات کی مختصر گھڑیوں کو جو مدتوں کے بعد نصیب ہوتی تھیں ایک بیش بہا دولت سمجھتے تھے اور فرقت کے دن گن گن کر کاٹتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت سے کبھی سیر نہیں ہوتے تھے کیونکہ ہماری مختصر ملاقاتوں میں ہمیشہ ایک جدت اور تازگی ہوتی تھی۔ ہم پر ایک دوسرے کی سیرت کے نئے نئے پہلوؤں کا انکشاف ہوتا تھا اگرچہ بعض اوقات ہمیں یہ نئے پہلو پسند نہیں آتے تھے۔ ہماری ان جوانی کی نااتفاقیوں میں بچپن کے جھگڑوں کا رنگ ہوتا تھا۔

اٹھارہ برس کی ازدواجی زندگی کے بعد بھی اس کی صورت پر وہی لڑکپن اور کنوارپن کی کیفیت تھی۔ وہ بوڑھاپن جو بیاہی عورتوں میں ہوتا ہے نام کو بھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک دلہن ہے جو ابھی بیاہ کر آئی ہے۔ مگر میں بہت بدل گیا تھا اور گو اپنی عمر کے اعتبار سے خاصا چاق چوبند تھا اور لوگ کہتے تھے کہ مجھ میں اب تک لڑکپن کی بعض خصوصیتیں موجود ہیں مگر میرا چہرہ میری عمر کا راز فاش کر دیتا تھا۔ میرے سر کے بال کچھ اڑ گئے تھے اور جو بچ رہے تھے وہ سفید ہو گئے تھے۔ میرے چہرے پر جھریاں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پچھلے چار برس کی مصیبتیں اور پریشانیاں اپنے نقش میرے چہرے پر چھوڑ گئی تھیں۔ ان دنوں اکثر ایسا ہوا کہ کملا اور میں کسی نئے مقام پر گئے تو لوگوں نے اسے میری لڑکی سمجھا اور مجھے بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ وہ اور اندرا بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔

ازدواجی زندگی کے اٹھارہ برس! کہنے کو تو یہ اٹھارہ برس تھے مگر ان میں سے نہ جانے کتنے میں نے جیل خانے میں اور کملا نے اسپتالوں اور صحت گاہوں میں گذارے تھے اور اب پھر میں جیل میں سزا کاٹ رہا تھا اور صرف چند روز کے لیے چھوٹ کر آیا تھا اور وہ بیماری کے پنجے

سبب تڑپ رہی تھی۔ میں کسی قدر خفا تھا کہ وہ اپنی صحت کی پروا نہیں کرتی۔ مگر میں اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا۔ اس کی من چلی طبیعت اس پر کڑھتی تھی کہ وہ بیماری سے بے بس ہے اور قومی جنگ میں پوری طرح شریک نہیں ہو سکتی۔ وہ عجیب دغدغہ میں رہتی تھی۔ نہ تو کام کی طرف پوری توجہ کر سکتی تھی اور نہ علاج کی طرف۔

میں اپنے دل میں کہتا تھا کیا سچ مچ وہ ایسے وقت میں جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے مجھ سے منہ موڑ کر چلی جائے گی؟ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننا اور سمجھنا شروع کیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اب ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کا بڑا سہارا ہے اور بہت سے کام ساتھ کرتے ہیں۔

یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں ہر روز ہر وقت اس کی حالت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرے رفیق اور دوست مجھ سے ملنے کو آتے تھے۔ وہ مجھے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے جن کی مجھے خبر نہیں تھی۔ وہ موجودہ سیاسی مسائل پر بحث کرتے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں کیا جواب دوں۔ میرے لیے اپنے خیال کو کملا کی بیماری سے ہٹانا آسان نہیں تھا اور جیل میں اتنے عرصے تک واقعات سے الگ اور دور رہنے کے بعد میں یکایک ایسے مسائل کو حل نہیں کر سکتا تھا جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مدت کے تجربے سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جیل میں جو محدود اطلاعات ملتی ہیں ان کی بنا پر صورت حال کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ صحیح رائے قائم کرنے کے لیے لوگوں سے مشورہ ضروری تھا۔ اگر بغیر اس کے کوئی رائے ظاہر کی جاتی تو وہ اصلیت سے دور ہوتی۔ یہ گاندھی جی اور پرانے کانگریسی رفیقوں کے ساتھ بے انصافی ہوتی اگر میں ان سے ملنے اور بحث کرنے سے پہلے کانگریس کی پالیسی کے متعلق کوئی قطعی بات کہہ دیتا۔ مجھے بہت سی کارروائیوں پر سخت اعتراض تھا مگر میرے ذہن میں کوئی عملی تجاویز نہیں تھیں۔ مجھے اس وقت جیل سے چھوٹنے کی مطلق توقع نہیں تھی اس لیے میں نے ان چیزوں پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا۔

پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ جب حکومت نے اتنی عنایت کی کہ مجھے اپنی بیوی کے پاس پہنچنے کی اجازت دے دی تو یہ بڑی نامناسب بات ہے کہ میں اس سے فائدہ اٹھا کر سیاسی کام کروں۔ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا پھر بھی یہ خیال مجھے روکتا تھا۔

میں عام بیانات شائع کرنے سے بھی احتراز کرتا رہا البتہ بعض غلط افواہوں کی تردید ضرور کی۔ نجی گفتگو میں بھی میں صاف صاف کسی پالیسی کی تائید نہیں کرتا تھا البتہ پچھلے واقعات پر دل کھول کر تنقید کیا کرتا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور میرے بہت سے گہرے رفیق اس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس معلومات کی بنا پر جو مجھے اس کے متعلق حاصل ہو سکی مجھے اس کی عام پالیسی سے اتفاق تھا مگر یہ ایک عجیب قسم کی بیچ میل جماعت تھی اور اگر میں بالکل آزاد ہوتا تب بھی اس میں شریک ہونے میں تامل سے کام لیتا۔ مقامی سیاسی معاملات میں مجھے کچھ وقت صرف کرنا پڑا اس لئے کہ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوکل کانگریس کمیٹی کے انتخابات میں سخت کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا صرف ذاتیات کا معاملہ تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ان جھگڑوں کو چکانے میں مدد دوں۔

میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور نہ مجھے اتنی فرصت تھی۔ اس کے باوجود مجھے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے سخت صدمہ ہوا۔ تعجب کی بات تھی کہ کانگریس کے مقامی انتخابات کے معاملے میں لوگوں میں اس قدر جوش کیونکر پیدا ہو گیا۔ ان میں سب سے پیش پیش وہ حضرات تھے جو لڑائی کے زمانے میں مختلف قسم کے ذاتی عذروں کی وجہ سے الگ ہو گئے تھے۔ سول نافرمانی کے ختم ہوتے ہی یہ عذر رفع ہو گئے اور یہ حضرات پردے سے باہر نکل کر آپس میں بازاری لوگوں کی طرح لڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ حریفوں کو نیچا دکھانے کے جوش نے انھیں اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ معمولی تہذیب کی حد سے بھی گزر گئے تھے۔ مجھے اس بات سے اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ کملا کے نام بلکہ اس کی بیماری سے بھی ان انتخابات میں

ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔

جن وسیع تر مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ان میں اسمبلی کے آیندہ انتخابات میں کانگرس کی شرکت کا مسئلہ بھی تھا۔ بہت سے نوجوان اس فیصلے کے مخالف تھے کیونکہ وہ اس کے معنی یہ سمجھتے تھے کہ کانگرس کونسل کے کام اور مصالحت کے چکر میں پڑ جائے گی۔ مگر وہ کوئی اور معقول تجویز پیش کرنے سے قاصر تھے۔ تعجب ہے کہ ان حضرات میں سے جو اعلیٰ اصولوں کی بنا پر کونسل کی شرکت کے مخالف تھے بعض کو انتخاب میں دوسری انجمنوں کے حصہ لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرور جماعتوں کے لئے میدان خالی چھوڑ دیا جائے۔

مجھے ان نامعقول جھگڑوں سے اور اس ناپاک سیاست سے جو الہ آباد میں پیدا ہو رہی تھی کراہت آتی تھی۔ میں ان سے اور اپنے شہر سے بیزار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب وہ وقت آئے گا کہ میں ان معاملات کی طرف توجہ کروں تو میں اس فضا میں کیا کر سکوں گا۔

میں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا جس میں کملا کی حالت کا ذکر تھا۔ چونکہ میں سمجھتا تھا کہ بہت جلد جیل بھیج دیا جاؤں گا اور مجھے پھر خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا اس لئے میں نے انھیں ان خیالات اور جذبات سے بھی آگاہ کر دیا جو اس وقت میرے دل میں تھے۔ حال کے واقعات سے مجھے سخت مایوسی اور صدمہ ہوا تھا اور میرے خط میں کچھ تھوڑی سی جھلک اس کی بھی تھی۔ میں نے خود کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ صرف گذرے ہوئے واقعات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی۔ یہ خط جذبات کے جوش سے بھرا ہوا تھا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گاندھی جی کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔

دن گذرتے جاتے تھے اور میں منتظر تھا کہ جیل خانے سے طلبی یا حکومت کے پاس سے کوئی اور اطلاع آئے۔ وقتاً فوقتاً مجھے یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ مزید احکام کل پرسوں تک جاری ہو جائیں گے۔ اس اثنا میں ڈاکٹروں کو ہدایت تھی کہ میری بیوی کی صحت کی روزانہ رپورٹ

حکومت کو بھیجتے رہیں۔ میرے آنے کے بعد کملا کو کچھ خفیف سا افاقہ ہوا تھا۔

یہ عام خیال تھا اور اس میں وہ حضرات بھی شریک تھے جو عموماً حکومت کے محرم راز رہا کرتے ہیں کہ میں بالکل چھوڑ دیا جاتا مگر دو باتوں کی وجہ سے نہیں چھوڑا گیا۔ ایک یہ کہ اکتوبر میں کانگریس کا پورا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا دوسرے یہ کہ اسمبلی کے انتخابات نومبر میں شروع ہونے کو تھے۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو ان موقعوں پر شدید دقت پیدا کرتا اس لئے اغلب یہ تھا کہ میں پھر تین مہینے کے لئے جیل بھیج دیا جاؤں گا اور اس کے بعد چھوڑ دیا جاؤں گا۔ مگر اس کا بھی امکان تھا کہ شاید واپس نہ بھیجا جاؤں اور جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے یہ امکان بظاہر بڑھتا جاتا تھا۔

مجھے جیل سے چھوٹے گیارھواں دن تھا یعنی اگست کی تیئیسویں تاریخ تھی۔ دفعتہً پولیس کی موٹر کار آ کر رکی اور ایک پولیس افسر نے مجھ سے آ کر کہا کہ آپ کا وقت پورا ہو گیا اور آپ کو پھر واپس چلنا ہے۔ میں اپنے عزیزوں سے رخصت ہوا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ بیمار ماں ہاتھ پھیلائے میرے پاس دوڑی آئیں۔ ان کے چہرے کی وہ کیفیت میرے دل پر ایک عرصے تک نقش رہی۔

(۶۶)

پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیاد کا گھر

"سایہ یکساں پھیلا ہوا ہوتا ہے مگر دھوپ میں رنگ کا اتار چڑھاؤ لازمی ہے۔ اسی طرح رنج راحت سے بالکل الگ ہے مگر راحت میں گوناگوں آلام کی خلش اور کسک پوشیدہ ہے۔"

(راج ترنگنی مترجمہ ر۔ س۔ پنڈت)

میں پھر نینی جیل میں واپس آگیا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ میری قید نئے سرے سے شروع ہوئی ہے۔ میری حالت گیند کی سی ہو گئی تھی جسے اندر سے باہر، باہر سے اندر پھینکتے ہیں۔ جذبات کے مسلسل اتار چڑھاؤ نے میرے نظامِ عصبی کو تہ و بالا کر دیا تھا اور ان پیہم تغیرات سے نبھانا سہل نہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ اپنی پرانی بارک میں رکھا جاؤں گا۔ اتنے دن رہتے رہتے میں اس سے کسی قدر مانوس ہو گیا تھا۔ اس میں میرے برادرِ نسبتی رنجیت پنڈت کے لگائے ہوئے پھول اب تک موجود تھے اور اس کا برآمدہ بھی کشادہ تھا۔ مگر اب اس میری بارک میں ایک صاحب شاہی قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے جو بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دیے گئے تھے۔ میرا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا گیا اس لئے مجھے جیل کے ایک اور حصے میں جگہ دی گئی جہاں ہوا گھٹی ہوئی تھی اور سبزے اور پھولوں کا نام تک نہ تھا۔

مگر مجھے تو دن اور راتیں کاٹنی تھیں، وہاں نہ سہی یہاں سہی۔ میرا جسم قید میں تھا مگر میرا دل کہیں اور تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کملا کو جو ذرا سا افاقہ ہوا ہے وہ میرے دوبارہ گرفتار ہو جانے کے صدمے سے قائم نہیں رہے گا اور یہی ہوا۔ کچھ عرصے تک مجھے ڈاکٹر کی رپورٹ

روزانہ پہنچتی رہی اور وہ بھی بڑے پھیر سے۔ ڈاکٹر پولیس کو ٹیلیفون کرتا تھا، پولیس جیل کے دفتر کو اطلاع دیتی تھی اور وہاں سے مجھے خبر ملتی تھی۔ ڈاکٹروں کا جیل کے عملے سے براہ راست بات چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھا جاتا تھا۔ دو ہفتے تک مجھے یہ رپورٹیں پابندی سے تو نہیں، مگر خیر پہنچتی رہیں۔ پھر ان کا سلسلہ بند ہو گیا حالانکہ کملا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔

پہلے بری خبریں سن کر اور پھر خبروں کے انتظار میں مجھے دن دوبھر اور راتیں پہاڑ ہو گئیں معلوم ہوتا تھا کہ وقت ساکن ہے یا چلتا بھی ہے تو چیونٹی کی چال سے۔ ایک ایک گھڑی قیامت کی گھڑی تھی۔ مجھے یہ احساس اس شدت کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ میں کوئی دو مہینے میں یعنی بمبئی کانگرس کے اجلاس کے بعد رہا کر دیا جاؤں گا مگر یہ دو مہینے دو جگ کے برابر تھے۔

دوبارہ گرفتاری کے پورے ایک مہینے کے بعد میں ایک پولیس افسر کے ساتھ اپنی بیوی سے ملنے کے لئے بھیجا گیا۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ اب سے تمہیں ہفتے میں دو بار یہاں آنے کی اجازت ملا کرے گی بلکہ وقت بھی مقرر کر دیا گیا۔ چوتھے دن میں انتظار کرتا رہا مگر کوئی لینے نہیں آیا۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں دن بھی اسی طرح گذر گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسا ستم ظریفی تھی۔

خدا خدا کر کے ستمبر کا مہینہ گذرا۔ یہ تیس دن میری زندگی کے سب سے کٹھن دن تھے۔ بیچ والوں کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی گئی کہ اگر تم بے ضابطہ طور پر وعدہ کر لو کہ قید کی میعاد کے ختم ہونے تک سیاست سے الگ رہو گے تو تم کملا کی تیمارداری کے لئے رہا کر دیئے جاؤ گے۔ میں اس وقت سیاست کے خیال سے کوسوں دور تھا اور گیارہ دن تک باہر رہ کر میں نے جو سیاسی حالات دیکھے تھے ان کی وجہ سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ مگر وعدہ کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں اپنے قول سے، اپنے مقصد سے، اپنے رفیقوں سے، اپنے آپ سے پھر جاؤں چاہے کچھ بھی ہو۔ یہ شرط تو میں ہرگز منظور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وعدہ کرنا اپنی روح کو ہلاک

سر نے اپنے عنفائڈ کا گلا گھونٹنے سے کم نہ تھا۔ سمجھانے والے سمجھاتے تھے کہ دیکھو کملا کی حالت بگڑتی جاتی ہے اگر تم اس کے پاس ہو تو شائد اس کی جان بچ جائے۔ کیا تمہیں اپنی آن کملا کی جان سے زیادہ پیاری ہے؟ اگر صورت حال یہ ہوتی تو واقعی میرے لئے سخت مشکل تھی مگر خوش قسمتی سے یہ مشکل مجھے درپیش نہ تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ خود کملا اسے ہرگز پسند نہیں کرے گی اور اگر میں نے اس قسم کا وعدہ کر لیا تو اسے صدمہ اور ضرر پہنچے گا۔

شروع اکتوبر میں مجھے پیرول سے دیکھنے کی اجازت ملی۔ وہ تیز بخار میں قریب قریب بے ہوش پڑی تھی۔ اسے یہ آرزو تھی کہ میں اس کے پاس رہوں مگر جب میں رخصت ہونے لگا تو وہ بڑی بہادری سے مسکرائی اور مجھے جھکنے کا اشارہ کیا۔ میں جھک گیا اور اس نے میرے کان میں کہا "یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم سے کہا جاتا ہے کہ تم حکومت سے کوئی وعدہ کر لو؟ دیکھو یہ ہرگز نہ کرنا!"

میری گیارہ دن کی رہائی کے دوران میں یہ طے ہوا تھا کہ کملا کو ذرا افاقہ ہو تو وہ کسی بہتر مقام پر علاج کے لئے بھیج دی جائے۔ تب سے ہم برابر اس کی طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ تو اور گرتی جاتی تھی اور اب چند ہفتے کے بعد صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی حالت پہلے سے بدتر ہے۔ اب زیادہ انتظار کرنا فضول تھا اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ وہ اسی حالت میں بھوالی بھیج دی جائے۔

اس کی روانگی سے ایک دن پہلے میں اسے رخصت کرنے کے لئے لے جایا گیا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ دیکھئے اب مجھے اس کی صورت دیکھنا کب نصیب ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ مگر وہ اس روز بہت بشاش تھی اور مجھے ایک عرصے کے بعد اپنے دل میں کسی قدر خوشی کی جھلک نظر آئی۔

تقریباً تین ہفتے بعد میں نینی جیل سے الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تاکہ کملا سے قریب رہوں۔ بھوالی رستے میں پڑتا تھا اور میں اپنے پولیس کے نگرانوں کے

ساتھ چند گھنٹے وہاں ٹھہرا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کملا کی حالت کسی قدر بہتر تھی اور میں اطمینان سے المورڑے روانہ ہوا۔ سچ پوچھیے تو کملا سے ملنے سے پہلے ہی پہاڑ کی ہوا نے میرے دل کو مسرت سے معمور کر دیا تھا۔

میں دوبارہ پہاڑ آنے سے بہت خوش تھا۔ ہماری موٹر سڑک کے پیچ و خم کے ساتھ چکر کھاتی چلی جا رہی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا اور پہاڑ کے دلفریب مناظر سے دل کو ایک عجیب فرحت ہوتی تھی۔ ہم اونچے ہوتے چلے جاتے تھے اور کھڈ کی گہرائی بڑھتی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئیں۔ درخت بالکل بدل گئے۔ ہر طرف پہاڑیاں دیودار اور صنوبر سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی سڑک کے موڑ سے نکل کر ایک نیا منظر سامنے آ جاتا تھا۔ پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک وسیع فضا اور نیچے کھڈ میں زور شور سے بہتا ہوا چھوٹا سا چشمہ اس نظارے سے میرا جی کسی طرح نہیں بھرتا تھا۔ میں اسے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے سمیٹ کر حافظے کے خزانے میں بھر لوں تاکہ جب یہ نظروں سے چھپ جائے تو اس کی یاد سے دل بہلاؤں۔

پہاڑیوں کے پہلو میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے جھنڈ تھے اور ان کے آس پاس ذرا ذرا سے کھیت جو بڑی محنت سے ڈھلوان زمینوں پر بنائے گئے تھے دور سے یہ چوڑی چوڑی سیڑھیاں معلوم ہوتی تھیں جن کا سلسلہ بعض جگہ وادی کی سطح سے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچتا تھا۔ کس قدر شدید مشقت سے ان بستیوں کے رہنے والے فطرت سے ذرا سی غذا حاصل کرتے تھے! ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر وہ بس اتنا پیدا کر پاتے تھے کہ روکھی سوکھی روٹی میسر آ جائے۔ ان جتے ہوئے کھیتوں سے اس کوہستان میں آبادی کی شان پیدا ہو گئی تھی اور کھڑی یا درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے مقابلے میں یہ عجیب لطف دیتے تھے۔

دن کو یہ منظر بڑا خوشگوار تھا۔ جب سورج اونچا ہوا اور چڑھتی ہوئی دھوپ نے پہاڑوں میں حرارت اور زندگی پیدا کر دی تو ان کی بیگانہ وشی کم ہو گئی اور ان میں انس اور

…نا کی شان نظر آنے لگی، مگر شام ہوتے ہی ان کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ جب رات دیو
…طرح لمبے لمبے قدم اٹھاتی نیچے اترتی ہے اور زندگی وحشی فطرت کے ہاتھ میدان چھوڑ کر
…ن کے گوشے میں چھپ جاتی ہے تو یہی پہاڑ کس قدر سرد مہر اور وحشت ناک نظر آنے لگتے
ہیں۔ چاندنی رات یا تاروں کی دھیمی روشنی میں یہ پراسرار عجیب طلسمی دیواریں فضا کو ہر طرف
سے گھیر لیتی ہیں اور وادیوں سے ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آواز آنے لگتی ہے۔ بیچارے
مسافر کو جو اکیلا چلا جا رہا ہو ایک عجیب احساس ہوتا ہے کہ ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور وہ خوف
سے لرزنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا بھی اس کا پیچھا کر رہی ہے اور اسے للکار رہی ہے اور کبھی
ایسا ہوتا ہے کہ ہوا بالکل تھم جاتی ہے اور اس قدر گہرا سناٹا چھا جاتا ہے کہ اس سے سخت وحشت
ہوتی ہے۔ صرف تاریکی کے تار خفیف سی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے اور ستارے زیادہ روشن
اور قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑ خشمگیں نظروں سے گھورتے ہیں اور انسان ایک راز سربستہ
کے مقابل کھڑا ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی ہیبت دل پر چھا جاتی ہے۔ وہ نیپال کا ہم زبان ہو کر
بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ان وسیع فضاؤں کی ابدی خاموشی سے مجھے ہول آتا ہے۔ میدان
میں راتوں کو اس قدر سناٹا نہیں ہوتا۔ وہاں زندگی کی سن گن کانوں میں پہنچتی رہتی ہے اور
مختلف جانوروں اور کیڑوں کی آوازیں رات کی خاموشی کو توڑتی رہتی ہیں۔

مگر جس وقت ہم موٹر پر الموڑے سے جا رہے تھے رات کی سردی اور تاریکی ابھی
بہت دور تھی۔ ہم منزل مقصود کے قریب تھے کہ راستے کے مڑنے اور بادلوں کے یکایک پھٹ
جانے سے ایک نیا منظر سامنے آگیا جسے دیکھ کر خوشی اور حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ پُراشجار
پہاڑوں کی دیواروں سے اونچی بہت دور ہمالیہ کی برف آلود چوٹیاں سورج کی روشنی میں
چمک رہی تھیں۔ یہ ماضی کی حکمت و دانش کے وارث ہندوستان کے وسیع میدانوں کے
زبردست محافظ کس قدر پروقار اور پراسرار نظر آتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی قلب کا ہیجان
اور اضطراب دور ہو گیا اور ان کی شان ابدیت کے آگے میدانوں اور شہروں کی چھوٹی چھوٹی

سازشیں اور جھگڑے حرص و ہوس اور مکر و فریب ہیچ نظر آنے لگے۔

الموڑے کا چھوٹا سا جیل ایک اونچی پہاڑی پر تھا۔ اس میں ایک شاندار بارک مجھے رہنے کے لئے ملی یعنی ایک بڑا سا ہال جو سترہ گز لمبا اور پونے چھ گز چوڑا تھا۔ اس کا فرش کچا اور ناہموار تھا، چھت کو کیڑوں نے کھا لیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر گرتے رہتے تھے۔ اس میں پندرہ کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا یا یوں کہئے کہ دیواروں میں روزن تھے جن میں سلاخیں لگی تھیں کواڑ کسی میں بھی نہ تھے۔ غرض تازہ ہوا کی کمی نہیں تھی۔ جب سردی زیادہ پڑنے لگی تو ان کھڑکیوں پر موٹی ٹاٹ چٹائی چڑھا دی گئیں۔ اس وسیع مکان میں (جو ویڑھ دن جیل کے ہر احاطے سے بڑا تھا) میں اکیلا بڑی شان سے رہا کرتا تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو میں بالکل تنہا بھی نہ تھا اس لئے کہ کم سے کم چالیس چڑیوں نے ٹوٹی ہوئی چھت میں اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کبھی کوئی سیلانی بادل آنکلتا اور اس کے بہت سے ٹکڑے دیوار کے روزنوں سے کمرے میں گھس آتے اور ساری فضا کو مرطوب کہر سے بھر دیتے۔

یہاں میں ساڑھے چار بجے سہ پہر کے ناشتے کے بعد جو میری آخری غذا تھی پانچ بجے مقفل کر دیا جاتا اور صبح سات بجے اس سلاخ دار دروازے کا قفل کھلتا۔ دن کو میں یا تو اپنی بارک میں بیٹھا رہتا یا ایک احاطے میں جو اس سے متصل تھا بیٹھ کر دھوپ کھایا کرتا۔ احاطے کی دیواروں کے اوپر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی چوٹی کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی تھی اور سر پر آسمان کی نیلی چادر تنی رہتی تھی جس میں جا بجا بادل بکھرے نظر آتے تھے۔ یہ بادل طرح طرح کے روپ بدلا کرتے تھے اور میں اس تماشے سے کبھی نہیں اکتاتا تھا۔ تصور کی مدد سے ان میں ہر قسم کے جانوروں کی شکلیں بن جاتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ بادل مل کر ایک بحر متواج معلوم ہوتے تھے یا وہ ساحل بحر سے مشابہ نظر آتے تھے اور دیودار کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ پر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ بہت فاصلے پر کہیں سمندر کی موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بادل دور سے ٹھوس نظر آتا مگر پاس آ کر کھل جاتا اور رہیں

ہر طرف سے گھیر لیا۔

مجھے یہ بڑی سی بارک چھوٹی کوٹھری کے مقابلے میں پسند تھی اگرچہ اس میں تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا جب باہر بارش ہوتی تھی اس وقت بھی میں اس میں ٹہل سکتا تھا۔ مگر جوں جوں سردی بڑھتی گئی اس کی اداسی اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور جب حرارت گرتے گرتے نقطۂ انجماد تک پہنچی تو میرا کھلے میدان اور تازہ ہوا کا شوق بھی کم ہو گیا نئے سال کے شروع میں خوب برف گرتی جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور جیل کے گرد و پیش کے بے لطف منظر میں بھی ایک لطف پیدا ہو گیا۔ دیودار کے درخت جو جیل کے احاطے کے باہر تھے نہایت خوشنما معلوم ہوتے تھے جیسے برف کی پوشاک پہنے پریاں کھڑی ہوں۔

کملا کی صحت کو ایک حالت پر قرار نہ تھا اس لئے مجھے ہر وقت فکر رہا کرتی تھی۔ بری خبر سن کر میں تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو جاتا تھا مگر پہاڑ کی ہوا طبیعت میں سکون پیدا کرتی تھی اور مجھے پھر رات کو اچھی طرح نیند آنے لگی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ عین اس وقت جب آنکھ لگنے والی ہے میں سوچنے لگتا تھا کہ نیند بھی کس قدر عجیب و غریب اور پراسرار چیز ہے۔ آخر آدمی سونے کے بعد جاگتے ہی کیوں؟ کیا اچھا ہو اگر اب میں کبھی نہ جاگوں۔

ان دنوں مجھے رہائی کی آرزو اس شدت سے تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بمبئی کی کانگریس ہو چکی، نومبر آیا اور چلا گیا۔ اسمبلی کے انتخابات کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ مجھے خیال تھا کہ شاید اب میں چھوڑ دیا جاؤں۔

مگر خبر آئی تو یہ آئی کہ خان عبدالغفار خاں کو گرفتار کر کے سزا دے دی گئی اور سبھاش بوس پر ہندوستان کے مختصر قیام کے زمانے میں عجیب و غریب پابندیاں عائد کی گئیں۔ یہ احکام بجائے خود وحشیانہ اور بے دردانہ تھے اور پھر یہ اس شخص کے خلاف جاری کئے گئے تھے جسے ملک میں کروڑوں آدمی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جو اپنی بیماری کے باوجود اپنے باپ کے آخری دیدار کے لئے دوڑا آیا اور وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اگر حکومت کا یہی رنگ تھا

تو ظاہر ہے کہ میری قبل از وقت رہائی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ آگے چل کر سرکاری اعلانات سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

الموڑا جیل میں ایک مہینہ رہنے کے بعد میں کملا کو دیکھنے کے لئے بھوآلی لے جایا گیا۔ اس کے بعد ہر تیسرے ہفتے میں اس سے ملتا رہا۔ وزیر ہند سر سیموئل ہور نے کئی بار یہ فرمایا کہ مجھے ہفتے میں ایک دو بار اپنی بیوی سے ملنے کی اجازت ہے۔ اگر وہ مہینے میں ایک دو بار کہتے تو زیادہ صحیح ہوتا۔ الموڑے کے پچھلے ساڑھے تین مہینے کے قیام میں میں کل پانچ بار اس سے ملنے پایا ہوں۔ یہ شکایت کے طور پر نہیں کہتا اس لئے کہ میرے خیال میں حکومت نے میرے ساتھ بڑی عنایت کی اور مجھے کملا سے ملنے کی غیر معمولی سہولتیں دیں۔ میں اس کا بہت شکر گذار ہوں۔ یہ مختصر ملاقاتیں میرے لئے نعمت تھیں اور شاید کملا کے لئے بھی۔ جس روز میں اس سے ملنے جاتا تھا ڈاکٹر اپنے قواعد کی سختیاں کم کر دیتے تھے اور مجھے اس سے دیر تک باتیں کرنے کی اجازت تھی۔ ہم ایک دوسرے سے روحانی حیثیت سے بہت قریب ہو گئے تھے اور مجھے اس سے چھوٹنا بہت شاق گذرتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ جدائی کی گھڑی آن پہنچتی تھی اور کبھی کبھی میں یہ خیال کر کے تڑپ جاتا تھا کہ شاید ایک دن ہمیں ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑے گا۔

میری والدہ علاج کے لئے بمبئی گئی تھیں کیونکہ انھیں ابھی تک صحت نہیں ہوئی تھی۔ وہاں سے یہ اطلاعیں آرہی تھیں کہ انھیں فائدہ ہو رہا ہے۔ مگر وسط جنوری میں ایک روز دفعتہً ایک تار پہنچا جس سے میں بدحواس ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ ممکن تھا کہ میں بمبئی کے جیل میں بھیج دیا جاؤں تاکہ ان کے پاس رہ سکوں مگر خبر آئی کہ ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے اس لئے نہیں بھیجا گیا۔

فروری کا مہینہ آگیا ہے۔ ہوا میں بہار کی کیفیت محسوس ہونے لگی ہے۔ بلبلیں چہک رہی ہیں۔ درختوں میں پر اسرار طریقے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اس عجیب و غریب دنیا کو

حیران ہو کر دیکھتی ہیں۔ پہاڑیوں کے پہلو میں سرخ پھولوں سے بھری جھاڑیاں دور سے خون کے دھبے معلوم ہوتی ہیں۔ آلوچے اور شفتالو کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔ دن گذرتے جاتے ہیں اور میں ایک ایک گھڑی گن رہا ہوں کہ بھوالی جانے کا وقت آئے۔ خدا جانے یہ بات سچ ہے یا نہیں کہ مصیبت کے بعد راحت اور جدائی کے بعد وصل کے دن آتے ہیں شائد ایسا نہ ہو تو ہم راحت کی قدر ہی نہ کریں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت انسان کے دماغ کو روشن کر دیتی ہے مگر حد سے زیادہ مصیبت آئے تو وہ اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ جیل میں رہ کر مشاہدۂ نفس کا بہت موقع ملتا ہے اور اتنے دن قید رہنے سے مجھے اپنی نفسی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں خلقی طور پر داخل بیں نہیں ہوں مگر قید کی زندگی میں قہوے یا کچلے کی طرح یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو داخل بیں بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات میں دل بہلانے کے لئے پروفیسر میکڈوگل کے کعب کا خاکہ کھینچتا ہوں جس سے داخل بینی اور خارج بینی ناپی جاتی ہے۔ میں اسے نظر جما کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شکل بڑی تیزی سے بار بار بدل رہی ہے۔

(۶۷)

حال کے چند واقعات

"رات کے بعد صبح ہوتی ہے مگر ہماری زندگی کے گئے ہوئے
دن واپس نہیں آتے۔ آنکھ آنے والے زمانے کو دیکھتی ہے مگر گذری
ہوئی بہار کا داغ دل سے نہیں مٹتا۔"

(لی ٹائی پو)

مجھے جو اخبار پڑھنے کو ملتے تھے ان سے بمبئی کی کانگرس کا حال معلوم ہوا۔ مجھے قدرتی طور پر کانگرس کی سیاست سے اور اس کے لیڈروں کی شخصیت سے دلچسپی تھی بیس سال کے گہرے تعلقات کی وجہ سے میں اس سے اس قدر وابستہ ہو گیا تھا کہ میری ذات اس میں محو ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تعلق کچھ اس عہدے کی وجہ سے نہ تھا جو مجھے اس میں حاصل تھا۔ مخفی روحانی رشتوں نے مجھے اس عظیم الشان انجمن اور اپنے بے شمار پرانے رفیقوں سے جکڑ رکھا تھا۔ پھر بھی مجھے اس کی کارروائی پڑھ کر کچھ جوش نہیں آیا۔ بہت سے اہم فیصلوں کے باوجود مجھے یہ اجلاس پھیکا معلوم ہوا۔ جن چیزوں سے مجھے دلچسپی تھی ان کا اس میں ذکر تک نہیں آیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو کیا کرتا۔ میں خود یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نئے حالات کا اور اپنے ماحول کا مجھ پر کیا اثر پڑتا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جیل میں اس مشکل مسئلے میں سر کھپاتا جبکہ میرے فیصلے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب وقت آئے گا تو میں اس وقت کی صورت حال پر غور کر کے فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس وقت کوئی فیصلہ کرنا چاہے وہ اپنے دل ہی میں کیوں نہ ہو محض حماقت تھی

اس لئے کہ بدلنے والے واقعات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک میں اتنی دور اپنے پہاڑی مسکن میں بیٹھ کر سمجھ سکتا تھا اس جلسے کے دو نمایاں پہلو تھے۔ ایک یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت جلسے پر چھائی ہوئی تھی دوسرے یہ کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر آنے نے جو فرقہ وارانہ قصے چھیڑے وہ بالکل نہیں چلنے پائے۔ جو لوگ ہندوستان کے عام لوگوں اور اوسط طبقوں کے حقیقی حالات سے واقف ہیں ان کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ گاندھی جی کا اثر اب تک ہندوستان میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ سرکاری حکام اور بعض گوشہ نشین سیاست داں جو اپنی خواہش کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ گاندھی جی کا اثر سیاست کے میدان میں ختم ہو گیا ہے یا کم سے کم بہت گھٹ گیا ہے مگر جب یہ شخص پھر اسی قوت اور شان سے میدان میں آتا ہے تو یہ حیرت میں رہ جاتے ہیں اور اس ظاہری تغیر کے اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ اقتدار کانگرس میں کچھ تو ان خیالات کی بنا پر ہے جنھیں لوگ عام طور پر مانتے ہیں مگر اس سے بھی بڑھ کر ان کی عجیب و غریب شخصیت کی وجہ سے۔ شخصیت ہر جگہ اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان میں اس کی اہمیت اور سب ملکوں سے زیادہ ہے۔

ان کا کانگرس سے علیحدہ ہونا اس اجلاس کا سب سے اہم واقعہ تھا اور یہ ظاہر میں ہے کانگرس اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا دور ختم ہو گیا۔ مگر اصل میں ان کا علیحدگی کا اعلان کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ کانگرس میں جو ان کا اقتدار ہے اسے وہ چاہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کی بنا کسی عہدے پر یا کسی محسوس رشتے پر نہیں ہے۔ کانگرس پر ان کے خیالات آج بھی اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے پہلے تھے اور اگر وہ گاندھی جی کی راہ سے الگ بھی ہو جائے تب بھی غیر شعوری طور پر اس پر اور ملک پر ان کا اثر باقی رہے گا۔ وہ اس ذمہ داری سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ جب ہندوستان کے واقعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی شخصیت سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے اور اس سے کسی طرح قطع نظر نہیں کی جا سکتی

نہیں کی جاسکتی۔

فی الحال وہ کانگرس سے الگ ہو گئے ہیں غالباً اس وجہ سے کہ وہ اسے الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ شاید وہ کسی قسم کی انفرادی، عملی جدوجہد شروع کرنا چاہتے ہیں جس میں حکومت سے جھگڑا ہونا لازمی ہے اور وہ اسے کانگرس کا معاملہ نہیں بنانا چاہتے۔

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ کانگرس نے ملک کے دستور کی تشکیل کے لئے ایک مجلس اساسی قائم کرنے کی تجویز منظور کی۔ میرے خیال میں اس مسئلے کو حل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں اور کبھی نہ کبھی ایسی مجلس منعقد کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا انعقاد برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ملک میں انقلاب ہو جائے تو اور بات ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں حکومت اسے منظور نہیں کرے گی۔ اس لئے ایسی مجلس جو صحیح معنی میں اساسی مجلس کہی جا سکے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ملک میں اتنی قوت نہ پیدا ہو جائے کہ وہ حکومت کو اس پر مجبور کر دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا۔ کانگرس کے بعض لیڈروں کی جو اساسی مجلس کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں یہ کوشش ہے کہ وہ اسے اعتدال کے سانچے میں ڈھال کر پرانی آل پارٹیز کانفرنس کے نمونے کی چیز بنا دیں۔ اس سے مطلق کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہی پرانے لوگ جو زیادہ تر خود ہی اپنے آپ کو منتخب کر لیتے ہیں، ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور آپس میں لڑیں گے۔ اساسی مجلس کا اصل اصول یہ ہے کہ اسے عام لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد منتخب کرے اور اس میں جمہور کی قوت اور ان کی روح کام کرتی ہو۔ ایسی مجلس فوراً حقیقی مسائل پر غور کرنا شروع کر دے گی اور وہ پہلے کی طرح فرقہ وارانہ تعصبوں اور اس قسم کے اور جھگڑوں میں پھنس کر نہیں رہ جائے گی۔

اس تجویز کا شملہ اور لندن پر جو اثر ہوا اس کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا۔ نیم سرکاری طور پر یہ کہا گیا کہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا یعنی اس نے مربیانہ انداز سے

کی جائے گی تاکہ کسی موقع پر ان کے چند ووٹ حاصل ہو سکیں اور اس سے کانگرس کے لیڈروں اور عام لوگوں میں اور زیادہ بیگانگی پیدا ہوگی۔ دھواں دھار تقریریں کی جائیں گی، پارلیمنٹ کے آداب کی پوری پوری پابندی ہوگی اور کبھی کبھی حکومت کو شکست ہو جایا کرے گی جسے وہ پہلے کی طرح بے پروائی سے نظرانداز کر دے گی۔

پچھلے چند سال میں جب کانگرس کونسلوں کا بائیکاٹ کر رہی تھی اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ اسمبلی اور صوبوں کی کونسلیں جمہور کی حقیقی نمائندہ اور رائے عامہ کا آئینہ ہیں۔ اب یہ لطف دیکھئے کہ جب انتہا پسند جماعت اسمبلی پر حاوی ہوگئی تو حکومت کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ جب کبھی انتخابات میں کانگرس کی کامیابی کا ذکر آتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ انتخاب کنندوں کا حلقہ بہت محدود ہے، تیس پینتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ آدمی رائے دہندگی کا حق رکھتے ہیں۔ گویا سرکاری نقطۂ نظر سے، جتنے آدمی حق رائے دہندگی سے محروم ہیں وہ سب کے سب حکومت برطانیہ کے حامی ہیں۔ اس کا علاج تو کھلا ہوا ہے۔ کل بالغوں کو یہ حق دیدیجئے تو آپ ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

اسمبلی کے انتخابات کے تھوڑے ہی دن بعد اس مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگئی جو ہندوستان کے دستور اساسی کی اصلاح کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اس پر ہر طرف سے مختلف قسم کے اعتراضات ہوئے، جن میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کی طرف سے "بے اعتمادی" اور "شبہات" رکھتی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ ہمارے قومی اور سماجی معاملات کو عجیب و غریب نظر سے دیکھتے ہیں۔ آخر برطانوی سامراجی پالیسی اور ہمارے قومی اغراض میں بنیادی اختلاف ہے یا نہیں؟ سوال تو یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو مقدم سمجھیں۔ کیا ہم آزادی اسی لئے چاہتے ہیں کہ اس سامراج کی پالیسی کو قائم رکھیں؟ برطانوی حکومت کا تو صریحی طور پر یہی خیال ہے اس لئے کہ ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ "تحفظات" سے اس وقت تک کام نہیں لیا جائے گا جب تک ہم کوئی شرارت

نہ کریں یعنی ہماری حکومت خود اختیاری کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ ہم وہی کریں جو برطانوی حکومت چاہتی ہے۔ اگر برطانوی پالیسی کو ہندوستان میں قائم رکھنا ہے تو پھر سواراج کے لئے اس قدر ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اُٹاوا کے معاہدے سے انگلستان کو جو کچھ معاشی فائدہ ہوا وہ صرف ہندوستان کی تجارت[۱] کے معاملے میں ہوا۔ برطانوی تاجر جو ہندوستان سے تجارت کرتے ہیں بے شک نفع میں رہے (گو ہندوستان کے سیاسی اور تجارتی حلقوں کی رائے میں یہ نفع عام ہندوستانیوں کی اغراض کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا گیا۔) مگر نو آبادیات، خصوصاً کنیڈا اور آسٹریلیا[۲] میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ انھوں نے برطانیہ سے بڑا اچھا سودا کیا اور اسے

۱؎ "ہندوستان کی تجارت کا ذکر کرتے ہوئے سر ولیم کری نے فرمایا کہ اُٹاوا کے معاہدے سے برطانیہ کو صرف یہی فائدہ پہنچا۔" سر ولیم نے یہ الفاظ ۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو کہے جب وہ پی اینڈ او جہاز راں کمپنی کے جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔

۲؎ جون ۱۹۳۴ء کا "لنڈن اکنامسٹ" کہتا ہے کہ اُٹاوا کانفرنس "اس وقت حق بجانب سمجھی جاتی جب اس کی وجہ سے سلطنت کی اندرونی تجارت بڑھ جاتی اور وہ تجارت جو دنیا کے دوسرے ملکوں سے ہوتی ہے گھٹنے نہ پاتی مگر واقعہ یہ ہے کہ صرف سلطنت کی اندرونی تجارت میں خفیف سا اضافہ ہوا جس سے اس روز افزوں کمی کی تلافی نہیں ہو سکتی جو سلطنت کی مجموعی تجارت میں ہوئی۔ اور پھر اس اضافے سے برطانیہ کے مقابلے میں نو آبادیوں کو زیادہ فائدہ پہنچا۔ سلطنت کے دوسرے ملکوں سے ہماری درآمد ۱۹۳۱ء میں ۲۴ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ تھی اور ۱۹۳۳ء میں ۲۴ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ ہو گئی مگر ہماری برآمد ۱۷ کروڑ ۶۰ لاکھ سے ۱۶ کروڑ ۳۵ لاکھ رہ گئی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک اندرون سلطنت میں ہماری برآمد ۵۰٫۹ فی صدی گھٹ گئی حالانکہ درآمد میں صرف ۲۳٫۹ فی صدی کی کمی ہوئی۔ ممالک غیر میں ہماری برآمد میں تو زیادہ کمی نہیں ہوئی مگر درآمد بہت گھٹ گئی۔"

نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھایا۔ پھر بھی ان کی یہ کوشش ہے کہ اٹاوا کے معاہدے کے چکر سے نکلیں تاکہ وہ خود اپنی صنعت کو اور دوسرے ملکوں سے اپنی تجارت کو ترقی دے سکیں[1]۔ کنیڈا میں لبرل پارٹی جو ایک ممتاز سیاسی جماعت ہے اور غالباً بہت جلد برسر اقتدار آ جائے گی صاف الفاظ میں اعلان کر چکی ہے کہ وہ اٹاوا کے معاہدے کو ختم کر دے گی[2]۔ آسٹریلیا میں اٹاوا کے معاہدے کی تاویلیں کر کے بعض قسم کے کپڑے اور سوت پر محصول بڑھا دیا گیا ہے۔ اس پر لنکا شائر کے کارخانوں کے مالک بہت برہم ہوئے اور انھوں نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا۔ احتجاج اور انتقام کے طور پر لنکا شائر میں آسٹریلیا کے مال کو بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع ہوئی مگر آسٹریلیا پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے جارحانہ رویہ اختیار کیا[3]۔

---

[1] اخبار "میلبورن ایج" اٹاوا کے معاہدے کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس کی رائے میں یہ معاہدہ بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے اور روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ اس میں بڑی سخت غلطی کی گئی (بہ حوالہ ہفتہ وار مانچسٹر گارجین ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء)۔

[2] مسٹر بینیٹ موجودہ وزیر اعظم کنیڈا قدامت پسند ہونے کے باوجود برطانوی حکومت کے لیے سوہان روح بن گئے ہیں۔ وہ اب روسیوں کی طرح "نئے معاہدوں" کا ذکر کرتے ہیں۔ مسٹر لسٹی نوف، سر اسٹفرڈ کرپس اور مسٹر جان اسٹریچی کے خطرناک اثرات کی بدولت وہ اجتماعیت پسند بن گئے ہیں۔ قدامت پسندوں، اعتدال پسندوں اور سول سروس والوں کو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور ایسے لوگوں سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے ورنہ وہ بھی خطرناک نظریوں کے قائل ہو جائیں گے (ان سطروں کے لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ لبرل پارٹی نے انتخابات میں بہت بڑی اکثریت حاصل کی اور حکومت اس کے ہاتھ میں آ گئی)۔

[3] "میلبورن ایج" نے لکھا کہ اگر لنکا شائر والے مجوزہ بائیکاٹ سے باز نہیں آئیں گے تو آسٹریلیا کو لنکا شائر کی رہی سہی تجارت پر اور زیادہ سختیاں کرنی پڑیں گی۔ لنکا شائر جو کچھ کر رہا ہے اس کا جواب یہی ہے کہ ہم مضبوطی سے اپنے پہلے ارادے پر قائم رہیں۔ (بہ حوالہ ہفتہ وار مانچسٹر گارجین ۹ نومبر ۱۹۳۴ء)۔

ظاہر ہے کہ یہ معاشی نزاعیں اس وجہ سے نہیں ہیں کہ کنیڈا اور آسٹریلیا کو برطانیہ سے کسی قسم کی پرخاش ہے۔ البتہ آئرستان کو ضرور اس سے کد ہے۔ نزاعیں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ اغراض میں تصادم ہوتا ہے اور ہندوستان کے "تحفظات" کا مقصد یہی ہے کہ جب کبھی تصادم ہو تو برطانیہ کی اغراض مقدم رکھی جائیں۔ حال میں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے۔ اس میں ہندوستان کے تاجروں اور مالکان صنعت سے رائے نہیں لی گئی اور وہ چیختے ہی رہے البتہ برطانیہ کے مالکان صنعت سے برابر مشورہ ہوتا رہا۔ اسمبلی نے اس معاہدے کو مسترد کر دیا مگر حکومت اس پر اڑی رہی۔ اس سے کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ "تحفظات" کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اس قسم کے "تحفظات" کی کنیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں بڑی ضرورت ہے تاکہ ان نوآبادیوں کے لوگ نہ صرف تجارتی معاملات میں بلکہ اور کاموں میں بھی جو سلطنت کی حفاظت اور مضبوطی کے لیے ان سے زیادہ اہم ہیں راہ راست سے بھٹکنے نہ پائیں[1]۔

کہا جاتا ہے کہ سلطنت قرض خواہ ہے اور "تحفظات" اس غرض سے وضع کیے گئے ہیں کہ سلطنت کا مہاجن بدنصیب قرض دار کا گلا دبائے رہے اور اپنی اغراض اور قوت کی

---

[1] مسٹر او۔ پیرو وزیر فوج جنوبی افریقہ نے بیان کیا کہ ان کا ملک سلطنت کی عام حفاظت کی کسی اسکیم میں شریک نہیں ہوگا اور نہ سمندر پار کی کسی لڑائی میں شرکت کرے گا خواہ برطانیہ ہی سے کیوں نہ ہو۔ "اگر حکومت نے ناعاقبت اندیشی سے جنوبی افریقہ کو سمندر پار کی لڑائی میں پھنسا دیا تو عام بدامنی پھیل جائے گی اور عجب نہیں کہ خانہ جنگی کی نوبت آجائے۔ اس لئے حکومت سلطنت کی عام حفاظت کی کسی اسکیم میں شرکت نہیں کرے گی۔"

(ریوٹر کی خبر جو ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو کیپ ٹاؤن سے بھیجی گئی)

وزیراعظم جنرل ہرتسوگ نے اس بیان کی تصدیق کی اور کہا کہ یہ حکومت کی پالیسی کو ظاہر کرتا ہے۔

طت کرتا رہے۔ ایک اور عجیب و غریب نظریہ جو سرکاری طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ گاندھی جی
کانگریس نے ان تحفظات کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے اس لئے کہ سنہ ۱۹۳۱ء کے معاہدۂ دہلی کی رو
، وہ "ایسے تحفظات جو ہندوستان کے لئے مفید ہوں" قبول کر چکے ہیں۔

اور پھر اٹاوا کا معاہدہ اور تجارتی تحفظات تو نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں[1]۔ ان سے کہیں زیادہ اہم
شرطیں ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کا سیاسی اور معاشی تسلط ہندوستان پر قائم رہے جس نے
لے انھیں خوب لوٹا اور اب بھی لوٹ رہا ہے۔ جب تک یہ شرطیں اور "تحفظات" باقی ہیں نہ
ی قسم کی حقیقی ترقی ہو سکتی ہے اور نہ آئینی طریقوں سے کوئی تغیر ممکن ہے۔ جو کوشش بھی آئینی
یقے سے کی جائے گی اس کی راہ میں "تحفظات" کی دیوار حائل ہوگی اور یہ بات ظاہر ہو جائے
ی کہ صرف ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ غیر آئینی راہ ہے۔ سیاسی تغیر کے نقطۂ نظر سے یہ مجوزہ
ستور اور اس کا عجیب الخلقت وفاق بالکل مہمل چیز ہے اور سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے اور
ی بدتر ہے۔ اشتراکیت کا رستہ خاص کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ بظاہر بہت سے اختیارات منتقل
کئے گئے ہیں (وہ بھی زیادہ ان طبقوں کو جن سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے) مگر کوئی مفید کام
رنے کا اختیار اور وسائل نہیں دئے گئے۔ اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں ہے اور ذمہ داری
ہندوستانیوں پر۔ استبداد کی برہنگی کو چھپانے کے لئے دستور کے مطابق انجیر کا پتا تک بھی تو
نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل ملکوں کے دستور اساسی میں بہت زیادہ لوچ ہونا چاہئے
تاکہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلا جا سکے۔ جلد فیصلہ کرنے اور اس فیصلے کو نافذ

---

[1] "لندن اکانسٹ" (اکتوبر ۱۹۳۴ء) نے صاف کہہ دیا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سے برطانوی حکومت کی برکات میں ایک مشتبہ اضافہ یہ بھی ہو جائے گا کہ دنیا کے بہت سے حصوں کے باشندے اس پر مجبور کئے جائیں گے کہ وہ زیادہ قیمت دے کر لنکاشائر کا مال خریدیں"۔ اس کی سب سے نمایاں مثال سیلون ہے۔

کرنے کا اختیار ضروری ہے۔ آج کل خود مغربی ملکوں کی پارلیمنٹری جمہوریت بھی ان تغیرات کو عمل میں نہیں لاسکتی جو موجودہ زمانے کے لئے ضروری ہیں۔ مگر یہاں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ حرکت کو روکنے کے لئے خاص کرکے ہمارے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور ہمارے سامنے ایک آہنی دروازہ کھڑا کردیا گیا ہے۔ ہمیں ایک ایسی موٹر کار دی گئی ہے جس میں بریک ہی بریک ہیں انجن کوئی نہیں۔ یہ دستور اساسی ان لوگوں کا بنایا ہوا ہے جن کی نظروں میں ہمیشہ مارشل لا سمایا رہتا ہے۔ جس شخص کا دارومدار تشدد پر ہو اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو مارشل لا یا تباہی۔

برطانیہ کے اس تحفے سے ہندوستان کو جس قدر آزادی دی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ملک میں جو سب سے زیادہ اعتدال پسند اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ جماعتیں ہیں۔ انھوں نے بھی اس کو رجعت پسندانہ قرار دیا ہے۔ حکومت کے ہمیشہ در حامیوں نے اعتراض کے ساتھ ساتھ اپنی عادت کے مطابق تھوڑی بہت خوشامد بھی کی ہے مگر دوسرے جوش وخروش سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

مجوزہ دستور کو دیکھنے کے بعد لبرل جماعت کا یہ راسخ عقیدہ بھی متزلزل ہوگیا کہ ہندوستان کو برطانیہ کا محکوم بنانا قدرت کی عین حکمت ہے۔ انھوں نے بڑی سختی سے اس دستور پر تنقید کی مگر چونکہ وہ حقیقت کی طرف التفات نہیں کرتے اور الفاظ اور حسن اخلاق کے عاشق ہیں اس لئے ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ رپورٹ میں اور مسودۂ قانون میں "درجہ نوآبادیات" کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس پر بڑی چیخ وپکار ہوئی اور اب جب کہ سرسیموئیل ہور نے اس مسئلے کے متعلق ایک بیان دے دیا ہے غالباً ان حضرات کی خودداری کو تسکین ہو جائے گی۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ درجہ نوآبادیات محض ایک پرچھائیں ہے جو نامعلوم مستقبل میں جھلکتی ہے، ایک موہوم منزل ہے جسے ہم کبھی نہیں پا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ ہم اس کا خواب دیکھتے رہیں اور اس کے حسن وجمال کے گیت گاتے رہیں۔ سرتیج بہادر سپرو کو شاید برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی

ے متعلق کچھ شبہات ستا رہے تھے اس لئے انھوں نے بادشاہ کے دامن میں پناہ لی۔ تعجب ہے کہ ان جیسے ممتاز قانون داں نے ایک انوکھا دستوری نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں چاہے برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی قوم ہندوستان کے لئے کچھ کرے یا نہ کرے، ان دونوں ے بالاتر بادشاہ کی ذات ہے جو ہندوستانی رعایا کے حقوق کی اور ہندوستان کے امن اور ح کی محافظ ہے"[1] یہ بڑا تسکین دہ نظریہ ہے اس کے بعد ہمیں کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ نور قوانین اور سیاسی اور سماجی تغیرات کی فکر میں سر کھپائیں۔

مگر بڑی بے انصافی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ لبرل جماعت نے دستور کی مخالفت کم کردی ہے۔ ان میں سے اکثر نے صاف صاف کہا ہے کہ موجودہ حالات کو چاہے وہ کتنے ہی بُرے وں نہ ہوں، اس دستور پر ترجیح دیتے ہیں جو زبردستی ہندوستان کے سر منڈھا جارہا ہے۔ اس ت پر زور دینے کے سوا وہ اپنے اصول کے مطابق اور کچھ نہیں کرسکتے اور غالباً وہ زور ہی یتے رہیں گے۔ اس پرانی مثل میں نیا تصرف کرکے وہ اسے اپنا دستور العمل بنا سکتے ہیں "اگر پہلی بار تمھیں کامیابی نہ ہو تو پھر چلاؤ۔"

لبرل لیڈر اور غالباً اور بہت سے لوگ جن میں بعض کانگرسی بھی شامل ہیں اپنی امیدیں س سے وابستہ رکھتے ہیں کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی فتح ہو اور اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ بے شک کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان برطانیہ کی انتہا پسند جماعتوں کی مدد سے ترقی نہ کرے اور بر حکومت کے آنے سے فائدہ نہ اٹھائے۔ مگر بے بسی کی حالت میں اس بھروسے پر بیٹھے رہنا انگلستان کی حکومت بدل جائے ہرگز قومی عزت و وقار کے شایاں نہیں۔ اور عزت و وقار تو لیے طرف عقل کے بھی خلاف ہے۔ آخر ہم کیوں برطانیہ کی لیبر پارٹی سے زیادہ توقعات رکھیں؟ ہم دو بار لیبر پارٹی کی حکومت دیکھ چکے ہیں اور اس سے ہندوستان کو جو برکتیں حاصل

---

[1] انھوں نے یہ الفاظ ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں کہے تھے۔

ہوئیں انھیں کبھی نہیں بھولیں گے۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ لیبر پارٹی سے الگ ہو گئے، تو کیا ہوا ان کے پرانے ساتھیوں کا قریب قریب وہی رنگ ہے۔ لیبر پارٹی کی جو کانفرنس اکتوبر ۱۹۳۴ء میں ساؤتھ پورٹ میں ہوئی تھی وہاں مسٹر و۔ک۔ کرشنا مینن نے ایک رزولیوشن پیش کیا "جس میں اس کی اشد ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ قوموں کو اپنا طرز حکومت آپ معین کرنے کا جو حق حاصل ہے۔ اس کے مطابق ہندوستان میں فوراً کامل حکومت خود اختیاری قائم کر دی جائے" مسٹر آرتھر ہینڈرسن نے اس پر زور دیا کہ یہ رزولیوشن واپس لے لیا جائے اور مجلس منتظمہ کی طرف سے یہ وعدہ کرنے سے انکار کیا کہ وہ ہندوستان کو تعین حکومت کی آزادی دینے کی پالیسی پر عمل کرے گی۔ انھوں نے فرمایا "ہم صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہوگا ہم ہندوستانی قوم کے ہر فریق سے رائے لیں گے۔ اس سے سب کا اطمینان ہو جانا چاہیے" یہ اطمینان شاید اس وجہ سے کم ہو جائے کہ پچھلی لیبر حکومت نے بھی حرف بہ حرف اسی پالیسی کا اعلان کیا تھا اور گول میز کانفرنس، وھائٹ پیپر، مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ اور انڈیا ایکٹ اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ سلطنت کی بیرونی پالیسی کے معاملے میں، انگلستان میں ٹوری ہوں یا لیبر پارٹی والے سب ایک سے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لیبر پارٹی کے عام ممبر زیادہ آزاد خیال ہیں مگر ان کا اثر اپنے قدامت پسند لیڈروں پر بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ لیبر پارٹی میں انتہا پسند فریق زیادہ قوی ہو جائے کیوں کہ آج کل حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ لیکن کیا قومی اور سماجی تحریکیں دوسرے ملکوں کے موہوم تغیرات کے آسرے میں پڑ کر سو جایا کرتی ہیں؟

ہمارے یہاں کی لبرل جماعت کا برطانوی لیبر پارٹی کے بھروسے پر رہنا ایک لحاظ سے عجیب و غریب ہے؛ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر یہ پارٹی اپنے انتہا پسند فریق کی طرف جھک گئی اور اس نے انگلستان میں اپنا اشتراکی پروگرام جاری کر دیا تو پھر آپ اور ہندوستان کے دوسرے اعتدال پسند کیا کریں گے؟ ان میں سے اکثر حضرات اجتماعی مسائل میں بڑے پکے قدامت پسند ہیں۔ وہ ان اجتماعی اور معاشی تغیرات کو جو لیبر پارٹی نے انگلستان میں کئے

ہیں ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں ان کے نافذ ہونے سے ڈرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جب برطانیہ سے تعلق رکھنا اجتماعی حالات میں انقلاب کی علامت سمجھا جائے تو ان حضرات کو برطانوی تعلق کا یہ شوق نہ رہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے جیسے لوگ جو کامل آزادی اور برطانیہ سے قطع تعلق چاہتے ہیں اس وقت اپنی رائے بدل دیں اور اشتراکیت پسند برطانیہ سے گہرے تعلقات رکھنے کو ترجیح دیں۔ ظاہر ہے کہ ہم میں سے کسی کو برطانوی قوم سے اتحاد عمل کرنے پر اعتراض نہیں ہے ہم تو اس کی شہنشاہی کی پالیسی کے مخالف ہیں اور جب وہ اس کو چھوڑ دے گی تو اتحاد عمل کی راہ خود بخود کھل جائے گی۔ اس وقت اعتدال پسند حضرات کا کیا رنگ ہوگا؟ غالباً وہ اسے بھی قدرت کی ناقابل فہم حکمت پر محمول کریں گے۔

گول میز کانفرنس اور وفاق کی تجویز کا ایک نمایاں نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی والیان ریاست بہت پیش پیش ہوگئے ہیں۔ رجعت پسند ٹوریوں کی جو شفقت ان کے حال پر ہے اور انھیں جو آزادی ملی ہے اس نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اس سے پہلے کبھی انھیں زبردستی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ پہلے ان کی یہ مجال نہ تھی کہ جس بات کا اشارہ رزیڈنٹ کی طرف سے ہو اس سے انکار کرسکیں اور حکومت ہند ان حضرات کے ساتھ کھلم کھلا حقارت کا برتاؤ کرتی تھی۔ اکثر ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی جاتی تھی اور بعض اوقات یہ مداخلت بالکل جائز ہوتی تھی۔ آج بھی بہت سی ریاستوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ برطانوی افسروں کی حکومت ہے جن کی خدمات انھیں "مستعار" دی گئی ہیں۔ مگر مسٹر چرچل اور لارڈ روڈرمیر کی جدوجہد سے حکومت ہند گھبرا گئی ہے اور اب ان کے فیصلوں میں دخل دینے میں بہت احتیاط کرتی ہے اور یہ لوگ بھی ذرا اکڑے ہوئے ہیں۔

میں نے ہندوستان کی سیاست کے ان سطحی معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے ان میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی۔ میں تو اس چیز کو دیکھ کر کڑھتا ہوں جو ان کی تہ میں ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قسم کی آزادی سلب کی جارہی ہے، مصیبت اور تکلیف کا بازار گرم ہے۔ لوگوں

کی نیک نیتی مسخ کر کے دکھائی جاتی ہے اور برے رجحانات کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے جیل میں پڑے ہیں اور اپنی زندگی کے ماہ و سال گھٹ گھٹ کر کاٹ رہے ہیں[۱] ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہزاروں اور آدمیوں کے دل میں غم و غصے کے جذبات، اور وحشیانہ قوت کے آگے عجز اور بے بسی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ امن کے زمانے میں بھی بہت سی انجمنیں خلاف قانون قرار دے دی جاتی ہیں اور "ہنگامی اختیارات" اور "قیام امن کے قوانین" حکومت کے سلاح خانے میں قریب قریب ہر وقت رہا کرتے ہیں۔ آزادی کو سلب کرنے کی تدبیریں جو استثنا کے طور پر شروع ہوتی ہیں بہت جلد کلیہ بن جاتی ہیں۔ صدہا کتابیں اور رسالے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں اور ان کا داخلہ "بحری چنگی کے قانون" کی رو سے بند کر دیا جاتا ہے اور جس کے پاس "خطرناک" کتابیں نکلیں اسے بعض اوقات بڑی بھاری سزا دی جاتی ہے۔ سیاسی یا معاشی مسائل حاضرہ پر آزادی سے اظہار رائے کیا جائے یا روس کے معاشرتی اور تمدنی حالات کی تعریف کی جائے تو سنسر صاحب بہت خفا ہو جاتے ہیں۔ ماڈرن ریویو کو حکومت بنگال نے اس بات پر تنبیہ کی تھی کہ اس نے ڈاکٹر ٹیگور کا ایک مضمون روس کے

---

[۱] سر ہیری ہیگ ہوم ممبر نے ۲۳ جولائی ۱۹۳۴ء کو اسمبلی میں کہا تھا کہ ان لوگوں کی مجموعی تعداد، جو جیلوں اور کیمپوں میں نظر بند ہیں حسب ذیل ہے:-

بنگال ۱۵۰۰ اور ۱۶۰۰ کے درمیان، دیولی کیمپ ۵۰۰۔ میزان ۲۰۰۰ اور ۲۱۰۰ کے درمیان۔ یہ صرف نظر بندوں یعنی ان لوگوں کی تعداد ہے جو بغیر عدالتی تحقیقات اور سزا کے قید کر دیے گئے ہیں۔ سزا یافتہ سیاسی قیدی ان کے علاوہ ہیں۔ ان کو عموماً بہت بھاری بھاری سزائیں دی گئی ہیں۔ ایسوشی ایٹڈ پریس کی ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کی خبر ہے کہ حال ہی کلکتے کے ایک مقدمے میں ہائی کورٹ نے ایک شخص کو بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں ۹ سال قید بامشقت کی سزا دی۔ اس کے پاس سے ایک ریوالور اور ۴ کارتوس نکلے تھے۔

متعلق، جو انھوں نے وہاں جانے کے بعد لکھا تھا، شائع کیا تھا۔ نائب وزیر ہند صاحب نے پارلیمنٹ میں فرمایا کہ "اس مضمون میں وہ کارگذاریاں جو برطانوی حکومت نے ہندوستان میں کیں، مسخ کر کے دکھائی گئی ہیں" اس لئے اس پر اعتراض کیا گیا۔[۱۵] ان کارگذاریوں کے متعلق صحیح رائے وہ ہے جو سنسر کی ہو اور ہمیں کوئی حق نہیں کہ اس کے خلاف رائے رکھیں یا ظاہر کریں۔ حکومت نے اس مختصر پیام کی اشاعت پر بھی اعتراض کیا جو رابندر ناتھ ٹگور نے ڈبلن کی "سوسائٹی آف فرینڈز" کے نام بھیجا تھا۔ اگر رابندر ناتھ ٹگور کا سا حکیم جو صرف تمدنی مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے اور سیاسیات سے خاص کر کے الگ رہتا ہے جس کا ہندوستان میں بڑا احترام اور دنیا میں بڑی شہرت ہے، اس طرح زبان بند کیا جا سکتا ہے تو چھوٹے آدمیوں کا کیا ذکر ہے۔ خود ان زبان بندیوں سے بھی بدتر وہ خوف کی فضا ہے جو ان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں نہ تو دیانت دارانہ اخبار نویسی کا امکان ہے اور نہ تاریخ، معاشیات، سیاسیات اور واقعات حاضرہ کی تحقیق اور صحیح تعلیم کا۔ یہ عجیب و غریب بنیاد ہے جس پر اصلاحات، ذمہ دار حکومت وغیرہ کی عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔[۱۶]

---

۱۵ ۱۲ نومبر ۱۹۳۴ء۔

۱۶ ۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اسمبلی میں سرکاری طور پر پریس ایکٹ کی عمل درآمد کے متعلق ایک بیان دیا گیا۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ ۱۹۳۲ء سے اب تک ۵۱۴ اخبارات پر ضمانت کی طلبی اور ضبطی کا اثر پڑا۔ ان میں سے ۳۴۸ اخبارات بند ہو گئے ہیں اس لئے کہ وہ مزید ضمانتیں نہیں دے سکتے تھے اور ۱۶۶ نے ضمانتیں داخل کیں جن کی مجموعی مقدار ۲ لاکھ ۵۲ ہزار ۸۲۵ روپئے تھے۔

حال میں یعنی ۱۹۳۵ء کے نصف آخر میں، کئی اور قانون جو مدنی آزادی کو سلب کرتے ہیں ایک طویل عرصے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قانون ترمیم ضابطہ فوجداری ہے جس کا نفاذ سارے ہندوستان میں ہے۔ اسے اسمبلی نے نامنظور کر دیا تھا مگر گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی۔ اکثر صوبوں میں بھی

۲ اس قسم کے قانون بنائے گئے ہیں۔

ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ آج کل دنیا سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ بعض لوگوں کو موجودہ حالات سے بیزاری کا مبہم اور بعض کو واضح احساس ہے مگر ہیں سب شدت سے بیزار۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے تغیرات ہو رہے ہیں اور مستقبل خواہ وہ کوئی شکل بھی اختیار کرے اب اتنی دور کی چیز نہیں جو صرف فلسفیوں، عمرانیوں اور معاشیوں کے ذہن میں محض نظری دلچسپی پیدا کرتا ہو۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو ہر شخص کی زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتا ہے اور ہر شہری کا فرض ہے کہ ان قوتوں کو جو دنیا میں کارفرما ہیں اچھی طرح سمجھے اور اپنے طرز عمل کے متعلق فیصلہ کرے کہ پرانی دنیا ختم ہو رہی ہے اور نئی دنیا بن رہی ہے۔ کسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ پہلے آدمی اس مسئلے کو سمجھے بلکہ اس کا سمجھنا بجائے خود اسی قدر اہم ہے جتنا اس کا حل کرنا۔

بدقسمتی سے ہمارے سیاست داں واقعات عالم سے حیرت انگیز طور پر ناواقف یا بے پروا ہیں۔ غالباً یہی ناواقفیت ہندوستان کے اکثر سرکاری ملازموں میں بھی پائی جاتی ہے، اس لئے کہ سول سروس والے اپنی علیحدہ اور محدود دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ صرف بڑے بڑے حکام ان مسائل پر غور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت واقعات عالم کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہے تاکہ ان کے لحاظ سے اپنی پالیسی کی تشکیل کرے۔ سب جانتے ہیں کہ برطانیہ کی خارجی پالیسی پر اس چیز کا بڑا اثر ہے کہ وہ ہندوستان پر قابض ہے اور اس کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ مگر کتنے ہندوستانی سیاست داں اس پر غور کرتے ہیں کہ جاپانی شہنشاہی یا سوویٹ کی بڑھتی ہوئی قوت، پاسن کیانگ میں انگریزوں، روسیوں اور جاپانیوں کی سازشیں ہندوستان کی سیاست سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ وسط ایشیا کے حالات کا اثر صریحی طور پر کشمیر پر پڑ رہا ہے اور وہ برطانیہ کی پالیسی اور مدافعت کا مرکز بن گیا ہے۔

ان سے بھی زیادہ اہم وہ معاشی تغیرات ہیں جو بڑی تیزی سے ساری دنیا میں رونما ہو رہے ہیں۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ انیسویں صدی کا نظام ختم ہو گیا اور

وہ آج کل کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ قانون دانوں کا وہ اصول، جو ہندوستان میں بہت رائج ہے کہ ہر بات کی نظیریں ڈھونڈھی جاتی ہیں، وہاں کیا کام دے سکتا ہے جہاں سرے سے کوئی نظیر ہی موجود نہ ہو۔ ہم چھکڑے کو پٹری پر چلا کر اسے ریل نہیں کہہ سکتے۔ اسے تو فرسودہ چیز سمجھ کر ترک ہی کرنا پڑے گا۔ روس کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی "نئے معاشی انتظامات" اور عظیم الشان تغیرات کا چرچا ہے۔ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے، جو یقیناً سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنا اور تقویت پہنچانا چاہتے ہیں نہایت بہادری کے ساتھ بڑی بڑی اسکیمیں جاری کی ہیں جن سے ممکن ہے کہ امریکا کی ساری زندگی بدل جائے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ "جن لوگوں کو حد سے زیادہ حقوق حاصل ہیں ان سے وہ چھین لئے جائیں گے اور جنھیں حد سے کم حقوق ملے ہیں انھیں اور دے جائیں گے"۔ ممکن ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوں مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ ہمت رکھتے ہیں اور اپنے ملک کو پامال رستوں سے نکال کر نئی راہ پر چلانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی پالیسی کو بدلنے یا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے سے نہیں ڈرتے۔ انگلستان میں مسٹر لائڈ جارج نے ایک "نئے معاشی انتظام" کی تجویز پیش کی ہے۔ ہندوستان میں بھی لیے بہت سے نئے انتظامات کی ضرورت ہے۔ یہ پرانا خیال کہ "جو کچھ جاننا تھا وہ جانا جا چکا اور جو کچھ کرنا تھا وہ کیا جا چکا" مہمل بھی ہے اور خطرناک بھی۔

ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہے اور اس کے لئے جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر موجودہ اجتماعی اور معاشی نظام عام لوگوں کی حالت کو درست نہیں کر سکتا تو کیا اسے باقی رہنے کا حق ہے؟ کیا کسی اور نظام سے عام فلاح کی امید ہو سکتی ہے؟ محض سیاسی تغیر سے کہاں تک بنیادی اصلاح اور ترقی ممکن ہے؟ اگر مستقل حقوق رکھنے والوں کی اغراض نہایت مفید تغیر کی راہ میں حائل ہوں تو کیا عقل اور اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ ان اغراض کو نہ چھیڑا جائے اور عام لوگوں کو بدستور افلاس اور مصیبت میں رہنے دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ اصل مقصد ان حضرات کو نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نقصان

نہ پہنچانے پائیں۔ اگر ان سے مصالحت کرنے کی کوئی صورت ہوتی تو وہ سب سے بہتر تھی۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ مصالحت کو خلاف انصاف سمجھیں مگر اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ مصلحت اسی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ مصالحت کے یہ معنی نہیں کہ مستقل حقوق ایک طبقے سے چھین کر دوسرے کو دے دیئے جائیں۔ جہاں کہیں ممکن اور مناسب ہو ان حقوق کے بدلے معقول معاوضہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ لڑائی کا خرچ اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ مگر بدقسمتی سے تمام تاریخ شاہد ہے کہ مستقل حقوق کے مالک اس طرح کے سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ طبقے جن کی ضرورت اور اہمیت سماج کی زندگی میں ختم ہو چکی ہے نہایت ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔ وہ ایسا جوا کھیلتے ہیں کہ یا تو سب کچھ رہے یا سب کچھ جائے اس لئے وہ رفتہ رفتہ مٹ جاتے ہیں۔

بقول کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لوگ املاک کی ضبطی وغیرہ کے متعلق بہت سی فضول باتیں کیا کرتے ہیں۔ اصل میں موجودہ نظام کی بنیاد املاک کی مسلسل اور مستقل ضبطی سے قائم ہے اور اسی کو ختم کرنے کے لئے اجتماعی تغیرات تجویز کئے جاتے ہیں۔ مزدور جو کچھ اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے اس کا ایک حصہ روزمرہ ضبط ہوتا رہتا ہے۔ کسان کا کھیت اس طرح ضبط کر لیا جاتا ہے کہ لگان اتنا بڑھا دیتے ہیں جسے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ پہلے افراد مشترک زمین کو ضبط کر کے بڑی بڑی جائدادیں بنا لیتے تھے۔ وہ کاشتکار جو اپنی زمین کے مالک ہوتے تھے اسی طرح مٹا دیئے گئے۔ ضبطی موجودہ نظام کی روح رواں ہے۔

اس کی تھوڑی بہت تلافی کرنے کے لئے سوسائٹی یا سماج مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے جو خود ضبطی کی تعریف میں آتی ہیں۔ بھاری ٹیکس، ترکے کے محصول، قرض کو کم کرنے کے قوانین، زر کی مقدار بڑھا کر اس کی قیمت گھٹانا وغیرہ وغیرہ۔ حال میں ہم نہ صرف سوویٹ روس میں بلکہ چوٹی کے سرمایہ دار ملکوں میں قومی قرضے سے انکار کی بڑی بڑی مثالیں دیکھ چکے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں مثال برطانیہ کی ہے جس نے امریکا کا قرضہ چکانے سے انکار کر دیا۔ اور یہ مثال ہندوستان کے سامنے پیش کرتا بہت خطرناک ہے۔ مگر ان سب ضبطیوں اور انکار قرضہ

سے بہت کم فائدہ ہوتا ہے اور بنیادی خرابی دور نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کو دور کئے ہوئے نیا نظام قائم کرنا ناممکن ہے۔ موجودہ نظام کو بدلنے کا جو طریقہ سوچا جائے اس میں یہ اندازہ کر لینا چاہیئے کہ ہمیں اس کے لئے کتنا مادی اور روحانی نقصان اٹھانا پڑیگا اور اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔ ناعاقبت اندیشی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے آخر میں انسان کی مادی اور روحانی خوشی اور ترقی میں کہاں تک مدد ملے گی۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اگر موجودہ نظام نہ بدلا جائے اور اپنی ناکام اور نامراد زندگی، فاقے اور مصیبت، اخلاقی اور روحانی ذلت کا بوجھ بدستور اٹھاتے رہیں تو اس سے کس قدر شدید نقصان ہوگا۔

موجودہ معاشی نظام بار بار آنے والے سیلاب کی طرح بے شمار انسانوں کو بہائے جاتا ہے اور ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر ہم میں سے کچھ لوگ ڈول بھر بھر کے پانی نکالیں تو نہ اس سے یہ سیلاب رک سکتا ہے اور نہ لوگوں کی جانیں بچ سکتی ہیں۔ یہاں پشتے باندھنے اور نہریں بنانے کی ضرورت ہے تاکہ پانی کی مہلک قوت انسان کی فلاح کا ذریعہ بن جائے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اشتراکیت جو عظیم الشان تبدیلیاں کرنی چاہتی ہے وہ دو چار قانون پاس کر دینے سے نہیں ہو سکتیں۔ مگر پھر بھی اس عمارت کی بنا رکھنے کے لئے کچھ بنیادی قوانین اور حقوق ضروری ہیں۔ اگر ہمیں اشتراکی نظام کی تعمیر شروع کرنی ہے تو اس سے کام نہیں چل سکتا کہ ہم اتفاقات کے بھروسے پر بیٹھے رہیں یا کبھی جوش آجائے تو دیوار پر دو چار ردّے رکھ کر چھوڑ دیں کہ وہ گر جائے۔ پہلے بڑی بڑی رکاوٹوں کو دور کرنا پڑے گا۔ اصل مقصد امیروں سے چھیننا نہیں بلکہ غریبوں کو دینا ہے، موجودہ تنگدستی کی جگہ خوش حالی پیدا کرنا ہے۔ مگر اس کے حاصل کرنے کے لئے لوگوں کی ذاتی اغراض کو جو سماج کی ترقی میں حائل ہیں راہ سے ہٹانا پڑے گا۔ راہ کے انتخاب میں ہمارے پسند کرنے یا ناپسند کرنے سے بحث نہیں بلکہ یہ مجرد انصاف کا بھی سوال نہیں۔ یہاں تو یہ دیکھنا ہے کہ ایسی چیز ہو جو معاشی حیثیت سے معقول ہو، ترقی پذیر ہو، ماحول سے مطابقت رکھتی ہو اور انسانوں کی بڑی

سے بڑی جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہو۔

مختلف اغراض میں تصادم ہونا ناگزیر ہے۔ مصالحت کی کوئی صورت نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ہم ادھر ہوں یا اُدھر۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے مسئلے کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اشتراکیت کو مقبول بنانے کے لئے محض جذباتی اثر ڈالنا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ ذہنی اور عقلی اثرات بھی ہونے چاہئیں جو واقعات اور دلائل پر مبنی ہوں۔ مغرب میں اس قسم کی بہت سی کتابیں موجود ہیں مگر ہندوستان میں ان کی بڑی کمی ہے اور بہت سی اچھی کتابیں یہاں داخل نہیں ہونے پاتیں۔ مگر دوسرے ملکوں کی کتابیں پڑھنا کافی نہیں۔ اگر ہندوستان میں اشتراکیت قائم ہوتی ہے تو وہ یہیں کے حالات کے مطابق نشو و نما پائے گی اس لئے ان حالات کا مطالعہ کرنا نہایت اہم ہے۔ ہمیں ماہرینِ فن کی ضرورت ہے جو مطالعہ کر کے مفصل تجویزیں پیش کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ماہرینِ فن سرکار کے یا نیم سرکاری یونیورسٹیوں کے ملازم ہیں اور وہ اس راہ میں قدم بڑھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اشتراکیت کے لئے ذہنی بنیاد کافی نہیں۔ مگر یہ بھی یقینی ہے کہ اس بنیاد کے بغیر ہم معاملات پر پورا قابو حاصل نہیں کر سکتے اور کسی قوی تحریک کو نہیں چلا سکتے۔ اس وقت زراعتی مسئلہ ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے مگر صنعت بھی اس سے کچھ کم نہیں اور پھر وہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس قسم کی ریاست چاہتے ہیں، کسان ریاست یا صنعتی ریاست؟ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں غالب رنگ کاشتکاری کا ہوگا مگر میرے خیال میں اس کے ساتھ ساتھ صنعت کو ترقی دینا بھی ممکن ہے۔

ہماری صنعت کے ناخدا عجیب فرسودہ خیالات رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے سرمایہ داروں سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ عام لوگ اس قدر مفلس ہیں کہ یہ حضرات ان سے مطلق توقع نہیں رکھتے کہ وہ آگے چل کر صنعتی پیداوار کے خریدار ہوں گے اس لئے وہ مزدوروں کی اجرت بڑھانے یا کام کا وقت کم کرنے کی تجاویز کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ حال میں

پارچہ بافی کے کارخانوں میں کام کا وقت دس گھنٹے کے بجائے نو گھنٹے کر دیا گیا ہے۔ اس پر احمد آباد کے کارخانہ داروں نے مزدوروں کی اجرت یہاں تک کہ ٹھیکے کے کام کی اجرت بھی کم کر دی یعنی کام کا وقت کم ہونے سے بے چارے مزدوروں کی آمدنی کم ہو گئی اور ان کا معیار زندگی اور بھی گھٹ گیا۔ صنعت کی عقلی تنظیم بڑھ رہی ہے جس سے مزدور پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے اور وہ زیادہ تھکتا ہے مگر اس کی اجرت میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہوا۔ ہمارے ارباب صنعت کا تخیل وہ ہے جو یورپ میں انیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ انھیں جب موقع ملتا ہے خوب نفع کماتے ہیں مگر مزدور وہی موچی کے موچی رہتے ہیں۔ جب مندا ہوتا ہے تو مالک شور مچاتے ہیں کہ اجرت کم کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ انھیں نہ صرف ریاست مدد دیتی ہے بلکہ ہمارے اوسط طبقے کے سیاست داں بھی۔

احمد آباد کے پارچہ باف مزدوروں کی حالت پھر بھی غنیمت ہے بمبئی وغیرہ میں تو بہت برا حال ہے اور بنگال کے جوٹ کے بافکان کنی کے مزدور ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ سب سے پست درجہ چھوٹی چھوٹی غیر منظم صنعتوں میں کام کرنے والوں کا ہے۔ اگر کوئی جوٹ اور پارچہ بافی کے کارخانوں کے کروڑپتی مالکوں کے محلوں اور ان کی شان و شوکت کا مقابلہ ان جھونپڑیوں سے کرے جن میں ان کارخانوں کے نیم برہنہ مزدور رہتے ہیں تو اسے بڑی عبرت اور بصیرت حاصل ہو مگر ہم اس تضاد کے منظر کو معمولی چیز سمجھ کر اس سے گذر جاتے ہیں اور مطلق متاثر نہیں ہوتے۔

صنعتی مزدوروں کی یہ گئی گذری حالت آمدنی کے لحاظ سے کسانوں کی حالت سے پھر بھی بہتر ہے۔ مگر کسان کو ایک فائدہ ہے۔ وہ کھلی ہوا میں رہا کرتا ہے اور شہر کے غریب پوروں کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر وہ اس قدر گر گیا ہے کہ اپنے کھلے ہوادار گاؤں کو یہ قول گاندھی جی کے "گھورا" بنا دیتا ہے۔ اس میں اتحاد عمل یعنی مل جل کر سب کے فائدے کے لیے کام کرنے کا مادہ بالکل نہیں ہے۔ اسے اس الزام میں برا بھلا کہنا

سہل ہے مگر وہ غریب کیا کرے، جب زندگی اس کے لئے ایک مسلسل اور شدید انفرادی کشمکش بن گئی ہو اور ہر شخص اس کا دشمن ہو؟ سچ پوچھئے تو یہی سخت تعجب کی بات ہے کہ وہ بسر کیوں کر کرتا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں پنجاب کے کاشتکار کی روزانہ آمدنی کا اوسط ۹ آنے تھا اور ۳۱-۱۹۳۰ء میں نو پائی یعنی تین پیسے رہ گیا۔ اور پھر پنجاب کے کاشتکار صوبہ متحدہ، بہار اور بنگال کے کسانوں سے زیادہ خوشحال سمجھے جاتے ہیں۔ صوبہ متحدہ کے بعض مشرقی اضلاع (گورکھپور وغیرہ) میں کسادبازاری سے پہلے کھیت کے مزدور کی اجرت دو آنے روز تھی۔ یہ کہنا کہ ان افسوسناک حالات کی اصلاح خیرات وحسنات سے یا دیہی ترقی کی مقامی کوششوں سے ہوسکتی ہے کسان اور اس کی مصیبتوں کی ہنسی اڑانا ہے۔

آخر اس دلدل سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟ کروروں آدمیوں کو اس پستی سے ابھارنا سہل نہیں پھر بھی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچی جاسکتی ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ ارباب غرض ہر تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں اور بیرونی سلطنت کے ماتحت رہ کر کسی قسم کا تغیر ناممکن ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آنے والے زمانے میں ہندوستان کون سا رخ اختیار کرتا ہے۔ زمانے کا رجحان زیادہ تر کمیونزم یعنی اشتمالیت اور فاشزم یعنی قومی اشتراکیت کی طرف ہے۔ جو پارٹیاں ان دونوں کے بین بین ہیں وہ گھٹتی جاتی ہیں۔ سرمالکم ہیلی کی پیش گوئی ہے کہ ہندوستان قومی اشتراکیت اختیار کرے گا۔ غالباً مستقبل قریب میں ایسا ہی ہوگا جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔ ابھی سے بنگال اور ایک حد تک دوسرے صوبوں کے نوجوان مردوں اور عورتوں میں قومی اشتراکیت کے نمایاں رجحان نظر آرہے ہیں۔ چونکہ قومی اشتراکیت انتہائی تشدد سے وابستہ ہے اس لئے بزرگان کانگرس، جو عدم تشدد کے پابند ہیں، قدرتی طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر قومی اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیاد یعنی ایک اجتماعی ریاست کا تصور، جس میں اونچے طبقوں کے مستقل حقوق مقید اور محدود کردئے جائیں گے مگر چھینے نہیں جائیں گے، غالباً انھیں پسند آئے گا۔ پہلی نظر میں پرانے اور نئے امتزاج کی یہ صورت بہت دلکش

علوم ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ یہ صورت جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے ممکن بھی ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ قومی اشتراکیت کی تائید اصل میں اوسط طبقے کے نوجوانوں کی طرف سے ہوگی۔ ہندوستان میں بالفعل انقلاب پسند مزدور کسان نہیں بلکہ اوسط طبقے ہی کے بعض لوگ ہیں اگرچہ آگے چل کر کارخانوں کے مزدور یقیناً ان سے کہیں زیادہ انقلاب پسند ہو جائیں گے۔ قومیت پسند اوسط طبقہ فاشزم کے خیالات پھیلنے کے لیے بہت عمدہ میدان ہے۔ مگر فاشزم مغربی معنوں میں یہاں اس وقت تک نہیں پھیل سکتا جب تک بیرونی حکومت موجود ہے۔ ہندستان میں فاشزم یا قومی اشتراکیت یقیناً اپنے ملک کی آزادی کی حامی ہوگی اور وہ کسی طرح برطانوی حکومت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اُسے جمہور سے مدد لینی پڑے گی۔ اگر برطانوی قبضہ بالکل ہٹ جائے تو غالباً قومی اشتراکیت اونچے اوسط طبقے اور دوسرے مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی مدد سے بہت جلد پھیل جائے گی۔

مگر برطانیہ کا قبضہ اس قدر جلد ہٹنے والا نہیں اور اس اثنا میں حکومت کی انتہائی سختیوں کے باوجود اشتمالیت اور اشتراکیت کے خیالات بھی پھیل رہے ہیں۔ اشتمالی پارٹی ہندوستان میں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے اور اس میں اشتمالیت کے ہمدرد اور انتہا پسندانہ پروگرام رکھنے والی مزدوروں کی انجمنیں بھی سمیٹ لی جاتی ہیں۔

قومی اشتراکیت اور اشتمالیت میں سے میری ہمدردی سراسر اشتمالیت کے حق میں ہے جیسا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو گیا ہوگا میں خود اشتمالی نہیں ہوں۔ میرے خیالات کی جڑیں شائد اب بھی ایک حد تک انیسویں صدی میں پیوست ہیں اور مجھ پر "تہذیب انسانیت" کی تعلیم کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ میں اس سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا۔ اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی اور قدرتی طور پر بہت سے اشتمالی اس سے خفا ہیں۔ میں اذعانی عقائد کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے مجھے یہ چیز جو اشتمالیوں کی خصوصیت ہے ناپسند

ہے کہ کارل مارکس کی تصانیف یا اور کتابیں وحی آسمانی سمجھی جائیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں اور فرقہ بندی کر کے منکروں کے خلاف جہاد کیا جائے اسی طرح روس کی بہت سی کارروائیاں، خصوصاً امن کے زمانے میں تشدد سے کام لینا مجھے سخت ناپسند ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اشتمالی فلسفے کی طرف میرا رجحان روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ مارکس کے بعض اقوال اور اس کا اخلاقی اقدار کا نظریہ غلط ہو۔ میں اس کا فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ مگر میرے خیال میں وہ اجتماعی امور میں گہری بصیرت رکھتا تھا، اور یہ بصیرت اس علمی طریقے پر مبنی تھی جو اس نے اختیار کیا تھا۔ یہ طریقہ تاریخ اور موجودہ حالات دونوں کے سمجھنے میں اور طریقوں سے کہیں زیادہ مفید ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو تغیرات آج کل ہو رہے ہیں ان کا سب سے گہرا اور روشن مطالعہ پیروانِ مارکس کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ یہ کہہ دینا سہل ہے کہ مارکس ان رجحانات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکا جو آگے چل کر ظاہر ہوئے مثلاً اوسط طبقے میں انقلابی عنصر کا پیدا ہونا جو آج کل اس قدر نمایاں ہے مگر میرے خیال میں مارکس کے فلسفے کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں اذعانیت کا نام تک نہیں بلکہ تمام مسائل کو سمجھنے کے عقلی اور علمی طریقے پر زور دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ عملی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ طریقہ ہمیں اپنے زمانے کے اجتماعی مظاہر کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور عمل اور تدبیر کی راہ دکھاتا ہے۔

طریق عمل بھی اس کے یہاں معین اور محدود نہیں بلکہ حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔ کم سے کم لینن کی یہی رائے تھی اور اس نے نہایت قابلیت سے بدلتے ہوئے حالات کی مناسبت سے اپنے عمل کو بدل کر اسے صحیح ثابت کر دیا۔ وہ کہتا ہے "جدوجہد کے کسی خاص طریقے کو رد یا قبول کرنا، بغیر اس کے کہ موجودہ صورت حال کی تفصیلات پر موقع اور محل کے لحاظ سے غور کیا جائے، مارکس کے اصول سے صریحی انحراف ہے۔" ایک اور جگہ اس نے کہا ہے "کوئی چیز آخری اور قطعی نہیں۔ ہمیں ہمیشہ حالات سے سبق لینا چاہئے۔"

اس وسیع اور ہمہ گیر طرزِ خیال کی وجہ سے، معقول پسند اشتمالیوں میں، ایک حد تک اجتماعی
)، کا ایک نامی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ سیاست ان کے نزدیک محض ابن الوقتی یا اندھیرے
ڈ لنے کا نام نہیں۔ جو مقصد اور نصب العین ان کے سامنے ہے وہ ان کی جد و جہد اور
دں میں ایک معنویت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ انھیں یہ احساس ہے کہ ہم ایک عظیم الشان
کے سپاہی ہیں جو نوعِ انسانی کی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "ہم
خ کی رفتار کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں"۔

غالباً اکثر اشتمالی یہ احساس نہیں رکھتے۔ شاید لینن ہی ایک شخص تھا جو نامی زندگی کا
تصور رکھتا تھا اور اسی وجہ سے اس کا عمل اس قدر موثر تھا۔ مگر کچھ تھوڑی سی جھلک اس
رکی ہر اشتمالی کے ذہن میں، جس نے لینن کے فلسفے کو سمجھ لیا ہے، موجود ہے۔

بہت سے اشتمالی ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ نبھانا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے دوسروں
ذاہ مخواہ چھیڑ کر غصہ دلانے کا ایک عجیب طرز اختیار کر لیا ہے۔ مگر ان بے چاروں نے بہت
یبتیں اٹھائی ہیں اور سوائے سوویٹ یونین کے اور سب کہیں انھیں بڑی سخت مشکلات
سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں ان کی بہادری اور ایثار کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ وہ اور کروڑوں
سیوں کی طرح تکلیفیں سہتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ وہ تقدیر کی زبردست قوت کے آگے
نہیں جھکاتے۔ وہ ان تکلیفوں کا مقابلہ انسانوں کی طرح کرتے ہیں اور اس میں ایک المناک
ظمت و وقار کی شان ہے۔

روس کے اجتماعی تجربات کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کا مارکس کے نظریے
یا قدر و قیمت پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بات تصور میں آ سکتی ہے گو یہ بہت بعید
ز قیاس ہے، کہ بعض مخالف حالات یا بعض قوتوں کے اتحاد سے یہ تجربات ناکام رہیں۔
پھر بھی اس زبردست انقلاب کی اہمیت باقی رہے گی۔ باوجود اس کے کہ مجھے اس کی
بہت سی باتیں ناپسند ہیں میرا خیال ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے ایک شمعِ امید

روشن کردی ہے۔ میں کافی معلومات نہیں رکھتا اس لئے مجھے اس پر نکتہ چینی کرنے کا حق نہیں۔ سب سے بڑا خوف مجھے یہ ہے کہ جبر و تشدد کی جو فضا قائم ہو گئی ہے اس کا انجام اچھا نہیں اور اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ مگر جو لوگ روس کی قسمت کے مالک ہیں ان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نئی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ نصب العین ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان کی جد و جہد بالکل بے کار ثابت ہوئی۔ مگر غالباً یہ اب بہت کم کر دی گئی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اشتمالیت اور اشتراکیت کا زمانہ ابھی بہت دور ہے۔ ہاں اگر خارجی واقعات کی رو ہمیں آگے بڑھائے جائے تو اور بات ہے۔ ابھی تو ہمیں اشتمالیت سے نہیں بلکہ فرقہ پرستی سے نبٹنا ہے۔ فرقہ وارانہ زندگی کے لحاظ سے ہندوستان ظلمت کے دور سے گذر رہا ہے۔ ارباب عمل اپنی قوت کو چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سازشوں اور چالوں میں، ایک دوسرے کو زک دینے میں ضائع کر رہے ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو دنیا کی ترقی اور بہتری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاید یہ ایک عارضی حالت ہے جو بہت جلد گذر جائے گی۔

کانگرس نے اتنا ضرور کیا کہ مجموعی طور پر اس تاریک فضا سے دور رہی مگر اس کی ذہنیت چھوٹے طبقے کے شہریوں کی ہے اور اسی رنگ میں اس نے فرقہ وارانہ مسئلے اور دوسرے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے کامیابی ہونے کی امید نہیں آج کل وہ نیچے اوسط طبقے کے خیالات کی نمائندگی کر رہی ہے کیونکہ بالفعل یہی طبقہ سب سے زیادہ انقلاب پسند ہے اور سب سے زیادہ احتجاج کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اس میں اتنی زندگی نہیں ہے جتنی دیکھنے میں معلوم ہوتی ہے۔ اس پر دونوں طرف سے دو قوتوں کا نرغہ ہے۔ ان میں سے ایک بہت مستحکم ہے اور دوسری کمزور ہے مگر اس کی قوت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس میں

آج کل بحران کی یہی کیفیت ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ آگے چل کر اس کا کیا انجام ہوگا۔ وہ غالب قوت کا ساتھ نہیں دے سکتی جب تک ہندوستان کو آزادی دلانے کا کام، جو اس کا تاریخی مشن ہے، پورا نہ کر دے۔ مگر اس مقصد کے حاصل ہونے سے پہلے ممکن ہے کہ اور قوتیں بڑھ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیں یا اس کو ہٹا کر اس کی جگہ لے لیں۔ بہر حال اغلب یہی ہے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائے کانگرس اس کی سیاست پر حاوی رہے گی۔

کوئی تشدد کا طریقہ اختیار کرنا بالکل خارج از بحث ہے۔ یہ محض قوت کا ضائع کرنا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ میرے خیال میں یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے اگرچہ اکا دکا مثالیں انفرادی تشدد کی بھی نظر آجاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ دونوں طرف سے تشدد پر تشدد ہو اور اگر ہم اس چکر میں پھنس گئے تو پھر اس سے نکلنا بہت مشکل ہوگا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمیں "آپس میں متحد ہو کر دشمن سے مقابلہ" کرنا چاہیے۔ مسز نائڈو شاعرانہ جوش اور طاقت سے اس کی تاکید کرتی رہتی ہیں۔ وہ شاعرہ ہیں اور اتحاد اور ہم آہنگی کی خوبیاں بیان کرنا ان کا حصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ آپس میں متحد ہونا بڑی اچھی چیز ہے بہ شرطیکہ اس کے ساتھ "دشمن سے مقابلہ" بھی ہو۔ مگر جب اس فقرے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اونچے طبقے کے چند آدمیوں میں کسی قسم کا معاہدہ یا مصالحت ہو جائے۔ اس قسم کے اتحاد میں یہی ہوگا کہ جو لوگ سب سے زیادہ محتاط اور اعتدال پسند ہیں ان کا رنگ چھا جائے۔ متحدہ مقابلے کی جگہ متحدہ پسپائی کا منظر نظر آئے گا۔

یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اتحادِ عمل یا مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ زندگی اور سیاست بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ اس میں ہمیشہ سیدھی لکیروں کی شکلیں نہیں بن سکتیں۔ لینن جیسے سخت آدمی نے کہا تھا کہ "بغیر مڑے ہوئے آگے بڑھے چلے جانا،

مصالحت کا نام نہ لینا محض بچپن ہے انقلابی طبقے کی سنجیدہ حکمت عملی نہیں'' مصالحت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ ہمیں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مگر خواہ ہم مصالحت کریں یا نہ کریں اصل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں مقدم ہیں وہ ہمیشہ مقدم رہیں کمتر درجے کی چیزیں ان سے زیادہ اہمیت نہ حاصل کرنے پائیں۔ اگر ہم اپنے اصول و مقاصد پر قائم ہیں تو عارضی سمجھوتوں سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ خطرہ تو یہ ہے کہ کہیں ہم اپنے کمزور بھائیوں کے خفا ہو جانے کے ڈر سے اصول اور مقاصد میں ڈھیل نہ ڈال دیں۔ لوگوں کو گمراہ کرنا انھیں خفا کرنے سے بدتر ہے۔

میں نے موجودہ واقعات کا ذکر مبہم اور ایک حد تک خشک منطقی طریقے سے کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ ان چیزوں کو اس طرح دیکھوں جیسے ایک شخص دور سے تماشا دیکھتا ہو۔ عموماً جب عمل کا موقع آتا ہے تو میں تماشائیوں کی صف میں نہیں ہوتا ہوں بلکہ مجھ پر تو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں بے ضرورت میدان میں کود پڑتا ہوں۔ اس وقت اگر میں آزاد ہوتا تو کیا کرتا؟ اپنے ہم وطنوں کو میں کیا مشورہ دیتا؟ شاید وہ جبلی احتیاط جو سیاسی آدمیوں میں ہوتی ہے مجھے اپنی رائے قبل از وقت ظاہر کرنے سے روکتی ــــ مگر سچ پوچھیے تو نہ میں نے کوئی رائے قائم کی ہے اور نہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تو خواہ مخواہ الجھن میں کیوں پڑوں؟ یوں تو مجھے الجھن رہتی ہے مگر جب تک جیل میں ہوں، یہ کوشش کرتا ہوں کہ کم سے کم فوری جدوجہد کے مسئلے میں سر نہ کھپاؤں۔

جیل میں جدوجہد ایک دور از کار چیز معلوم ہوتی ہے۔ انسان عمل کا ناخدا نہیں رہتا بلکہ موج حوادث کی کشتی بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت انتظار میں رہتا ہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ میں ہندوستان اور ساری دنیا کے سیاسی اور اجتماعی مسائل سے بحث کرتا ہوں مگر سچ پوچھیے تو یہ چیزیں جیل کی اس چھوٹی سی دنیا میں جو ایک مدت سے میرا گھر ہے کیا اہمیت رکھتی ہیں؟ قیدیوں کو تو بس ایک ہی چیز کی فکر ہوتی ہے یعنی اپنی رہائی کی تاریخ کی۔

نی کے جیل میں اور یہاں المورٹے میں بہت سے قیدی میرے پاس آکر بڑے
اق سے "جگلی" کے متعلق سوال کرتے تھے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چیز ہے
پر معلوم ہوا کہ یہ جوبلی کی خرابی ہے۔ انھوں نے شاہ جارج کی سلور جوبلی کے جشن کی
ہیں سنی تھیں مگر وہ اس کی حقیقت سے واقف نہ تھے۔ پہلے کی سنی سنائی باتوں کی بنا
ہ اس کے صرف ایک ہی معنی سمجھتے تھے، بعض قیدیوں کو رہائی ملنا اور بہتوں کی سزا
نفیف ہونا۔ اسی وجہ سے سب قیدی، خصوصاً وہ جنھیں لمبی سزائیں ملی ہیں، آنے والی
گلی" سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے "جگلی" دستور اساسی کی اصطلاحات، پارلیمنٹ
قوانین، اشتراکیت اور اشتمالیت ان سب سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

(۶۸)

خاتمہ

"ہمیں سعی کی تاکید کی گئی ہے مگر سعی کا پورا کرنا ہمارے نصیب میں نہیں۔"

(تالمود)

میری کہانی ختم ہو گئی۔ سفرِ زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ فروری ۱۹۳۵ء تک الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہو گئے۔ تین مہینے ہوئے میں نے اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی اور غالباً ابھی میری زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آگیا تو میں بھی بہت دن جیوں گا۔ لیکن آنے والی زندگی جب تک بیت نہ جائے اس کا حال کیونکر لکھا جا سکتا ہے۔

شائد میری سرگذشت لوگوں کو ہیجان خیز نہ معلوم ہو۔ جس کی عمر قید میں کٹی ہو اس کی زندگی میں ہیجان خیز واقعات کہاں سے آئیں؟ سچ پوچھئے تو میری کہانی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں اور عورتوں پر بھی گذری۔ بدلتی ہوئی کیفیتوں، امیدوں اور مایوسیوں، شگفتگی اور افسردگی، سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فرد قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی اس پر اثر ڈالا، کبھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح،

میں ایک جداگانہ شخصی زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ میں رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔ یوں تو ہم لوگ اکثر ہنستے بھی تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے جو ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی کا تجربہ ہوتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم نصب العین کو ترک کر کے غالب قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا ہوں۔ یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے اپنے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعے میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گذرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کروں جو اس وقت میرے دل میں تھے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اگلے حالات کے بیان میں پچھلے خیالات کا رنگ آ گیا ہوگا مگر جو مقصد میرے پیش نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی بصیرت کے لئے اپنی ذہنی نشو و نما کا نقشہ کھینچوں۔ شائد میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں دکھا سکا جیسا میں واقعی تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہونا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے سر ج۔ ب۔ راماسوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی، تصور پرستی اور جوش عقیدت کی وجہ

ہے، جو بہ قول ان کے محض "فریبِ نفس" ہے، اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص "فریبِ نفس" میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس ذاتی معاملے میں ج۔ سپ۔ سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، مگر اب سے بہت پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ وہ ترقی کے مدارج طے کر کے آسمان پر پہنچ گئے اور میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا۔ اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ وہ آج کل، خصوصاً پچھلے چند سال سے، ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواں، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومت مطلق کے حامی، اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے چشم و چراغ ہیں۔ غالباً ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلافِ رائے ہے مگر ایک جزوی چیز میں ہم دونوں متفق ہیں۔ ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہوں۔ مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھیے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں اور میرا دل کہتا ہے نہیں، کسی کا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس اور محبت رکھتے ہیں۔ مشرق یا مغرب کا معجونِ مرکب بن کر نہ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ غالباً میرے خیالات اور تصورِ حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبقے میں برہمنوں کی سیکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوئی ہیں۔ نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا ہوں نہ جدید خیالات سے۔ یہ دونوں میری سیرت کا جز بن گئے ہیں اور اگرچہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے کام آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ انھوں نے میرے دل میں روحانی تنہائی کا احساس پیدا کر دیا ہے جو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا رہتا ہے۔ مغرب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح

نہیں کھپ سکتا۔ مگر بعض اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے بدیسی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جائیے اتنا ہی راستہ کٹھن ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دور ہٹتی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بے کار نہیں، اس میں بجائے خود ایک لطف ہے۔ شاید زندگی کی قدر وقیمت سعی پر منحصر ہے انجام پر نہیں۔ اکثر راستے کا ڈھونڈھنا مشکل ہوتا ہے مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر چلے تب بھی غنیمت ہے۔

نہایت عجز و انکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لئے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ مگر یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا برا ہے اور جس چیز میں بھلائی کا احتمال ہو اسے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے۔"

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کئے! کتنے موسم آئے اور چلے گئے، کتنے چاند بڑھے اور گھٹ گئے۔ ستارے بڑے ثبات اور وقار سے اپنے مسیر پر چلتے رہے اور میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا رہا۔ میری جوانی کے بے شمار دن یہاں دفن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں، گذرے ہوئے زمانے کی تلخیاں یاد دلاتے ہیں اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں "اس سے کچھ حاصل بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گذری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کروں، اپنے پچھلے کاموں میں بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کر دوں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔ سچ پوچھیے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا۔ میں خود ان کے آگے بے بس ہوں۔ یہ فیصلے میں نے نہیں کئے بلکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔

مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہو گیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس گذر چکا ہے

اور ابھی پورے بارہ ــــ باقی ہیں۔ اس بار تخفیف کی کوئی امید نہیں۔ قید محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے باہر گزارے تھے محسوب نہیں ہوئے بلکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا دئے گئے۔ مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گذر جائے گا اور میں رہا ہو جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب ختم ہو گیا اور دوسرا باب شروع ہو گا۔ اس میں کیا مضمون ہو گا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ کتاب زندگی کے اگلے ورق سر بمہر ہیں۔

تتمہ

باڈن وائلر، شوارٹس والڈ (جرمنی)

۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مئی میں میری بیوی مزید علاج کے لئے بھوالی سے یورپ روانہ ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا بھوالی جانا بند ہو گیا اور پندرھویں دن جیل سے باہر نکل کر پہاڑی سڑکوں سے گذرنے کا جو موقع ملتا تھا وہ جاتا رہا۔ مجھے اس کا بڑا قلق ہوا اور الموڑے کا جیل اور بھی سنسان معلوم ہونے لگا۔

کوئٹے کے زلزلے کی خبر آئی اور اس نے کچھ دن کے لئے اور سب چیزوں کو بھلا دیا۔ مگر حکومت اپنی انوکھی حرکتوں کی یاد لوگوں کے دل سے محو نہیں ہونے دیتی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد کو، جن سے زیادہ زلزلے کے امدادی کام کی واقفیت ہندوستان میں کوئی نہیں رکھتا، اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ کوئٹے جا کر امدادی کام میں شریک ہوں۔ اسی طرح گاندھی جی اور دوسرے مشہور لیڈر بھی وہاں جانے سے روک دیئے گئے۔ بہت سے ہندوستانی اخباروں کی ضمانت اس جرم میں ضبط کر لی گئی کہ انھوں نے کوئٹے کے متعلق مضامین لکھے۔ ہر جگہ یہی فوج اور پولس کی ذہنیت نظر آتی ہے چاہے اسمبلی ہو، یا سول حکومت، یا سرحد پر گولہ باری کرنے والا توپ خانہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کی بہت بڑی جماعت میں ایک مستقل جنگ چھڑی رہتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پولس ایک مفید اور ضروری چیز ہے لیکن اگر دنیا میں پولس کے سپاہیوں اور پولس کے ڈنڈوں کے سوا کچھ نہ ہو تو شائد انسان کو اس میں رہنا دوبھر ہو جائے۔ یہ ایک مشہور قول ہے کہ جو شخص دوسروں پر بے اندازہ تشدد کرے وہ صرف انھیں

کو پست اور ذلیل نہیں کرتا بلکہ خود بھی پست اور ذلیل ہوتا ہے۔ آج ہندوستان میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے حکام، خصوصاً سول سروس والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا اثر سب سے زیادہ بڑے افسروں میں نظر آتا ہے مگر ایک حد تک تمام سرکاری افسروں میں پھیل گیا ہے۔ جب کبھی کوئی بڑی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس کے لئے ہمیشہ وہ شخص منتخب کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

۴ ستمبر کو میں اچانک الموڑا جیل سے رہا کر دیا گیا کیونکہ یہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ جرمنی کے علاقے شوارتس والڈ میں باڈن وائلر کے مقام پر زیر علاج تھیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ تمہاری سزا ملتوی کی جاتی ہے اور مجھے اپنی میعاد کے ختم ہونے سے ساڑھے پانچ مہینے پہلے رہائی مل گئی۔ میں انتہائی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔

یورپ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف جنگ اور شورش کا خوف ہے دوسری طرف معاشی تباہی کا ڈر ہے۔ حبش پر چڑھائی ہو رہی ہے اس کے باشندوں پر گولے برسائے جا رہے ہیں، شہنشاہی پسند سلطنتوں میں ان بن ہے اور وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہی ہیں۔ انگلستان، جو سب سے بڑی شہنشاہی قوت ہے، ایک طرف صلح و امن اور انجمن اقوام کے قانون کی حمایت کر رہا ہے اور دوسری طرف اپنی محکوم قوموں کو پیس رہا ہے اور ان پر گولہ باری کر رہا ہے۔ مگر یہاں شوارتس والڈ میں امن اور سکون چھایا ہوا ہے اور نازیوں کی سواستکا بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ میں اس کہر کو دیکھ رہا ہوں جو آہستہ آہستہ وادی پر چھا رہا ہے۔ فرانس کی سرحد، جو یہاں سے بہت دور ہے نظر سے چھپتی جاتی ہے اور سارے منظر پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے۔ میں دل میں سوچتا ہوں کہ خدا جانے اس کہر کے پیچھے کیا ہے۔

ضمیمہ الف

وہ حلف جو یوم آزادی کو اٹھایا گیا

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اور قوموں کی طرح ہندوستانی قوم کا لازمی حق ہے کہ وہ آزاد ہو، اس کی محنت کا پھل اسی کے پاس رہے اور اسے وہ چیزیں میسر ہوں جو زندگی کے لئے ضروری ہیں تاکہ اسے پنپنے اور بڑھنے کا پورا پورا موقع ملے۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم کو ان حقوق سے محروم کرے اور اس پر ظلم کرے تو قوم کو حق ہے کہ اس حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانی قوم کو نہ صرف آزادی سے محروم کر دیا ہے بلکہ اس نے اپنی بنا اس پر قائم کی ہے کہ عام لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس نے ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی حیثیت سے برباد کر دیا ہے اس لئے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کرے اور پورن سوراج یعنی کامل آزادی حاصل کرے۔

معاشی حیثیت سے ہندوستان تباہ کر دیا گیا ہے۔ ہم سے جو محصول وصول کئے جاتے ہیں وہ ہماری آمدنی کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روزانہ ہے اور جو بھاری محصول ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں سے بیس فی صدی لگان کی صورت میں کسانوں سے وصول کئے جاتے ہیں اور تین فی صدی نمک کے محصول سے جس کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔

دیسی صنعتیں مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا مٹا دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے

کسان کم سے کم سال میں چار مہینے بے کار رہتے ہیں اور دستکاری کا شغل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں۔ بہ خلاف دوسرے ملکوں کے یہاں ان برباد شدہ صنعتوں کی کسی صورت سے تلافی نہیں کی گئی۔

چنگی کی شرح اور روپے کی قیمت اس ترکیب سے مقرر کی گئی کہ کسانوں پر اور زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ ہماری درآمد کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے کارخانوں کا بنا ہوا مال ہے۔ چنگی کی شرح سے برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ کھلم کھلا رعایت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ غریبوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ مسرفانہ حکومت کے چلانے میں۔ اس سے بھی زیادہ اندھیر یہ ہے کہ شرح مبادلے میں اس ڈھب سے مداخلت کی گئی کہ کروروں روپیہ ملک سے کھنچ کر باہر چلا گیا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اتنا پست کبھی نہیں تھا جتنا برطانوی حکومت میں ہے۔ اصلاحات کے ذریعے سے لوگوں کو کوئی حقیقی سیاسی اختیارات حاصل نہیں ہوئے۔ ہمارے بڑے سے بڑے آدمی کو بدیسی حکومت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ ہم رائے کی آزادی اور میل جول کی آزادی کے حق سے محروم رکھے گئے اور ہمارے بہت سے بھائی جلا وطن کر دئے گئے اور انھیں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں۔ ہماری انتظامی قابلیت فنا کر دی گئی اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ ہم مجموعی طور پر چوکیداری اور محرری پر قناعت کرنے لگے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے موجودہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے لنگر سے چھڑا کر ڈانواں ڈول کر دیا اور ہمیں یہ سکھایا کہ غلامی میں مگن رہیں۔

روحانی اعتبار سے ہتھیار چھن جانے نے ہمیں نامرد بنا دیا اور بیرونی فوج کی موجودگی نے بڑی بے دردی سے ہماری دفاعی قوت کو کچل دیا اور ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہم خود اپنی حفاظت اور بیرونی حملے کی مدافعت نہیں کر سکتے بلکہ اپنے گھر بار کو چوروں، ڈاکوؤں اور بد معاشوں کے حملے سے بھی نہیں بچا سکتے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جس حکومت نے ان چار طریقوں سے ہمارے ملک کو برباد کیا
طاعت کرنا انسانیت کی ذلت اور خدا کی نافرمانی ہے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تشدد
لیے آزادی حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ نہیں ہے، اس لیے ہم یہ طریقہ
یں گے کہ جہاں تک ممکن ہے برطانوی حکومت سے بالارادہ کوئی تعلق نہ رکھیں اور
فرمانی کی تیاری کریں جس میں محصول ادا نہ کرنا بھی شامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم
ں کو بالارادہ کسی قسم کی مدد نہ دیں، محصول دینا بند کر دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال ہو تشدد
ر کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے ہم صدق دل سے
تے ہیں کہ کانگرس وقتاً فوقتاً پورن سوراج قائم کرنے کے لیے جو ہدایات دے گی ان پر
ریں گے۔

ضمیمہ ب

خط مورخہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۳۰ء جو کانگرس کے لیڈروں نے یراودا جیل سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر م۔ ر۔ جیکار کو صلح کی شرائط کے متعلق بھیجا۔

یراودا سنٹرل جیل،
۱۵ اگست سنہ ۱۹۳۰ء

صاحبان مکرم،

ہم آپ کے دل سے شکر گذار ہیں کہ آپ نے برطانوی حکومت اور کانگرس میں صلح کرانے کا ذمہ لیا ہے۔ اس خط وکتابت کو پڑھ کر جو آپ لوگوں میں اور ہز اکسلینسی وائسرائے میں ہوئی ہے اور آپ سے مفصل گفتگو اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب کوئی ایسی صلح ہو سکے جو ہمارے ملک کی عزت و وقار کے شایان شان ہو۔ اگرچہ پچھلے پانچ مہینے میں جمہور میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہوگئی ہے اور ہر طبقے اور جماعت، ہر مذہب وملت کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک یہ تکلیفیں نہ اس قدر مسلسل ہیں اور نہ اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے کافی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ کے اور وائسرائے کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ سول نافرمانی سے ملک کو نقصان پہنچا یا یہ تحریک بے وقت اور غیر آئینی ہے۔ انگلستان کی تاریخ خوں ریز شورشوں کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے جن

لی خود انگریزوں نے دل کھول کر تعریف کی اور ہمیں بھی ان کی تعریف کرنا سکھایا۔ لہذا وائسرائے کے لیے، یا کسی بھی سمجھدار انگریز کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک ایسی تحریک کو برا کہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے اور بہت بڑی حد تک اپنے عمل کے لحاظ سے بھی پر امن رہی ہے۔

مگر یہاں ہم ان الزامات کی تردید نہیں کرنا چاہتے جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر موجودہ سول نافرمانی کی تحریک پر لگائے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس تحریک کو جو حیرت انگیز مقبولیت عام لوگوں میں حاصل ہوئی وہ اس کے جواز کا کافی ثبوت ہے۔ اس وقت تو صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح دل سے چاہتے ہیں کہ اگر کسی طرح بھی ممکن ہو سول نافرمانی ملتوی یا ختم کر دی جائے۔ ہمیں خود یہ گوارا نہیں کہ بلا ضرورت اپنے ملک کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قید، لاٹھی چارج اور اس سے بھی بدتر خطروں میں ڈالیں۔ اس لئے ہم آپ کو اور وائسرائے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم باعزت صلح کی تمام امکانی صورتیں تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے۔ مگر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ابھی تک اس کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے۔ ہمیں اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ انگریز حکام اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو اپنے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہمیں ان خالی خولی وعدوں پر اعتبار نہیں ہے جو حکام کی طرف سے کئے جاتے ہیں اگرچہ یہ اکثر نیک نیتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ انگریز مدتوں سے ہماری قوم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے کے عادی ہیں اس لئے انھیں اس اخلاقی، معاشی اور سیاسی تباہی کا احساس باقی نہیں رہا جو ان کے ہاتھوں ہمارے ملک پر آئی ہے۔ وہ کسی طرح اپنے دل کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ ان کا ایک ہی فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی حکومت کا جوا ہماری گردنوں سے اتاریں اور اپنی پچھلی زیادتیوں کی تھوڑی بہت تلافی کے لیے ہمیں اس روز افزوں تنزل سے نجات پانے میں مدد دیں جو برطانوی حکومت کے ماتحت ایک صدی سے ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔

مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اور ہمارے بعض فاضل ہم وطنوں کو ان خیالات سے

اتفاق نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی ذہنیت کم سے کم اس حد تک بدل گئی ہے کہ مجوزہ ۔ عز
میں شرکت کرنے سے مفید نتیجہ نکلے گا اس لئے باوجود ان دقتوں کے جو ہمیں درپیش ہیں ہم خوشی
سے تیار ہیں کہ جہاں تک ہمارے امکان میں ہے آپ کے ساتھ تعاون کریں۔ اس لئے موجود
حالت میں آپ کی دوستانہ تجویز کے جواب میں ہم جو زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں وہ حسب
ذیل ہے :-

(۱) ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اس خط کے جواب میں جو مجوزہ کانفرنس کے متعلق تھ
وائسرائے نے ایسے مبہم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ قومی مطالبے
سے جو پچھلے سال لاہور میں پیش کیا گیا تھا کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم
اس وقت تک کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے جب تک کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے
باضابطہ اجلاس میں اس مسئلے پر غور نہ کر لیا جائے۔ البتہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ذاتی طور پر
ہمیں وہی فیصلہ منظور ہوگا جس کی رو سے :-

(الف) صاف الفاظ میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان جب چاہے برطانو
سلطنت سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

(ب) ہندوستان کو مکمل قومی حکومت دی جائے جو رائے عامہ کے سامنے جواب
ہو جسے ملک کی حفاظت اور معاشی امور کے متعلق پورے پورے اختیار
حاصل ہوں اور جو ان گیارہ شرطوں کو پورا کرتی ہو جو گاندھی جی نے وائس
کو اپنے خط میں لکھی تھیں۔

(ج) ہندوستان کو یہ حق دیا جائے کہ اگر ضرورت ہو تو ایک آزاد عدالت
ذریعے سے ان برطانوی مطالبات (جن میں ہندوستان کا نام نہاد
قرضہ بھی شامل ہے) کی تنقیح کرائی جائے جو قومی حکومت کے نزدیک غیر
یا ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف ہوں۔

(نوٹ) انتقالِ حکومت کے دوران میں جو خاص انتظامات ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے ضروری ہوں ان کا فیصلہ ہندوستان کے منتخب شدہ نمائندے کریں۔

(۲) اگر برطانوی حکومت مندرجہ بالا شرائط کو منظور کرلے اور اس کا قابلِ اطمینان طریقے سے اعلان کردے تو ہم ورکنگ کمیٹی کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ سول نافرمانی بند کردے یعنی بعض خاص قوانین کی نافرمانی جو محض قانون شکنی کی غرض سے کی جاتی ہے مگر بدیسی کپڑے اور شراب کی باامن پکٹنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک حکومت خود شراب اور بدیسی کپڑے کی فروخت کی ممانعت نہ کردے۔ عام لوگوں کو نمک بنانے کی اجازت ہوگی اور نمک کے قانون کی تعزیری دفعات نافذ نہ کی جائیں گی۔ حکومت کے یا نج کے نمک کے کارخانوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) سول نافرمانی کے بند کرنے کے ساتھ ساتھ:-

(الف) تمام ستیاگرہی اور دوسرے سیاسی قیدی، خواہ وہ جیل میں ہوں یا حوالات میں جو تشدد یا ترغیبِ تشدد کے مجرم نہیں ہیں رہا کردے جائیں۔

(ب) جو املاک قانونِ نمک، قانونِ مطبع اور قانونِ مالگزاری وغیرہ کے ماتحت ضبط کی گئی ہے وہ واپس کردی جائے۔

(ج) جرمانے اور ضمانت کی رقمیں جو سزا یافتہ ستیہ گرہیوں یا پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے وصول کی گئی ہوں واپس کردی جائیں۔

(د) تمام ملازم، جن میں دیہات کے مقدم، چوکیدار وغیرہ بھی شامل ہیں، جو سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں مستعفی یا برطرف ہوئے ہوں اور دوبارہ حکومت کی ملازمت کرنا چاہتے ہوں بحال کردئے جائیں۔

(نوٹ) یہ دفعات ترکِ موالات کے زمانے پر بھی عائد ہوں گی۔

(۵) وائسرائے کے جاری کئے ہوئے تمام تعزیری ضابطے منسوخ کر دئے جائیں۔

(۶) مجوزہ کانفرنس کی نمائندگی اور اس میں کانگرس کی شرکت کا مسئلہ اسی وقت طے ہو سکتا ہے جب مندرجہ بالا مقدمات کا قابل اطمینان تصفیہ ہو جائے۔

آپ کے مخلص

موتی لال نہرو

م۔ک۔ گاندھی

سروجنی نائیڈو

ولبھ بھائی پٹیل

جے رام داس دولت رام

سید محمود

جواہر لال نہرو

ضمیمہ ج

عہدِ آزادی کی تجدید کا رزولیوشن

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

ہم باشندگان .... فخر و مسرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم دل سے شکر گذار ہیں ہندوستان کے ان بیٹوں اور بیٹیوں کے جنھوں نے مادرِ وطن کی آزادی کی خاطر تکلیفیں جھیلیں اور قربانیاں کیں، اپنے جلیل القدر اور محبوب رہنما مہاتما گاندھی کے جن کے فیض ہدایت نے ہمیں بلند مقصد اور برترسعی کی راہ دکھائی، ان سیکڑوں بہادر نوجوانوں کے جنھوں نے اپنی جان آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی یعنی پشاور اور کل صوبہ سرحد، شولاپور، ضلع مدناپور اور بمبئی کے شہیدوں کے، ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے جنھوں نے دشمنوں کے وحشیانہ لاٹھی چارج کی چوٹیں کھائیں، گڑھوالی رجمنٹ اور فوج اور پولیس کے اور سپاہیوں کے جنھوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں پر گولی چلانے اور کسی قسم کی سختی کرنے سے انکار کر دیا، گجرات کے ان جیالے کسانوں کے جنھوں نے نہایت ثابت قدمی سے ہر طرح کی تخویف اور تشدد کا مقابلہ کیا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بہادر اور مظلوم کاشتکاروں کے جنھوں نے انتہائی سختیوں کے باوجود جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا، ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے جنھوں نے سخت نقصان اٹھا کر قومی تحریک خصوصاً بدیسی کپڑے اور برطانوی مال کے بائیکاٹ میں مدد دی، ان ایک لاکھ مردوں اور عورتوں کے جنھوں نے جیل جا کر ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی کبھی جیل کے ملازموں کے ہاتھ سے مار تک کھائی، خصوصاً معمولی والنٹیروں کے جنھوں نے

ہندوستان کے سچے سپاہیوں کی طرح بغیر شہرت یا انعام کی امید کے محض اپنے اعلیٰ مقصد
کی خاطر سخت دقتوں کے باوجود محنت اور استقلال سے ملک وقوم کی خدمت انجام دی
اور ہم اعتراف کرتے ہیں انتہائی عقیدت اور احترام کا ہندوستان کی عورتوں
سے جنھوں نے مصیبت کے وقت مادر وطن کی مدد کرنے کے لئے اپنے گھروں کے امن و
آرام کو خیرباد کہا اور ہندوستان کی فوج کی صف اول میں مردوں کے دوش بدوش جاکر
کھڑی ہوئیں کہ جاں بازی اور فتح میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ اور ہم فخر کرتے ہیں
اپنے ملک کے نوجوانوں اور وانر سینا کے بچوں پر جنھوں نے اپنی کم سنی کے باوجود حصہ لیا
اور شہادت پائی۔

اور آخر میں ہم خوشی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں اس بات کا کہ ہندوستان
کے سب چھوٹے بڑے فرقے اور طبقے اس عظیم الشان جنگ میں شریک ہیں اور انھوں نے
اس کے لئے بیش بہا قربانیاں کیں خصوصاً اقلیتوں یعنی مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں،
عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے جنھوں نے اپنی بہادری اور مادر وطن کی وفاداری کا
ثبوت دے کر ایک متحدہ قوم کی بنیاد ڈالی جو اپنی فتح کا یقین رکھتی ہے اور اس پر تلی ہوئی
ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرائے اور آزاد رکھے اور اس آزادی سے یہ کام لے کہ ہندوستان
کے تمام طبقوں کی بیڑیاں کٹ جائیں اور ان کے حقوق کا فرق وامتیاز مٹ جائے جو
حقیقت میں ساری نوع انسانی کی خدمت ہے۔ ہندوستان کی خاطر قربانی اور جاں بازی
کی ان شاندار جوش آفریں مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنے عہد آزادی کی تجدید
کرتے ہیں اور مصمم ارادہ کرتے ہیں کہ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھیں گے
جب تک ہندوستان کو کامل آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

۵ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

نفسیاتِ شباب

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ، ڈی

یہ کتاب برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفۂ تعلیم و تمدن کے بے مثل ماہر اڈورڈ شپرانگر
کی تازہ تصنیف کا براہِ راست جرمن زبان سے ترجمہ ہے۔ نوجوانوں کی مجموعی نفسی سیرت ان کی
کی تخیلی زندگی، ان کے عشق، ان کے تصورِ کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر نفسیاتِ شباب سے
بہتر کوئی کتاب نہیں

ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۰ صفحے، قیمت صرف سے ر

ضبطِ نفس اور نفس پرستی

مصنفہ مہاتما گاندھی

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

مہاتما جی نے اس کتاب میں نوجوانوں کو بہت مفید اور عملی مشورے دئے ہیں
ان پر عمل کر کے وہ اپنی زندگی کامیاب بنا سکتے ہیں اور اپنی صحت کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔
اس لئے نوجوانوں کو اسے بغور پڑھنا چاہئے۔

قیمت ۱۲ر

مکتبہ جامعہ قرولباغ، نئی دہلی